دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۲۴ ویں جلد

جولائی سنہ ۱۹۷۹ء تا دسمبر سنہ ۱۹۷۹ء

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن   عبدالسلام قدوائی ندوی

معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۱۲۴

جولائی ۱۹۷۹ء تا دسمبر ۱۹۷۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۲۴

جولائی ۱۹۷۹ء تا دسمبر ۱۹۷۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۰۰
جولائی سنہ ۱۹۶۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ۔ عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلس ادارت

جلد ۱۲۴ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۹ء عدد ۱

مضامین

مقالات

وفیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

پچھلے دنوں ہمارے کتب خانہ میں چند بہت مفید اور اہم کتابوں کا اضافہ ہوا، ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر امام عبد الرزاق کی مُصنّف کی گیارہ جلدیں ہیں، جو حافظ ذہبی اور علامہ ابن حجر کے قول کے مطابق علم کا خزانہ ہیں،

...... ❊ ......

امام عبد الرزاق سربرآوردہ تبع تابعین میں ہیں، ممتاز محدثین نے اُن کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا ہے اور امام بخاری، امام مسلم اور صحاح کے مصنفوں کے استاد کے استاد تھے، اُن کی مصنف محدثین کے لئے مرجع اور ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اپنی اہمیت کے باوجود اب تک طباعت سے محروم تھی، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اپنے شاگردوں کو اس کی طباعت کی طرف برابر توجہ دلاتے رہتے، اللہ تبارک تعالیٰ نے اُن ہی کے شاگردوں کو اس کی توفیق عطا فرمائی، گجرات کے مولانا محمد میاں سملکی اور اُن کے فرزند ارجمند مولانا ابراہیم میاں سملکی نے اس کی طباعت کے مصارف برداشت کرنے کی آمادگی ظاہر کی، تو مئو ضلع اعظم گڈھ بلکہ اس برصغیر کے مایۂ ناز عالم مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اس کی ترتیب و تصحیح کی پوری ذمہ داری لی، انھوں نے مختلف کتب خانوں سے اس کے قلمی نسخے فراہم کرائے، بڑی احتیاط سے ان کا مقابلہ کرکے ان پر حواشی لکھے، اور پھر اس پر ایک فاضلانہ مقدمہ قلمبند کیا، جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا، ان معنوی خوبیوں کے ساتھ مولوی ابراہیم میاں سملکی کی دریا دلی اور نفاست پسندی کی وجہ سے اس عروس جمیلہ کے لئے لباس حریر بھی فراہم کیا گیا، جس سے کتاب حسن طباعت کا بھی شاہکار ہو گئی،

اس پر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا جو عالمانہ مقدمہ ہے، وہ نظر کی وسعت، فکر کی گہرائی، اور تلاش و تجسس کی نادر مثال ہے، اس لئے اس کو ایک علحدہ کتاب کی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، امید ہے کہ اس کی اشاعت سے اسلامی ممالک میں نہ صرف مولانا ئے محترم بلکہ ہندوستان کے علما

کا بھی مقالہ اضافہ قائم ہوا مصنف کی جلدیں مجلس علمی ڈابھیل ضلع سورت سے مل سکتی ہیں

دوسری قابلِ ذکر کتاب علامہ شوکانی کی تفسیر فتح القدیر ہے، تفسیر کی کتابوں میں عموماً آیات کی تحقیق و تنقید کا رواج نہیں ہے لیکن علامہ شوکانی صاحبِ نظر محقق تھے، وہ رجال کے حالات سے باخبر اور روایات کے اسقام سے اچھی طرح واقف تھے، اس لئے انھوں نے بڑی چھان بین سے کام لے کر ضعیف روایتوں کے ضعف کو نمایاں کیا ہے، یہ کتاب عرصہ ہوا کہ شائع ہوئی تھی لیکن مدت سے کمیاب تھی، دار الفکر بیروت نے پانچ جلدوں میں شائع کرکے اہلِ علم پر احسان کیا ہے،

فتح العلام حافظ ابن حجر کی مشہور کتاب بلوغ المرام کی شرح سبل السلام کی تلخیص ہے، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے بڑے صاحبزادے نواب نور الحسن مرحوم نے طلبا اور مدرسین کی سہولت کی غرض سے اس طویل شرح کو ۲ جلدوں میں مختصر کر دیا جن کو موسستہ دار الکتب الثقافیہ کویت نے اب شائع کیا ہے، یہ بھی ہمارے کتب خانہ کو بھیجی گئی ہے، امید کہ طالب علموں اور مدرسوں کے علاوہ عام اہلِ علم بھی اس سے مستفید ہوں گے،

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے ایک مفید کتاب مآثر جہانگیری بھی موصول ہوئی جہانگیر کے دور کا اہم ترین ماخذ تو خود اس شہنشاہ کی خود نوشت سوانح عمری تزک جہانگیری ہے، دوسرا اہم ماخذ معتمد خاں کی اقبال نامۂ جہانگیری اور تیسرا ماخذ مآثر جہانگیری ہے، پہلی دو کتابیں تو چھپ چکی تھیں، یہ تیسری کتاب اب تک قلمی نسخہ کی حیثیت سے مختلف کتب خانوں میں پڑی تھی، خوشی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کی لکچرر عذرا علوی صاحبہ نے اس کے مختلف نسخے جمع کئے اور محنت سے ایڈٹ کرکے اس دور سے دلچسپی رکھنے والوں کے ہاتھوں تک پہنچا دیا، اس میں انھوں نے انگریزی میں جو تمہیدی ابواب لکھے ہیں، اور اس کے متن کے نیچے جا بجا جن حواشی کا اضافہ کیا ہے اس سے ان کی خوش سلیقگی کا اظہار ہوتا ہے،

اس کتاب کا مصنف خواجہ کامگار حسینی ہے جو جہانگیر اور شاہ جہان کے دربار کا ایک امیر تھا، اتر پردیش کے شہر شاہجہان آباد کو اسی نے اپنے شاہی آقا کے نام سے آباد کیا، اس تاریخ میں زیادہ تر وہی واقعات ہیں جو تزک جہانگیری اور اقبال نامۂ جہانگیری میں ہیں، مگر بعض امرا کی سرگرمیوں سے متعلق کارآمد معلومات ہیں، اس کی اشاعت ایک مفید علمی خدمت ہے،

جناب مشفق خواجہ صاحب پاکستان کے جوان سال، جواں حوصلہ بلکہ ایک جواں فکر اہل علم اور ادیب ہیں، اُن کی ایک کتاب جائزۂ مخطوطاتِ اُردو کی پہلی جلد ابھی موصول ہوئی ہے، جو ۱۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بظاہر کراچی کے مختلف کتب خانوں کے دو سو اردو کے قلمی نسخوں کا ذکر ہے، مگر اُن کی توضیحی، ادبی اور کتابیاتی تفصیلات لکھنے میں اس برصغیر کے تقریباً ایک ہزار اور مخطوطات کا بھی ذکر آگیا ہے، دواوین کے سلسلہ میں شعراء کے سوانح حالات اور اُن کے کلام کے نمونے بھی ہیں، جن سے اس میں تذکرہ کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، اس طرح روایتی فہرست سازی سے الگ اس کا اپنا ایک علیحدہ آرٹ بن گیا ہے، جس محنت اور تحقیق سے اس میں گوناگوں معلومات فراہم کی گئی ہیں، اس بناء پر اس کے لائق مرتب کو کارل بروکلمان اور سی۔اے اسٹوری کیا، بلکہ ابن ندیم اور حاجی خلیفہ سے بھی اونچا درجہ دیا جائے تو صحیح ہوگا،

ابھی اس کی اور بھی جلدیں شائع ہونے والی ہیں، اُن کی اشاعت کے بعد مشفق خواجہ صاحب اردو کے بقائے دوام کے دربار میں ضرور نمایاں جگہ حاصل کریں گے، یہ کتاب نہ صرف ہر کتب خانہ کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہوگی، بلکہ عام قارئین بھی اس کو پڑھنا شروع کریں گے، تو اس کو قلمی کتابوں کی ایک فہرست کے بجائے ایک دلچسپ، پُرمغز، اور پُراز معلومات ادبی تصنیف پائیں گے، مرکزی بورڈ، پوسٹ بکس ۱۳۱، گلبرگ لاہور سے مل سکتی ہے،

مقالات

قاضی زادہ رومی مصنف شرح چغمینی

احوال و آثار

(۳)

از جناب شبیر احمد خان غوری ایم۔اے۔ ایل ایل بی ریسرچ فیلو انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ علیگڈھ

الغ بیگ کی صدارت ۸۲۲ھ میں شاہرخ نے ولیعہد سلطنت مرزا الغ بیگ کو عہدہ ماوراء النہر بالاستقلال نیابت بخشی شاہزادہ سمرقند پہونچا، جہاں تدبیر ملک و انتظام سلطنت کے علاوہ اس نے ایک مدرسہ قائم کیا۔ صاحب 'حبیب السیر' نے لکھا ہے۔

"در ۸۲۲ھ بایالت ولایت ماوراء النہر سرافراز گشت و بیمن معدلت و رعیت پروری باندک زمانے آن مملکت را در معموری بمرتبۂ رسانید کہ بر ترتیب از سپہر بریں درگزشت۔ و آں خسرو بے مانند در وسط بلدۂ فاخرۂ سمرقند مدرسۂ رفیع و خانقاہے منیع بنا فرمودہ با تمام رسانید و بسیارے از مزارع و قری و مستغلات فوائد انتما بر آں بقاع نفاع وقف گردانید۔"[1]

---

[1] حبیب السیر صفحہ ۱۵۱۔

اسی طرح عبدالرزاق کاشی جس نے اس مدرسہ اور دوسری عمارتوں کو بچشم خود دیکھا تھا "مطلع السعدین" میں لکھتا ہے،

"و درون شہر سمرقند...... مدرسہ و خانقاہے برابر یکدگر بنا فرمود و چند سال در اتمام آں دو مقام اہتمام تمام بذل نمود...... و شاہزادہ کیوان وقار مشتری آثار مستغلات بسیار و مزارع ابنار براں بقاع وقف فرمود و اعلام علما ر دکار بر فضلار بتدریس و افادت در مدرسہ تعیین فرمود..... و حاوی اوراق عبدالرزاق بحسن اتفاق چندگاہ کہ در دارالسلطنت سمرقند مقیم بود، احوال برائے العین مشاہدہ نمود"[1]

اسی طرح حسن رُوملو نے "احسن التواریخ" کے اندر ۸۲۴ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھا ہے :-

"درین سال مرزا الغ بیگ در وسط شہر سمرقند مدرسہ عالی بنا نہاد و ملک بسیار بروے وقف کردہ"[2]

یہ مدرسہ مربع شکل کا تھا جس میں چاروں طرف بے شمار حجرے بنے ہوئے تھے ان حجروں میں طلبہ کا قیام رہتا تھا عمارت کے ہر ضلعے میں تعلیم و تدریس کے لیے ایک درسگاہ تھی جس کیلئے شاہزادے نے ایک مدرس کا تقرر کیا تھا اور ان تمام مدرسین کا افسر اعلیٰ قاضی زادہ کو مقرر کیا تھا[3]، دولت شاہ نے بھی اس مدرسہ کو دیکھا تھا، وہ اس کے بارے میں لکھتا ہے :-

"در خطہ سمرقند مدرسہ عالی بنا فرمودہ کہ در اقالیم بر تبت و قدر آں مدرسہ نشان نمی دہند. و اکنوں دراں مدرسہ عالی زیادہ از صد نفر طالب علم متوطن و موظف اند"[4]

---

[1] مطلع السعدین ص ۲۳۰ [2] احسن التواریخ ص ۱۴۰ [3] الشقائق، ص ۱۸ [4] تذکرہ دولت شاہ ص ۲۶۲

تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ چاروں مدرسین اپنے شاگردوں سمیت پہلے قاضی زادہ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ درس سے فارغ ہو کر قاضی زادہ تو اپنے مکان تشریف لے جاتے، اور مدرسین اپنی اپنی درسگاہوں میں جا کر طلبہ کو تعلیم دیتے[1]

اکثر شاہزادہ خود مدرسہ کے معائنہ کے لیے آیا کرتا، اور قاضی زادہ کے درس میں شریک ہوتا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ شہزادہ کسی مدرس سے ناراض ہو گیا، اور اُسے مدرسی سے برخاست کر دیا، قاضی زادہ کو معلوم ہوا تو وہ بھی گھر بیٹھ رہے، ایک دن شاہزادہ حسب دستور مدرسہ کے معائنہ کے لئے آیا۔ جب قاضی زادہ کو وہاں نہ دیکھا تو سمجھا شاید طبیعت ناساز ہے، اسی لیے نہیں آئے ہیں، اس لیے عیادت کے لیے اُن کے گھر پہونچا، وہاں انھیں صحیح اور تندرست پایا، لہذا اُن سے اتنے دن مدرسہ نہ آنے کا سبب دریافت کیا۔ قاضی زادہ نے فرمایا کہ میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، انھوں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ صرف وہی ملازمت اختیار کروں، جہاں برخاست ہونے کا کھٹکا نہ لگا رہے، میرا خیال تھا تدریسی خدمت ہی ایک ایسی ملازمت ہے لیکن

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم۔

معلوم ہوا مدرسین بھی برخاست کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے میں اس ملازمت کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا، شاہزادے نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اور اس کے لیے معذرت کی۔ پھر برخاست شدہ مدرس کو اس کی ملازمت پر بحال کیا، اور آیندہ کے لیے وعدہ کیا کہ کسی مدرس کو برخاست نہیں کرونگا، اس کے بعد اُن سے دوبارہ مدرسہ کی صدارت کا عہدہ سنبھالنے کی درخواست کی، بڑی منت وسماجت کے بعد قاضی زادہ دوبارہ مدرسہ کی

---

[1] الشقائق صفحہ ۱۱

صدارت کے لیے تیار ہوئے۔[۱]

اس واقعہ سے اُن کی عزت نفس، حفظ مراتب، حق گوئی اور ماتحتوں کے ساتھ شفقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رصدگاہ کی نوعیت | مدرسہ کے ساتھ ہی الغ بیگ نے ایک رصدگاہ بھی تعمیر کرائی تھی۔ الغ بیگ کی قائم کردہ رصدگاہ، رصدگاہوں کے اس سلسلے کی آخری عظیم الشان کڑی تھی، جس کا آغاز عباسی خلیفہ المامون نے ۲۱۲ھ میں کیا تھا، رصدگاہ مامونی سے پہلے بھی عہد اسلام میں ایک رصدگاہ کا پتہ چلتا ہے، جو مامون کے باپ ہارون الرشید کے عہد خلافت میں شہر جندی سابور کے اندر محمد بن احمد النہاوندی کی سربراہی میں ارصادی سرگرمیوں میں مصروف تھی[۲] لیکن سرکاری سرپرستی میں قائم ہونے والی پہلی رصدگاہ مامون ہی کی قائم کردہ تھی جو اس نے بغداد اور دمشق میں قائم کی۔[۳]

رصدگاہ مامونی کے بعد بھی بے شمار رصدگاہیں قائم ہوئیں۔ ایک ترک محقق نے عہد اسلام کی صرف اُن رصدگاہوں کی تعداد جو ۸۰۰ء اور ۱۵۰۰ء کے مابین قائم ہوئیں، اور جن کی ارصادی دریافتوں کی تفصیل ہنوز قابل رسائی مخطوطات میں موجود ہے،[۴] ۱۰۴ بتائی ہے، مگر ان میں اکثریت ان رصدگاہوں کی تھی، جو سرکاری سرپرستی سے آزاد ہوکر قائم کی گئیں، ان میں سب سے اہم البتانی اور ابوریحان البیرونی کی ارصادی سرگرمیاں تھیں۔

سرکاری سرپرستی میں قائم ہونے والی دوسری اہم رصدگاہ بھی بغداد ہی میں تعمیر ہوئی

۱؎ الشقائق صفحہ ۱۰ ۲؎ الزیج الکبیر الحاکمی لابن یونس ص ۱۰۱ ۳؎ طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۵۰ ۴؎ Cambridge History of Iran - Vol V, P.672

تھے، عضد الدولہ بویہی کے بیٹے شرف الدولہ نے ۳۷۸ھ میں قائم کرایا تھا، چنانچہ امام ذہبی نے "العبر فی خبر من غبر" میں ۳۷۸ھ کے واقعات میں لکھا ہے :۔

امر الملك شرف الدولة	بادشاہ شرف الدولہ نے مامون خلیفہ
برصد الكواكب كما فعل	کی طرح ارصاد کواکب کا حکم دیا اور
المامون وبنى هيكلا بدار	دار السلطنت میں ایک عظیم عمارت
السلطنة [1]	(رصدگاہ) تعمیر کرائی ۔

جن ہیئت دانوں کے نام اس رصدگاہ سے وابستہ ہیں اُن میں ابو الوفاء البوزجانی ابو حامد الصغانی اور ویجن بن رستم الکوہی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، مزید تفصیل ابن القفطی نے "تاریخ الحکماء" میں دی ہے [2]۔

اس کے کچھ ہی دن بعد فاطمی خلیفہ العزیز باللہ کے حکم سے مصر میں ایک عظیم الشان رصدگاہ قائم کی گئی، جہاں ابن یونس نے فلکی مشاہدات کئے، اس کی ارصادی سرگرمیاں العزیز باللہ کے بیٹے الحاکم بامر اللہ کے عہد میں ختم ہوئیں، اور اس نے اپنی ہیئتی دریافتوں کو "الزیج الکبیر الحاکمی" میں مدون کیا [3]۔

اگلی صدی میں ملک شاہ سلجوقی نے تقویم کی اصلاح اور خراج کی وصولی کے لئے نوروز کے تعین کے لئے شہر اصفہان میں عمر خیام کی زیر نگرانی ایک رصدگاہ قائم کرائی (۴۶۷ھ) [4]

بین الاقوامی انداز پر دنیا کی سب سے پہلی رصدگاہ مراغہ کی تھی جسے ایلخانی تاجدار ہلاکو خاں کے ایماء سے ۶۵۷ھ میں محقق طوسی نے تعمیر کرایا تھا، انھوں نے اقطاع عالم سے

---

[1] العبر فی خبر من غبر حالات ۳۷۸ھ [2] تاریخ الحکماء، ابن القفطی ص ۳۵۱ - ۳۵۲ [3] اس زیچ کے کچھ ابواب ۱۸۰۴ء میں پیرس سے شائع ہوئے تھے مگر یہ مطبوعہ نسخے بھی کمیاب ہیں، خوش قسمتی سے ایک نسخہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں موجود ہے، [4] کامل ابن الاثیر الجزء العاشر ص ۳۲

بڑے بڑے باکمال ہیئت دانوں کو اس کی ارصادی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے مدعو کیا تھا، جیسے قطب الدین شیرازی، نجم الدین کاتبی، مؤید الدین عرضی دمشقی، محی الدین مغربی، فخر الدین اخلاطی وغیرہم[1]

دنیائے اسلام کی آخری اہم باشان رصدگاہ سمرقند کی تھی، جسے الغ بیگ نے ۸۲۴ھ میں قائم کیا تھا، گستاولی بان "تمدن عرب" میں لکھتا ہے،

"تیمور کے پوتے الغ بیگ کو بھی جو سمرقند کا بادشاہ تھا، اور جس کا زمانہ پندرہویں صدی عیسوی کا وسط ہے، علم ہیئت کا بے انتہا شوق تھا، اور اس نے بھی بہت سے علماء جمع کئے تھے، چونکہ یہ بادشاہ نہایت دولتمند تھا، اس نے ایسے کامل آلات رصد بنوائے جو اس وقت تک نہیں بنے تھے، کہتے ہیں کہ اس کا ربع دائرہ اتنا بڑا تھا کہ اس کا نصف قطر قسطنطنیہ کی ہیئت صوفیہ کی بلندی کے برابر تھا، الغ بیگ گویا مدرسہ بغداد کا اخیر شخص ہے، اس کی تحقیقات نے قدیم اور جدید کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا، اس میں اور کیپلر کے زمانہ میں کل ڈیڑھ صدی کا فاصلہ تھا۔"

جس تصنیف کو الغ بیگ نے ۱۴۳۱ء میں منتشر کیا اس سے ہمیں پورا اندازہ عربوں کے علم ہیئت کا پندرہویں صدی عیسوی کے نصف تک معلوم ہوتا ہے، اس کا پہلا حصہ فی الواقع کتاب ہیئت ہے، اس میں وقت کی تقسیمیں، تقویم اور عام اصول علم ہیئت درج ہیں، اس کے بعد عملی ہیئت سے بحث کی گئی ہے، اور کسوف وخسوف کے حسابات اور جدولوں کے بنانے اور استعمال کی ترکیبیں وغیرہ دکھائی گئی ہیں، ان جدولوں میں ستاروں کی فہرست، چاند، سورج اور

---

[1] حبیب السیر جلد سوم جزو اول ص ۶۱ - ۶۲

ستاروں کی حرکتیں اور تمام دنیا کے بڑے بڑے شہروں کے طول اور عرض بلد دیے ہوئے ہیں"۔[۵]

لیکن زیادہ قابل اعتماد معلومات معاصر یا قریبی متاخر مورخین نے دی ہیں چنانچہ حسن روملو نے "احسن التواریخ (مکتوبہ ۹۸۰ھ محفوظہ کتب خانہ ملی پیرس نمبر ۱۰۱۷، ۵۰۱۱ از روے فہرست بلوشے) میں ۸۲۳ھ کے واقعات میں لکھا ہے:۔

"دریں سال مرزا الغ بیگ میل استنباط رصد و استخراج زیچ فرمود و در شمالی سمرقند مایل بہ مشرق مقام قابل و لائق تعیین فرمود۔ باخبار حکمائے نامدار حالیہ کہ آں کار را شاید مقرر شد دنیا براں چو اساس آں دولت پائدار و بنیاد آں قاعدہ سلطنت استوار و استحکام یافت۔ تاکید بنیان و تشیید ارکان چوں قواعد جبال تا موعد تسیر الجبال سیراً مامون از زوال و مصئون از اختلال آمد، و ہیئت افلاک تسعہ و اشکال دوائر تسعہ و درجات و دقائق و ثوانی تا عواشر افلاک و تداویر کواکب سبعہ سیارہ و صور کواکب ثابتہ و ہیئت کرہ ارض و صور اقالیم باکوہہا و دریاہا و بیابانہا و آنچہ از توابع آں باشد بہ نقوش دلپذیر و رقوم بے نظیر در درون خانہ ہائے آں عمارت عالی بنیاد و رفیع نہاد کہ نمودار قصر مقرنس سبع شداد بود ثبت و تحریر افتاد۔

و تقویم آفتاب و سائر کواکب را رصد کردہ بر زیچ جدید ایلخانی کہ جناب حکمت مآب خواجہ نصیر الدین طوسی استخراج نمودہ بود، فوائد لطائف افزودہ و در تقویم آفتاب و کواکب دیگر تفاوت صریح ظاہر ساخت و حکمار بزرگ مدار فہم نازک مدد معاون او بودند

---

۵ تمدن عرب لی بان ص ۲۲۴

و آوازہ آں امر خطیر در بلاد و امصار اشتہار و انتشار یافت و شاہزادہ بہ تصحیح آں زیج موفق گردید با تمام رسید و بہ زیج جدید سلطانی گورگانی موسوم شد[1]

[لیکن "احسن التواریخ" کے مخطوطہ نور عثمانیہ استانبول میں یہ سنہ ۸۲۴ھ بتایا گیا ہے]

"حبیب السیر" سے بھی یہ سال ۸۲۴ھ ہی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اس میں لکھا ہے:

"در ۸۲۳ھ بایالت ولایت ماوراء النہر سرافراز گشت ..... و آں خسرو بے مانند ...... فرمان داد کہ استادان کارداں در ظاہر آں بلدہ فردوس مانند (سمرقند) رصدے بنیاد نہادند"[2]

مگر اس رصد گاہ کی تعمیر کی تفصیلی کیفیت عبدالرزاق کاشی نے، جس نے بچشم خود اسے دیکھا تھا، "مطلع السعدین" میں دی ہے۔

"و بعد از تحصیل کمالات و تکمیل آلات استنباط رصد و استخراج زیج فرمود"[3]

باقی تفصیل وہی ہے جو اوپر "احسن التواریخ" سے منقول ہوئی، حسن روملو نے یہ تفصیل "مطلع السعدین" ہی سے نقل کی تھی، صرف عبدالرزاق کاشی نے اس کا نام "زیج سلطانی گورگانی" بتایا اور اتنا اضافہ کیا ہے،

"آں زیج تصحیح یافتہ بہ اتمام رسید و بزیج سلطانی گورگانی موسوم شد، و درمیان اہل صناعت تنجیم و اصحاب تقادیم معمول و متداول است"[4]

دولت شاہ بھی اس زیج کی تعریف میں رطب اللسان ہے، اور "تذکرۃ الشعراء" میں لکھتا ہے۔

"و الیوم نزد حکماء آں زیج متداول و معتبر است و بعضے آں را بر زیج نصیری ایلخانی

---

[1] احسن التواریخ ص ۱۱۰ [2] حبیب السیر جلد سوم جزو سوم ص ۱۵۱ [3] مطلع السعدین ص ۲۲۰
[4] مطلع السعدین ص ۲۲۹

ترجیح می کنند[۱]

الغ بیگ کی وفات کے کوئی چھیالیس[۴۶] سال بعد جب بابر سمرقند آیا تو اُس نے اس رصدگاہ کو دیکھا تھا، وہ لکھتا ہے :-

"یک عمارت عالی دیگر در دامن پشتہ کو یک رصد است کہ آلت زیج نوشتن است۔ سہ آشیانہ است۔ الغ بیگ مرزا این رصد زیج گورگانی نوشتہ کہ حالا این زیج معمول است و زیج دیگر عمل کم کنند۔ این پیش زیج ایلخانی معمول بود کہ خواجہ نصیر در زمان ہلاکو خاں مراغہ نیز رصد بستہ بود"[۲]

اس رصدگاہ میں جو آلات استعمال کئے گئے تھے، اُس وقت تک، بلکہ اُس کے بعد عرصۂ دراز تک یورپ میں بھی نہ بنے تھے، ایک مورخ علم الہیئت آرتھر بیری نے بھی ان کی نفاست کا اعتراف کیا ہے۔

رصدگاہ کی تعمیر کے بعد الغ بیگ نے سب سے پہلے غیاث الدین جمشید کاشی کو اس رصدگاہ کا منتظم اعلیٰ مقرر کیا، مگر وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے، ان کی وفات کے بعد رصدگاہ کی تولیت ہمارے رئیس التذکرہ کو تفویض کی گئی، مگر رصد کے کام سے قبل ہی وہ بھی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے، اور رصدگاہ کی سربراہی مولانا علاء الدین علی قوشجی کو سونپی گئی، اور انھوں نے اس امر خطیر کو انجام تک پہونچایا چنانچہ طاشکبری زادہ نے موخر الذکر کے ترجمہ میں لکھا ہے:

ثم ان الامیر الغ بیگ بنی	پھر امیر الغ بیگ نے سمرقند میں رصدگاہ
موضع رصد بسمرقند وصرف	تعمیر کرائی اور اس پر رقم خطیر صرف کی۔
فیہ مالا عظیماً ونولا ہ اولاً	پہلے غیاث الدین جمشید کاشی کو جو اس علم

۱؎ تذکرہ دولت شاہ ص ۴۴۴۔ ۲؎ بابرنامہ ص ۳۱

غیاث الدین جمشید من
مہرۃ ہذا العلم فتوفاہ
اللہ تعالیٰ فی اوائل الامر
ثم تولاہ المولیٰ قاضی زادہ
الرومی۔ فتوفاہ اللہ تعالیٰ
قبل اتمامہ واکملہ المولیٰ علی
القوشجی۔ فکتبوا ما حصل
لہم من الرصد وھو المشہور
بالزیج الجدید لالغ بیگ
وھو احسن الزیجات واقربہا
من الصحۃ[1]

(ہیئت) کے ماہرین میں سے تھے اسکا
منتظم اعلیٰ بنایا (مگر) اللہ تعالیٰ نے
انھیں اس کام کی ابتدا ہی میں اٹھا
لیا پھر (زیر التذکرہ) مولیٰ قاضی زادہ
رومی کو اس کی سربراہی دی (مگر)
اسکے مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بھی اللہ تعالیٰ
کو پیارے ہو گئے، اور اس کام کو مولیٰ
علاء الدین علی قوشجی نے تکمیل تک پہونچایا،
پس جو باتیں ارصاد و مشاہدات فلکی سے
معلوم ہوئیں انھیں ایک کتاب میں قلمبند
کیا جو زیج جدید الغ بیگ کے نام سے
مشہور ہے، اور وہ سب زیجوں میں
صحت سے زیادہ قریب ہے۔

اسی تفصیل کو انھوں نے دوسری جگہ قاضی محمود کے ترجمہ میں قاضی زادہ کے ذکر کے سلسلے میں بیان کیا ہے،

ثم ان الامیر الغ بیگ قصد
رصد الکواکب لما رای
من الخلل فی ارصاد المتقدمین
فرتب مکان الرصد بسمرقند

پھر امیر الغ بیگ نے مختلف ستاروں
کی رصد کا ارادہ کیا کیونکہ اس نے متقدمین
کے ارصادات میں خلل عظیم پایا لہذا
اس نے سمرقند میں رصدگاہ تعمیر کرائی،

---

[1] الشقائق، ص ۱۷۷-۱۷۸،

فتولاہ اولاً غیاث الدین جمشید
فلم یلبث الا قلیلاً حتی مات
ثم تولاہ قاضی زادہ الرومی
فتوفاہ اللہ تعالیٰ قبل اتمامہ
وکمله المولی علی بن محمد القوشجی[1]

پہلے اس نے غیاث الدین جمشید کاشی کو
اس کا متولی مقرر کیا مگر اُن کا کچھ ہی
عرصہ بعد انتقال ہو گیا، پھر قاضی
زادہ رومی کو اس کی تولیت عطا کی،
انھیں بھی اللہ تعالیٰ نے رصد کے مکمل
ہونے سے پہلے اٹھا لیا، اور اس فریضہ
کو مولی علی بن محمد قوشجی نے پورا کیا۔

لیکن زیادہ تفصیلی تذکرہ خود الغ بیگ نے اپنی "زیج" کے دیباچہ میں دیا ہے، پہلے تو وہ ریاضی و ہیئت میں تبحر و تمہر حاصل کرنے کے لیے اپنی مساعی کا ذکر کرتا ہے۔

"با توزع بال و تکثر اشتغال از تکفل مصالح اُمم و تعہد مناہج بنی آدم بمقتضی المرء یطیر بجناحیہ ہمتہ و قصاری نہمت بر احراز قصبات کمال و استجماع مآثر فضل و افضال محصور و مقصور داشتہ، اعنہ سعی جمیل و ازمہ جد جزیل بجانب استحصال حقائق علمیہ و استحضار دقائق حکمیہ معطوف و مصروف گردانید تا توفیق الٰہی رفیق شفیق این ضعیف گشتہ بر وفق فرمودہ من طلب شیئاً وجد بقلم فطنت و خامہ فکرت غوامض علوم و دقائق فنون لاسیما علوم حکمی کہ تغیر ملک و ادیان و اختلاف حکم زمان غبار تغیر و تبدل پیرامون آن نگردد مبین و مکشوف گردانید"[2]

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے، پھر اپنے ہیئتی منصوبہ پر عمل پیرا ہونے کی وجہ بتاتا ہے کہ اس سے مقصود محض دنیا میں ایک یادگار چھوڑنا ہے: [عام طور سے مورخین نے

---

[1] الشقائق صفحہ ۱۹-۲۰۔ [2] زیج الغ بیگ، دیباچہ (مخطوط مذکورہ بالا) ص ۲ ظ

جو لکھا ہے کہ اس ہیئتی منصوبہ سے الغ بیگ کا مقصد محض زیجوں اور تقویموں میں پیدا شدہ خلل کی تصحیح و تسدید تھا، دیباچہ سے کسی طرح اُس کی تائید نہیں ہوتی]

زچوں حضرت باری عز اسمہ از خزانہ کریم عمیم وان من شیء الا عندنا خزائنہ و ما ننزلہ الا بقدر معلوم این بندۂ فقیر را چنیں موہبتے عظمیٰ و کرمتے کبریٰ شرف اختصاص و امتیاز بخشید، خواست تا مضمون، شعر

ان آثارنا تدل علینا　　　فانظروا بعدنا الی الآثار

بر کتابہ غرائب نگار روزگار نگاشتہ آید و رایت افتخار و اشتہاد بر قمہ قبہ فلک دوار افراشتہ، رصد ستارگان اختیار فرمودہ[1]

اس کے بعد رصد کے کام کی ابتدا کا ذکر کرتا ہے [بعض مورخین نے لکھا ہے کہ کاروبار رصد میں مولانا معین الدین کاشی بھی شریک تھے، مگر الغ بیگ نے دیباچہ میں ان کا نام نہیں لیا، ابتدائی کارکنوں میں مولانا قوشچی کا بھی نام نہیں ہے، اگرچہ بعد میں رصدگاہ کی تولیت انھیں ہی تفویض کی گئی تھی، ممکن ہے وہ سفر کرمان سے اس وقت تک واپس نہ آئے ہوں، یا اس وقت تک اس کام کے لیے اپنی صلاحیت کا ثبوت نہ دے سکے ہوں، مگر مولانا معین الدین کاشی اس کام میں شریک نہیں تھے، حالانکہ وہ غیاث الدین جمشید کاشی کے ہم مرتبہ تھے، ممکن ہے ۸۲۳ھ سے پہلے ہی اُن کا انتقال ہو چکا ہو]

"و باعانت و امداد حضرت استادی و سندی علامہ العالم، ناصب امارات الفضل والحکم سالک مسالک التحقیق، ناہج مناہج التدقیق مولانا صلاح الملۃ والدین موسیٰ المشتہر بقاضی زادہ رومی علیہ الرحمہ والغفران و حضرت مولانا

---

[1] زیج الغ بیگ، دیباچہ (مخطوطہ مذکورہ بالا) ص ۲ ط

مولانا الاعظم افتخار الحکماء فی العالم مکمل علوم الاوائل، کاشف معضلات المسائل مولانا
غیاث الملۃ والدین جمشید برد اللہ مضجعہ کہ ضمیر منیر ہر یک شمع انجمن دانشوری بل
جام جہاں نمائے فضل گستری بود، اتفاق شروع افتاد"[1]

ازاں بعد کہتا ہے کہ یہ دونوں فاضل تھوڑے عرصہ سے اللہ کو پیارے ہوگئے، اور پھر اس نے مولانا قوشجی کی مدد سے [جو ممکن ہے کہ یا تو سفر کرمان سے اس دوران میں آگئے ہونگے یا اگر وہیں رہے ہوں تو اب اس قابل ہوگئے ہونگے کہ اس اہم خدمت کی تنہا ذمہ داری سنبھال سکیں] اس منصوبہ کو تکمیل تک پہونچا کر اپنی دریافتوں کو "زیج جدید" میں مدون کیا۔

"در مبادی حال حضرت مولانائے مغفور مبرور غیاث الدین جمشید طاب ثراہ ندائے
ہیبوا داعی اللہ را بسمع اجابت تلقی نمودہ از دار الغرور بدار السرور رحلت نمود و در اثنائے
حال پیش از آنکہ ایں مہم ساختہ و پرداختہ آید حضرت استادی شکر اللہ مساعیہ بجوار رحمت
پروردگار پیوست، پس باتفاق فرزند ارجمند علی بن محمد قوشجی . . . .
بعون عنایت الٰہی و فیض فضل نامتناہی ایں مہم خطیر عسیر باتمام رسانیدہ آمد"[1]

[عام طور پر رصدگاہ کے متولیوں کی جو ترتیب مشہور ہے، الغ بیگ کی تصریح سے اسکی بھی تائید نہیں ہوتی، بلکہ اگر اولیت ذکر اولیت مرتبہ کی مشیر ہو سکتی ہے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ رصدگاہ کے سربراہ اول ہمارے رئیس التذکرہ تھے، جو غیاث الدین جمشید کی اعانت سے یہ کام انجام دیتے تھے، مگر جب موخر الذکر کا انتقال ہو گیا تو تنہا انھوں نے اس بار گراں کو اٹھایا، یہاں تک کہ اُن کی وفات پر مولانا قوشجی کو یہ فریضہ انجام دینا پڑا، لیکن غالباً علی حد نک وہ نام کے لیے سربراہی اور نگرانی خود الغ بیگ ہی کی تھی،]

---

[1] زیج الغ بیگ - دیباچہ۔ ص ۱۱

وفات | سال ولادت کی طرح قاضی زادہ کا سال وفات بھی معلوم نہیں ہے، حاجی خلیفہ نے ۸۱۰ھ میں وفات بتائی ہے، مگر یہاں ان سے یقیناً سہو ہوا ہے، کیونکہ وہ تعمیر رصدگاہ کے بعد ایک معتد بہ عرصہ تک اس کے متولی رہے، اور چونکہ یہ رصدگاہ ۸۲۳ھ یا ۸۲۴ھ میں بننا شروع ہوئی تھی، اس لئے وہ ۸۲۴ھ تک یقیناً بقید حیات تھے، اور چونکہ ۸۴۱ھ میں اس رصدگاہ کی ارصادی سرگرمیوں کے نتائج قلمبند ہوئے، اور یہ کام مولانا قوشجی نے انجام دیا جو قاضی زادہ کی وفات کے بعد رصدگاہ کے متولی مقرر ہوئے تھے، اس لئے وہ یقیناً ۸۴۱ھ سے پہلے وفات پا چکے تھے،

بنا برین قاضی زادہ نے ۸۲۴ھ اور ۸۴۱ھ کے مابین وفات پائی، اور اس سترہ سال کے عرصہ میں جب کہ ارصادی سرگرمیاں مکمل ہونے والی تھیں، انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

"در اثنائے حال پیش از انکہ این مہم ساختہ پرداختہ آید"

بخلاف غیاث الدین جمشید کاشی کے جو رصدگاہ کی ارصادی سرگرمیوں کے آغاز ہی میں رہگزار ملک عدم ہو گئے تھے۔

"در مبادی حال . . . غیاث الدین جمشید . . . ندائے اجیبوا داعی اللہ . . . تلقی نمود"[1]

اسلیے اگر یہ فرض کیا جائے کہ انھوں نے ۸۳۵ھ کے قریب (چند سال آگے یا چند سال پیچھے) وفات پائی تو یہ مفروضہ حقیقت سے بعید نہ ہوگا۔

اعزہ و اقارب | تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں نہ تو ان کے تاہل و ازدواج کا پتہ چلتا ہے،

---

[1] زیج الغ بیگ۔ دیباچہ ص ۲ ظ

اور نہ ایک بہن کے سوا کسی اور عزیز قریب کا حسب تصریح طاشکبری زادہ ان کے والد کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا، اس لئے ممکن ہے انھوں نے یہی دو بچے چھوڑے ہوں (قاضی زادہ اور اُن کی بہن) مگر شاید روم میں اُن کے کچھ اعزہ و اقارب ضرور تھے جن کی یاد کسک بنکر انھیں تڑپایا کرتی تھی اور جسے وہ سمرقند کے مہمان نواز دربار اور الغ بیگ کے خلوص و محبت سے متاثر ہو کر بھلانے کی کوشش کیا کرتے تھے جیسا کہ وہ خود اپنے میزبان کی تعریف میں باندازِ "تاکید المدح بمایشبہ الذم" اعتراف کرتے تھے :-

ولا عیب فیھم الا ان ضیوفھم تلام بنسیان الاحبۃ والوطن

[ان لوگوں (الغ بیگ اور اہل ماوراء النہر) میں اس کے سوا اور کوئی عیب نہیں ہے کہ ان کے مہمان (ان کی مہمانداری اور خلوص و محبت سے متاثر ہو کر) اپنے احباب (قدیم) اور وطن عزیز کو بھول جاتے ہیں، (اور اُن کی اس کمزوری کی وجہ سے) لومۃ لائم کا نشانہ بنتے ہیں]

تصانیف تذکرہ و تراجم نیز مختلف کتب خانوں کی فہارس کے مطالعہ سے ان کی مندرجۂ ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) شرح اشکال التاسیس (۲) شرح چغمنی (۳) شرح ہدایۃ الحکمہ مولانا زادہ پر حاشیہ، (۴) تحریر المجسطی محقق طوسی پر حاشیہ (۵) رسالۃ الجیب۔

تصانیف پر تبصرہ "آثار" کے ضمن میں آرہا ہے۔

تلامذہ تلامذہ کی فہرست میں سب سے پہلا نام تو خود بادشاہ الغ بیگ کا ہے، جو خود ان کی شاگردی پر فخر کرتا ہے، جیسا کہ "زیج جدید سلطانی" کے مذکورالصدر اقتباس سے ظاہر ہے، طاشکبری زادہ نے بھی اس کی تصریح کی ہے:-

وکان الامیر المذکور محبًّا للعلوم	امیر مذکور (الغ بیگ) کو علوم ریاضیہ کا
الریاضیۃ نقرأ علیہ	بہت زیادہ شوق تھا، لہٰذا اس نے ان سے
من العلوم الریاضیۃ	(قاضی زادہ) سے علوم ریاضیہ کی بہت سی
کتبا کثیرۃ [1]	کتابیں پڑھیں ۔

دوسرے مشہور شاگرد مولانا علاء الدین علی قوشجی تھے، چنانچہ طاشکبری زادہ ان کے ترجمے میں لکھتے ہیں :-

قرء المولی المذکور علی علماء	مولانا قوشجی نے علمائے سمرقند سے تعلیم حاصل
سمرقند وقرأ علی المولیٰ	کی نیز مولائے فاضل قاضی زادہ رومی
الفاضل قاضی زادہ الرومی	کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، انھوں نے
نقرأ علیہ العلوم الریاضیۃ [2]	قاضی زادہ سے علوم ریاضیہ پڑھے ۔

تیسرے مشہور شاگرد، جن کے ذریعہ اُن کا سلسلۂ تلمذ طاشکبریٰ زادہ تک پہونچتا ہے، مولانا فتح اللہ شروانی تھے، چنانچہ وہ ان کے ترجمہ میں لکھتے ہیں :-

العالم الفاضل الکامل	عالم وفاضل کامل مولی فتح اللہ شروانی
المولی فتح اللہ الشروانی	رحمۃ اللہ نے سید شریف سے علوم عقلیہ
رحمہ اللہ تعالیٰ قرأ	وشرعیہ پڑھا اور قاضی زادہ رومی سے
العلوم العقلیۃ والشرعیۃ	سمرقند میں ریاضی کے علوم پڑھے ۔
علی السید الشریف وقرأ	
العلوم الریاضیۃ علی قاضی زادہ الرومی [3]	

---

[1] الشقائق ص ۱۱۰، [2] ایضاً ص ۱۷۰، [3] ایضاً ص ۱۱۵

مولانا فتح اللہ شروانی سے قاضی زادہ کی "شرح چغمنی" اور "شرح اشکال التاسیس" کو مولانا محمد نکساری نے پڑھا اور ان سے ان کے بھانجے نے جو طاشکبری زادہ کے والد تھے، اور اپنے والد سے طاشکبری زادہ نے، چنانچہ انھوں نے اول الذکر کے ترجمہ میں ان باتوں کی صراحت کی ہے۔

المولیٰ فتح اللہ ..... قرأ	مولیٰ فتح اللہ ..... نے علوم
العلوم الریاضیۃ علیٰ	ریاضی کی تحصیل قاضی زادہ سے کی تھی
قاضی زادہ..... فقرأ علیہ	..... ان سے (مولیٰ فتح اللہ سے)
..... خال والدی المولیٰ	میرے والد کے ماموں مولیٰ محمد نکساری
محمد النکساری	نے ..... شرح اشکال التاسیس
شرح اشکال التاسیس و شرح	اور شرح چغمنی پڑھی، یہ دونوں کتابیں
الجغمنی کلاھما من تصانیف	قاضی زادہ رومی کی تصنیف ہیں، مولیٰ
المولیٰ قاضی زادہ الرومی	فتح اللہ نے اسی طرح مستفید کیا جس طرح انھوں
وافادہ کما سمعہ من	نے شارح سے سنا تھا، اور مولیٰ محمد نکساری
الشارح فاقرأھا المولیٰ	نے میرے والد کو یہ دونوں کتابیں اسی طرح
محمد النکساری للمولیٰ	پڑھائیں جس طرح انھوں نے مولیٰ فتح اللہ
الوالد کما سمعہ من مولیٰ	سے پڑھا تھا، اور میرے والد صاحب نے
فتح اللہ ـ فاقرأھما المولیٰ	مجھ ناچیز کو انھیں اسی طرح پڑھایا جیسے
الوالد لھذا العبد الضعیف۱	انھوں نے ان کا سماع کیا تھا۔

۱ الشقائق۔ ص ۱۱۵

امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

امیر خسرو کی فارسی شاعری محض شاعری نہیں بلکہ ایک اعجاز ہے، قصیدہ گوئی ہو، مثنوی نگاری ہو، غزل سرائی ہو شاعری کی ہر صنف میں اپنا اعجازانہ کمال دکھاتے رہے، شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ امیر خسرو کے کلام میں جو برکات ہیں وہ گنہ گاروں کے دل میں نہیں پائی جا سکتی ہیں، برکات سے محروم لوگوں کے کلام کو مقبولیت اور قلبی اثر حاصل نہیں ہو سکتا، (اخبار الاخیار ص ۱۰۹-۱۰۴) مولانا شبلی بھی رقمطراز ہیں، کہ امیر کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہے، وہ اسی وادی ایمن یعنی تصوف کی شرر باریاں ہیں (شعر العجم حصہ دوم ص ۱۲۹) انکے اشعار پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خاص مجازی انداز میں کہے گئے ہیں، مگر اسی کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ انکے اشعار کیا ہیں، بلکہ بقول مولانا شبلی آگ سے دھواں اٹھ رہا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوڑے ہیں روتے روتے ٹھہر جاتے ہیں، اور جب رو لیتے ہیں تو آگے بڑھ جاتے ہیں، ان کی طبیعت میں یہ سوز، یہ گداز اور یہ درد آگئی اس صوفیانہ کیفیت سے پیدا ہوئی، جو ان کو فطری طور پر حاصل تھی، اور جس کی جلا ان کے مرشد کی صحبت میں ہوتی رہی، ان کی مثنویوں

قصیدوں اور غزلوں میں بعض ایسے اشعار ہیں، جن میں وہی عارفانہ کیفیات بھری ہوئی ہیں، جو اس راہ میں محسوس ہوا کرتی ہیں، اس کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کرنے سے پہلے راقم کی خواہش ہے کہ اہل نظر اور صاحب دل نے مختلف مواقع کی کیفیت کے لئے ان کے اشعار کا سہارا کس طرح لیا، اس کا ذکر آجائے تاکہ آیندہ راقم جو کچھ عرض کرے اس کی تائید ہو جائے،

امیر خسرو کے معاصروں میں سیر الاولیاء کے مؤلف نے ان کے اشعار کثرت سے نقل کرکے اپنی تحریروں میں خاص روحانی کیفیت پیدا کردی ہے، ہم یہاں کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا جمعہ کی نماز سے پہلے تجرید فرماتے، یعنی اپنے انبار خانوں اور مجرے کو بالکل خالی کر دیتے، اور وہاں جھاڑو دلوا دیتے کہ فتوحات میں سے کوئی چیز باقی نہ رہنے پائے، تجرید کے وقت بادشاہ یا کسی شہزادہ کی طرف سے کوئی آدمی پہونچ جاتا، فتوحات لاتا، ان کے آنے کے دبدبہ کا شور حضرت خواجہ کے کان میں پڑتا، تو وہ ٹھنڈی سانس لیتے اور اپنے سینۂ مصفا سے ایک آہ کھینچ کر فرماتے یہ لوگ ایک درویش کے وقت کو غارت کرنے کے لیے کہاں سے آگئے، سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے، کہ امیر خسرو کا یہ شعر ایسے ہی موقع کے لیے موزوں ہوا ہے،

چہ خیال فاسد است ایں کہ من گدات جویم
تو کہ بر در تو گم شد سر و تاج بادشاہان

(سیر الاولیاء، ص ۱۳۱)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے ایک ممتاز مرید شیخ تاج الدین تھے پہلے دنیا میں ملوث رہے، پھر اسکو چھوڑ کر حضرت خواجہ کے ہاتھ پر بیعت کی، فقر اور فاقہ کرکے مجاہدہ کو اپنی دولت سمجھنے لگے، سیر الاولیا نے اس سلسلے میں امیر خسرو کا یہ شعر نقل کیا ہے،

مملکتِ عشق ملک شد از کرمِ الٰہی ام پشت من و پاس علم نیست تباہی شاہی ام

(صفحہ ۲۱۳)

مولانا شمس الدین دامغانی حضرت خواجہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تو سیرالاولیا
مصنف نے اپنی خوشی کا اظہار امیر خسرو کے اس شعر کے ساتھ کیا ہے،

سعادت ابدی در پے ارادت تست چنانکہ عید مبارک ز بعد ماہ صیام

(صفحہ ۳۰۵)

سیرالاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ جمعہ کی رات کو انھوں نے خواب میں دیکھا کہ
حضرت خواجہ کی مجلس بجی ہوئی ہے، وہ وہاں حاضر ہوئے تو حضرت خواجہ نے ان کا ہاتھ
پکڑ لیا، اور فرمایا کہ تجدید بیعت کر لو، اس سے میری روح میں ایک تازگی پیدا ہو گئی کیونکہ
یہ میرے دل میں بھی بات تھی حضرت خواجہ نے تجدید بیعت کرایا جس سے میں بہت خوش ہوا"
اور مجھ پر گریہ طاری ہو گیا، امیر خسرو کا کیا خوب شعر ہے۔

ہمہ شب گریہ ام خفتن نداده است کہ بوئے گل رخ من باصبا بود

(صفحہ ۳۶۴)

حضرت خواجہ کی یہ تعلیم تھی کہ اہل تصوف عشق الٰہی میں وقت گذاریں اور خوامخواہ
شہرت حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ آخرت میں سزا پائیں گے، اسی بات کو
امیر خسرو نے اس طرح کہا ہے،

باش تا پردہ براندازد جہاں از روئے کار آنچہ امشب کردۂ فردات گردد آشکار

خود امیر خسرو نے کبھی پیر بننے کی خواہش ظاہر نہ کی، صرف حضرت خواجہ کے دامے

وابستہ ہی رہنا پسند کیا کرتے ہیں۔

زنجیر سگان در خود بر سر من بند | اکنون سر این نیست کہ دستار ببندم

حضرت خواجہ کی یہ بھی تعلیم تھی کہ محبت الٰہی میں دن اور رات یکساں ہے، محبوب کی محبت کی بے قراری میں نیند نہیں آتی، راز و نیاز حاصل کرنے کے لئے گریہ و زاری ضروری ہے، اس سے مشاہدہ میں ترقی ہوتی ہے، اس کے لئے رات کا وقت موزوں ہوتا ہے، جو اس نعمت کا طالب ہوتا ہے، تو اس کو خواب و قرار کی کیا ضرورت ہے، اسی لیے امیر خسرو نے کہا ہے۔

خواب ز چشم من بہ شد چشم تو بست خواب من | تاب نماند در تنم زلف تو برد تاب من

(صفحہ ۴۵)

ایک بار حضرت خواجہ نے سوز عشق پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ سینہ کی آہ سے دریا بھی خشک بیابان ہو سکتا ہے، امیر خسرو نے اسی کو اس طرح قلمبند کیا ہے،

در بازآہ سینہ من خشک شد چنانکہ | بر گریہ چشم خویش نہ بیند کسے نمے

موجودہ دور کے جن اصحاب نظر نے امیر خسرو کی شاعری کا مبصرانہ اور عارفانہ مطالعہ کیا ہے، ان کو بھی امیر خسرو کے یہاں بکثرت عارفانہ رنگ کے اشعار ملے ہیں، مثلاً امیر خسرو کے دیوان وسط الحیٰوۃ کو جناب فضل احمد حافظ نے ایڈٹ کیا، تو اپنے دیباچہ میں امیر خسرو کی یہ غزل نقل کرتے ہیں۔

بیا ساقی کہ ما در مے افتادیم | بخدمت پیش مے خوارں ستادیم

سر رندی جو کج کردیم در عشق | کلاہ صوفیاں ہم کج نہادیم

پیچو رساقیان میریم بار سے چو داو طاعت وتقوی داویم

ان اشعار کی تصریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں، کہ قطع منازل سلوک کا اظہار رندانہ انداز میں کیا گیا ہے، حاصل یہ ہے کہ ہمنے انانیت (خودی) کو مٹانے اور عشق صادق پیدا کرنے کے لیے اہل محبت کی خدمت اختیار کر لی ہے، اور اپنا ظاہر و باطن یکساں کرنے کے لیے کسی تکلف اور تصنع کو روا نہیں رکھا، کلاہ زاہد اگر کج ہی سہی، طاعت و تقوی کا التزام نہ ہو، لیکن ساقی (مرشد کامل) کی نظر لطف دو کار ہے، جس پر ہم ہر دم نثار ہیں، یہ تمام حقایق مجاز کے رنگ میں رنگے ہیں، پھر وہ امیر خسرو کی ایک اور غزل نقل کرتے ہیں،

بیا تا پے گل و صہبا نباشم کہ گل باشد بسے در ما نباشم
چو تنہا بودنی باید ہماں بہ کہ از ہم صحبتان تنہا نباشم
بیا جانا و ما را باش امروز چو میدانی کہ ما فردا نباشم
چو بگذارند یکجا دوستاں را چرا با دوستان یکجا نباشم

ان اشعار کی تصریح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ گل و صہبا سے مراد جذبات محبت جو کاملین کی صحبت سے حاصل ہوتے ہیں، دوسرے شعر میں گور کی تنہائی پر اشارہ کرتے ہوئے ترغیب صحبت نیکاں ہے، تیسرے شعر میں حسن استدلال کے طور پر درخواست ہے، کہ جب کہ کل ہم نہ ہوں گے تو صرف آج کے لیے اگر تم میرے پاس آجاؤ تو کیا حرج ہے، آخری شعر میں صحبت دوستان غنیمت شمر کو ادا کیا ہے، اور وجہ وہی خوف تفرقہ ہے کل یا آیندہ کل ضرور واقع ہوگا۔

ایک اور مسلسل غزل نقل کی ہے،

اگر اصحاب عشرت مے پرستند بیا ساقی کہ من ساقی پرستم

مرا گویند در مستی چہ دیدی | کہ می گوئی دل اندر بادہ بستم
تعالی اللہ ازیں بہتر چہ باشد | کہ از ننگ وجود خویش رستم

ان اشعار کو اس طرح سمجھا یا ہے کہ عشاق کی پہلی منزل ترک جاہ و مال و نام و ننگ ہے، اور سب سے آخری ننگ وجود سے رستگاری یعنی مرشد کامل کی توجہ سے مرتبۂ فنا حاصل ہونا جو اعلیٰ درجہ مقامات سلوک ہے،

امیر خسرو کے یہ اشعار بظاہر عاشقانہ معلوم ہوتے ہیں،

خواہم کہ بکوئے تو قدم جاں بسپارم | صد جان دگر در عوض از کوئے تو آرم
گر خلق جہاں زندہ بجانند ولیکن | من زندۂ عشقم کہ شیغم یار م

مگر جناب فضل احمد حافظ صاحب نے ان کی اس طرح تشریح کی ہے کہ عوام کے غم کے خلاف زندگی اور غم یار کو شہادت سے تعبیر کیا ہے، عشاق کے نزدیک کوئی دولت غم دوست (یعنی محبوب حقیقی) سے زیادہ عزیز نہیں، جس کا دوسرا نام عشق ہے۔ جناب فضل احمد حافظ صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ امیر خسرو کتمان عشق کے قائل تھے، یعنی خفاے عشق کی خاطر زباں سے محبوب کو جان کہنے میں تامل ہو۔ یہ استدلال ان اشعار سے کیا۔

غمت با این و آن گفتم نہ گفتم | اگرچہ ترک جان گفتم نہ گفتم
ترا جان گفتم از دل در تو دانی | کہ من آن از زبان گفتم نہ گفتم

فضل احمد حافظ صاحب ا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو فضیلت عشق کے قائل تھے، ان کے نزدیک انسان اور جمادات کے درمیان عشق و سوز ہی مایہ الامتیاز ہے

ہر دل بے عشق را من دل نہ گویم | تن بے سوز را جز گل نہ گویم

پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو عشق کو عقل پر فضیلت دیتے تھے،

شکایت ندارم از عشق بر عقل | جفائے شحنہ بر عامل نگویم
مگو با من کہ عاقل نیست عاشق | کہ من بے عشق را عاقل نگویم

مولانا سید سلیمان اشرف نے جب امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کو ایڈٹ کیا تو اس کے طویل مقدمہ میں امیر خسرو کے تصوف کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھایا جس کا خلاصہ یہ ہے،

امیر خسرو علیہ الرحمہ جہاں کہیں مسائل تصوف بیان کرتے ہیں، وہ ان کی حالت کا آئینہ ہوتا ہے، اس پر بیان کا ایک خاص زور اور وضاحت کلام کا ایک لطیف انداز ایسا ہوتا ہے کہ حسن بیان پر بلاغت، بلاغت پر فصاحت اور فصاحت پر ہزار شیرینی قربان ہے، مسائل تصوف میں الٰہیات کا حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے، خواجہ فریدالدین عطار، حکیم سنائی، مولانا رومی، نظامی گنجوی، ان سے قبل اور سعدی ان کی حیات میں اس طرح ان مسائل کو بیان کر چکے تھے کہ عقل حیران تھی کہ اب ان مسائل کے بیان کا کون سا جدید عنوان ہوگا، لیکن خسرو علیہ الرحمہ نے جب ان ہی مسائل کو بیان کیا تو معلوم ہوا کہ بیان کا یہ پہلو خسرو کا منتظر تھا، مثلاً یہ مسئلہ کہ انسان جو عالم امکان میں سب سے افضل ہے، اور اس کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں، یہ اگر اس امر کی کوشش کرے کہ حقیقت الٰہ سے آگاہ ہو جائے تو یہ ناممکن و محال ہے، علم ممکن حقیقت واجبہ کا احاطہ تو کہاں کر سکتا ہے، وہاں تک اس کی رسائی بھی محال ہے، اسی مضمون کو سعدی نے کہا ہے۔

تو ان در بلاغت بہ سحباں رسد | نہ در کعبہ بے چون سبحاں رسد

لیکن اب خسرو کو دیکھو کہ کس نئے انداز سے بیان کرتے ہیں،

ہر چہ از تو گمان بر دم بہ چونی — آن من بودم و تو زان برونی

انسان کی عقل جد و جہد کرتی ہے، مقدمات ترتیب دیتی ہے، حقائق اشیائے بحث کرتی ہے، صفات و خواص سے آگاہ ہوتی ہے، قدم و حدوث کا مسئلہ تحقیق کرتی ہے' ان سب مراحل کے بعد ایک نتیجہ پر پہونچتی ہے، اور چاہتی ہے کہ اسے حقیقت الٰہ قرار دے لیکن جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساری گردش گردش پرکار تھی، دائرۂ امکان سے ذرہ برابر بھی قدم آگے نہ بڑھا، تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے، سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ اس ایک شعر کو دیکھو چند سادے الفاظ میں کس وضاحت سے آیۂ کریمہ کی معنی خیز تفسیر کی ہے، کس طرح دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے، یہ ہے زور کلام اور حسن بیان،

اس عقیدہ کو کہ اللہ تعالےٰ عالم الغیب ہے، اور جو کچھ عالم کون میں ظاہر ہوتا ہے، وہی مقتضائے مصلحت ہے، وجود و عدم دونوں اس کے تحت حکم ہیں، نیستی و ہستی کوئی بھی حکمت سے خالی نہیں، کس صفائی و روانی سے نظم کا جامہ پہنایا ہے،

دانندۂ توئی بہر چہ راز است — سازندہ توئی بہر چہ ساز است

از بودنی ہر چہ بود دارد — از تو رقم وجود دارد

وانچہ از عدم ست نام او نیز — از حکمت تست ماندہ ناچیز

بود ہمہ گشتہ از تو موجود — حکم تو روان بہ بود و نابود

صرف عقل علت معرفت باری تعالےٰ ہے، یا نہیں، اس کا جواب یوں دیتے ہیں

لوامع صنعتش ہست چشم پوش عقول — چو آفتاب کہ نورش حجاب ابصار ست

حکیم گفت شناسم بہ عقل یزدان را — زہے کمال حماقت وہ این چہ گفتار

کنہ باری تعالےٰ تک عرفاء کی رسائی ہے یا نہیں، اس کا کیسا خوبصورت جواب دیا ہے

بکہ حق زسد عارف ارچہ داند دست　　بر آسمان نہ پرد جعفر ار چہ طیار ست

اس مسئلہ کو کہ دنیا کی ہر شے سے معرفت حق حاصل ہے یوں بیان کرتے ہیں،

بہر صحیفہ برگ است نور حکمت او　　نوشتہ چون لقب شہ بروے دینار ست

تصوف میں الہیات کے بعد وہ مسائل ہیں جن کا تعلق سالک کی ذات سے ہوتا ہے، مثلاً انسان کو راضی برضا ہونا چاہئے، اور کسی حالت میں شریعت کے دائرہ سے باہر نہ نکلنے پائے، ان باتوں کو یوں سمجھاتے ہیں،

انچہ مقدر شدہ است چون نبود بیش و کم　　گر برسد خرمیم ور نہ رسد باک نیست

حرص بجائت کشد شارع دین گیر زانکہ　　بے روشِ مصطفےٰ راہ بر افلاک نیست

راہ تصوف میں مجاہدہ کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، قدم قدم پر ایثار و قربانی کرنا چاہئے، عمدہ مثالیں دے کر خوبصورتی سے سمجھاتے ہیں،

گاہِ دغا در صفِ مردان مرد　　نام نبرد آن کہ خدنگے نخورد

طبل کہ سوراخ کنندش بہ پوست　　بہر برون رفتن آواز اوست

نانشود خستہ بصد جا دلت　　نور حقائق نہ شود حاصلت

چہرہ سنگ ار نہ کنی گو بگو　　دانہ کجا سود شود جو بجو

دل کیا ہے، اس کی کیا قدر ہے، اس کی زندگی کیا ہے، اس کی موت کیا ہے، ان امور کو جس شاعرانہ پیرایہ اور محققانہ طریقہ سے بیان کیا ہے، ان ہی کا حصہ ہے، کہتے ہیں

چون تن آدم بہ گل آراستند　　خانہ جہان بہر دل آراستند

آدمی آن نیست کہ در وے دل است　　در نہ علف خانۂ آب و گل است

دل نہ ہمان قطرۂ خون است و بس　　کز خود مآشام بر آرد نفس

دل اگر این مہرۂ آب و گل ست — خواہم از اقبال تو صاحب دل ست
یک دل آن شد کہ ہوائے دو دست — وز طرفے بوئے وفائے دو دست
زندہ بجان خود ہمہ حیوان بود — زندہ بدل باش کہ عمر آن بود
زندگی دل چہ بود سوز و چاک — زندگی کالبدی چیست خاک
غمزدہ بہ جان کہ غم اندر نیست — سوختہ بہ دل کہ در وسوز نیست
سردی دل مردگی دل بود — خون چو بہ تن سرد شود گل بود

عشق کی کیا شان ہے، عشاق کی کیا روش ہے، عشق کا کیا درجہ ہے، ان باتوں کو اس وجد وکیف سے بیان . . کرتے ہیں کہ اگر ذرا غور کیا جائے تو دل روحانی سرور سے معمور ہو جاتا ہے،

عشق زبانی زہر افسردہ پرس — سوزش ان از دل آزردہ پرس
ذوق نمک گرچہ زبان راخوش ست — چوں بہ جراحت نگنی آتش ست
موم بود دل کہ نہ عشق ست زار — کو بگداز او قند از یک شرار
شعلۂ عشق چو شد خانگی — سوختہ شد عقل بہ پروانگی
زندہ دل آنست کہ جائے در دست — اوست کہ از عشق نشانے در دست
جان کہ نہ عشقش بود آن بازی ست — عشق نہ بازی ست کہ جاں بازی ست
چند بری عشق بہ بازی بسر — عشق دگر باشد و بازی دگر
مرد کہ در عشق نہ جان فرد نیست — گر صف کافر شکند مرد نیست
چون تو فغان از سر خارے کنی — بہ کہ جز از عشق شمارے کنی

مرد وہی ہے، جو ابتلا و امتحان کے میدان میں جرأت اور استقامت سے

مقابلہ کرے۔

مردنہ ترسد زفقر شیر نہ ترسد ز زخم　　مذہب عیار نیست نیم عسس داشتن
عذر عوسان بود دعوی مردی دبس　　گاہ وغا تیغ خصم روے بہ پس داشتن

سب سے وسیع ترین تصوف کا وہ حصہ ہے جس میں عشقیہ روش کی آمیزش ہوتی ہے، اس کی بنیاد سعدی علیہ الرحمہ نے ڈالی جس پر ایک قصر عالی شان خسرو اقلیم سخن نے تعمیر کر دیا۔ بیان کی اس صفت میں خصوصیت کے ساتھ ان کا تخیل بہت ہی بلند پایہ رکھتا ہے، اپنے تخیل کو جسمانی جامہ پہنا کر اس طرح پیش کر دیتے ہیں جس سے ان کا تخیل تخیل باقی نہیں رہتا بلکہ وہ گوشت و پوست و استخوان سے درست ملکوتی روح پھونکی ہوئی مورتیں ہوتی ہیں، مثلاً

گل اندر خوابگاہ نرگس افتد چو وزد دو بت　　ولیکن عشق بازان راست خوابگاہ افتد
ز چشمت کاروانِ صبر من تاراج کا خر شد　　مسلمانان کسے دبدست کاندر شہر راہ افتد

فصل نوروز کہ ابر دطرب برہمہ خلق　　چشم بد دور مرا سم باران آورد
ہر سحر باد کہ بر سینہ من کرد گزر　　در چمن بوے کباب از پے مستان آورد

ان ہی اشعار کو دیکھو تخیل کیسا اعلیٰ ہے، اور پھر کلام میں کس طرح درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے کہ دل تڑپ کر رہ جاتا ہے، یہ شاعرانہ حیثیت سے بھی اعلیٰ مظہر ملکوتی عالم میں حسن وعشق حقیقی کے خیالات میں محو اور دوسرے نازک ترجذبات ولطافت میں غرق زندگی بسر کرتے تھے...... ان کا عاشقانہ کلام مردہ دلوں کے لیے آب حیات کا کام کر رہا ہے

جہاں سے چاہو اٹھا کر دیکھو ایک چھوڑ ہزار ثبوت پاؤ گے ......

یہاں صرف دو مثالیں دی جاتی ہیں،

برو اے یار پیش دیگراں وہ جلوہ بستاں را
مرا بگزار تا می بینم آن سرو خراماں را
گرفتار خیالات پیش گشتم یقین باشد
اثر ہر گز نگس در خواب بیند شکرستاں را
مپرس از من کہ چون می باشد آخر جانِ غمناکت
کہ من دیریست کز یادش فرامش کردہ ام جاں را

تن پاکت کہ زیر پیرہن ست | وحدہ لاشریک لہٗ چہ تن ست
اندر آ۔ درمیان جان بہ نشین | کہ تو جانی و جان من بدن ست
تا زیم درغم تو جامہ درم | وزپس مرگ نوبت کفن ست
دل خسرو خوش ست با تنگی | کہ مرا یادگار زاں دہن ست

اس دردآگینی کی وجہ صاف ہے، ان کو اہل دل گروہ سے واسطہ تھا، ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت اور ان چاروں سے ماوراء جو عالم ہیں ان کی سیر سے ان کی چشم بینا بصارت حاصل کئے ہوئے تھی، اور انھیں عالموں کی آب و ہوا میں ان کے قوائے باطنی نے پرورش پائی تھی، دل خستہ تھا، اور آتش عشق سے برشتہ، زبان صرف دل کی ترجمان تھی، اور بس خسرو دل کی برشتگی و سوختگی کچھ ازل ہی سے لے کر آئے تھے جس کو چشتی نسبت نے اور بھی بھڑکا دیا تھا، اس پر شیخ طریقت حضرت سیدنا نظام الدین اولیا سلطان المشائخ محبوب الٰہی رضی اللہ عنہ بحر متہ کی توجہ ظاہری و باطنی جب پڑتی تو اس آتش کی شعلہ فشانی افسردہ دلوں کو اور بھی جلا کر خاکستر کر دیتی۔ (صفحہ ۸۰-۷۰)

متقدمین اور متاخرین نے امیر خسرو کے اشعار کا تجزیہ جس عارفانہ رنگ میں کیا ہے،

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موقع بموقع ان کے اشعار کا سہارا لے کر روحانی سکون حاصل کیا جا سکتا ہے، ان کے مجازی اور عاشقانہ رنگ کے اشعار میں بھی عارفانہ رنگ پایا جاتا ہے، ان کا عاشقانہ کلام مردہ دلوں کیلئے آب حیات کا کام کرتا ہے، ان کے تخیل میں ملکوتی روح پھونکی ہوئی معلوم ہوتی ہے، وہ عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں، اس لیے ان عشقیہ اشعار میں بڑی درد آگینی ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ، مگر ان کے کلام کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سوزِ عشق کی چنگاریاں اڑتی دکھائی دیتی ہیں، ان کے مرشد نے ان کو نصیحت کی تھی کہ معشوقوں کے زلف و خال کے ساتھ اصفہان کے شعراء کے طرز پر عشق انگیز کلام کہا کریں، ان کا کلام اسی اجمال کی تفصیل ہے، وہ زلف و خال کے پردے میں سوزِ عشق کا اظہار کرتے رہے، یہ سوز ان کے سینہ میں کہاں سے آیا، فطری تھا، پیدائشی تھا، ازلی تھا، یا یہ اپنے مرشد سے پایا، ان کے مرشد کے کسی مرید کے سینہ میں یہ سوز پیدا نہیں ہوا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کے سینہ میں خدا کی طرف سے ودیعت ہوا، جس میں اور بھی زیادہ برشتگی اور خستگی ان کے مرشد کی وجہ سے پیدا ہو گئی پھر ان کا سوز اتنا مشہور ہوا کہ اس کے ساتھ افسانوی رنگ پیدا ہوتا گیا، بعض تذکرہ نگاریہاں تک لکھ گئے ہیں کہ ان کے سینہ کے پاس کا کپڑا سوزِ عشق کی حرارت کی گرمی سے جلا رہتا، کچھ تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ بھی فرماتے کہ کل قیامت میں ہر ایک شخص کسی شے پر ناز کریگا، اور اسے ترک میں تیرے سوزِ سینہ پر ناز کرونگا، اکثر دعا میں یہ فرماتے کہ

الٰہی بہ سوزِ سینۂ این ترک مرا بہ بخش

(ہشت بہشت، مقدمہ ص ۱۰)

انکی شاعری اسی سوزِ عشق کا مظہر ہے، جو کبھی عشق الٰہی، کبھی عشق رسولؐ، کبھی مرشد، کبھی عشق کائنات، کبھی عشق مناظرِ فطرت، کبھی وطن، کبھی عشق آقائے شاہی، کبھی عشق والدین اور کبھی عشق

گجرات کے ایک نامور محدث و مورخ

شیخ عبدالقادر عیدروسی

منصور نعمانی ندوی، رفیق دار المصنفین

(۲)

تصانیف | شیخ عبدالقادر عیدروسی نے اپنی پوری زندگی رشد و ہدایت کے لیے وقف کر دی تھی، اور سلسلۂ عیدروسیہ کی ترویج و اشاعت کو انھوں نے وظیفۂ حیات بنا لیا تھا، بایں تقویٰ و طہارت تصنیف و تالیف کا بھی بڑا اچھا ذوق فیاض ازل نے ودیعت کیا تھا، تصنیف و تالیف کے میدان میں انھوں نے اپنی وسعت نظر، کثرت علم اور بے مثل مطالعہ کے نقوش ثبت کئے ہیں، مگر شیخ ان مظلوم مصنفین میں سے ہیں جن کی زیادہ تر کتابیں منظر عام پر نہ آسکیں، اس کے باوجود وہ عزت و شہرت کے نصف النہار پر پہونچے، اور ارباب تراجم و تذکرہ سے مورخ و صوفی کا لقب پایا، انکی کچھ کتابیں دست برد زمانہ کی نذر ہو گئیں، کچھ کتب خانوں میں محفوظ ہیں، انھوں نے خود اپنے سوانح حیات میں بائیس (۲۲) کتابوں کے نام تحریر کئے ہیں، صاحب المشرع الروی نے انکی دو کتابوں کا اور ذکر کیا ہے، صاحب اعلام اور جرجی زیدان نے ایک اور کتاب کا سراغ لگایا ہے، بوہار کی فہرست مخطوطات میں تین مزید کتابیں نظر پڑیں، اسطرح انکی تعداد اٹھائیس ہو جاتی ہے، بروکلمن نے کتابوں کی تعداد صرف پچیس لکھی ہے، صاحب معجم المطبوعات کا بیان ہے کہ انھوں نے مفید کتابیں سپرد قلم کیں، اور ان کی شہرت ملک بھر میں پھیل گئی،

ان کی تصانیف میں یہ پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے کہ انھوں نے علم کی ہر شاخ کو ثمر بار کیا،

سیرت نبوی، سیر الصحابہ، تاریخ وسوانح، اخلاق وتصوف، دین وعقیدہ، حدیث وتفسیر اور شعر وادب علوم وفنون کی شاید ہی کوئی صنف ہو جس پر انھوں نے ایک بیش بہا ذخیرہ نہ چھوڑا ہو۔ اگر موصوف کی تمام مخطوطات مطبوعات کی صورت میں منصۂ شہود پر آجائیں تو علم وفن کی بڑی خدمت کے ساتھ شیخ کے علوم وفنون میں کامل بصیرت ومہارت کا ثبوت ہوگی۔ ہم کو ان کی صرف دو مطبوعہ کتابیں دستیاب ہو سکیں، النور السافر اور تعریف الاحیاء ان کا تفصیلی تعارف کرایا جائے گا، ان کے علاوہ ان کی دوسری کتابوں کا ہم ذیل میں اجمالی ذکر کریں گے۔

۱۔ الفتوحات القدسیہ فی الخرقۃ العیدروسیہ، یہ مصنف علام کی مشہور ومقبول کتاب ہے، اس کتاب میں سلسلۂ عیدروسیہ کے جامع تعارف کے ساتھ اس سلسلہ کے بانی اور دیگر مشائخ اور اپنے والد کے حالات اور اس سلسلہ کے اشغال واذکار کا تفصیل سے ذکر ہے، یہ کتاب خاصی ضخیم ہے، مصنف نے اسے ۹۹۰ھ میں لکھا تھا، یہ حسن اتفاق ہے، کہ اس کتاب کی تاریخ بھی اس کے نام سے مطابقت رکھتی ہے، مشہور شاعر مخدوم زادہ نے لبس خرقۃ سے تاریخ نکالی ہے، [1]

شیخ عبدالقادر کو اپنی اس کتاب پر بڑا فخر وناز تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ اس سے پہلے ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی [2]

۲۔ حدائق الخضرۃ فی سیرۃ النبی واصحابہ العشرۃ، اس کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے، اس کے سلسلہ میں شیخ کا بیان ہے کہ "یہ میری پہلی کتاب ہے، اور یہ اسوقت لکھی گئی جب میری عمر بیس سال کی تھی"۔

---

[1] النور السافر ص ۴۴۵ [2] ایضاً ص ۳۴۰

۳- اتحاف الحضرة العزیزة بعیون السیر الوجیزہ - یہ حدائق کا خلاصہ ہے طرز وتحریر اسی طرح دلکش ہے،

۴- المنتخب المصطفی من اخبار مولد المصطفی، اس کے بارے میں شیخ لکھتے ہیں کہ اس کے اسلوب بیان پر صلحائے امت نے دل کھول کر داد دی ہے۔

۵- المنہاج الی معرفۃ المعراج، یہ رسالہ معراج نبوی کے متعلق ہے،

مولانا عبدالحیٔ حسنی لکھتے ہیں کہ متذکرۂ بالا چاروں کتابیں عربی میں ہیں، اور سیرت کے موضوع پر بے نظیر ہیں[1] ان چاروں کتابوں کے کسی نسخہ کا کسی کتب خانہ میں ذکر نہیں ملا۔

۶- الانموذج اللطیف فی اہل بدر الشریف :- اس کے بارے میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ اہل بدر کے مناقب وفضائل اس سے پہلے اس انداز میں نہیں لکھے گئے ہیں، یہ کتاب میری زندگی کا قابل فخر کارنامہ ہے، اس کی بنا پر میں خدائے عزوجل سے جنت کا امیدوار ہوں[2] اس کے مخطوطہ کے بھی ہمیں علم نہیں ہو سکا۔

۷- اسباب النجاۃ والنجاح فی اذکار المساء والصباح :- یہ اُن اذکار و اوراد کے بارے میں ہے، جو صبح وشام پڑھے جاتے ہیں، اس کا بھی کسی کتب خانہ میں پتہ نہیں چلا،

۸- الدر الثمین فی بیان المہم من علم الدین :- اس کا ایک مخطوطہ بوہار میں پایا جاتا ہے، مخطوطہ کا نمبر ۲۵۳ ہے، یہ کتاب چار ابواب پر منقسم ہے، پہلے باب میں عقائد، دوسرے میں احکام وقواعد اسلام تیسرے میں اخلاق اور چوتھے میں تقوی کا بیان ہے

---

[1] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند مطبوعہ دمشق ص ۹۰ [2] النور السافر ص ۳۲۹

[3] النور السافر فہرست مخطوطات بوہار جلد ۲ / ۴۹۹

۹۔ الحواشی الرشیقۃ علی العروۃ الوثیقۃ :۔ مصنف نے اس کا ذکر کیا ہے۔ کوئی تفصیل نہیں دی ہے، یہ کسی کتب خانہ کی فہرست میں بھی نظر نہیں آئی۔

۱۰۔ فتح الباری بختم صحیح البخاری :۔ اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ بوہار فہرست میں مخطوطہ نمبر ۴۵۲ کا تیسرا حصہ "رسالۃ فی مناقب بخاری" ہے جو کی تصنیف قرار دیا گیا ہے، لیکن کچھ تفصیلات درج نہیں ہیں[1]

۱۱۔ عقد اللآل بفضائل الآل :۔ اس میں اہل بیت کے فضائل ومناقب کیے گئے ہیں، فہرست بوہار میں اس کے ایک مخطوطہ کا پتہ چلا ہے، مخطوطہ نمبر (حصہ ۲) پر ہے، اور یہ شروع ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

"الحمد للہ الذی خص آل البیت النبوی بحقائق العلوم والمعارف الالٰھیۃ"

یہ حسب ذیل ابواب میں منقسم ہے۔ القسم الاول وفیہ أبواب، باب وصیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب الحث علی حبھم القیم بواجب حقھم، باب مشروعیۃ الصلوٰۃ علیھم، باب دعا صلی اللہ علیہ وسلم بالبرکۃ فی ھذا النسل، باب الامان ببقائھ باب خصوصیاتھم الدالۃ علی عظم کرامتھم، باب اکرام ومن بعدھم لأھل البیت، باب مکافاتہ لمن أحسن الیھم التحذیر من بغضھم وسبھم، القسم الثانی فی ذکر فاطمۃ ا القسم الثالث، فی وقائع دالۃ علی عنایۃ اللہ ورسولہ صلی اللہ

---

[1] فہرست بوہار ۲/ ۵۰۲

والبشرہ الشہداء بأہل البیت ۔ اس نسخہ کی کتابت (مصنف کی زندگی میں) ربیع الاول ۱۰۱۱ھ میں ابوبکر بن محمد المکی کے ہاتھوں ہوئی ۔[1]

۱۲۔ خدمۃ السادۃ آل باعلوی باختصار العقد النبوی : اس میں عیدروسی سادات کی خدمات نبوی کا غالباً جائزہ لینا مقصود ہوگا۔ مصنف نے لکھا ہے، کہ "میں اللہ سے امید کرتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے"[2] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب تیزی سے لکھ رہے تھے، مگر مکمل نہ کر سکے، اس لئے تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں ان کی اس کتاب کا ذکر نہیں آتا ۔

۱۳۔ بغیۃ المستفید فی شرح تحفۃ المرید : معلوم ہوتا ہے کہ تحفۃ المرید اس زمانہ میں بہت متداول تھی، اس لئے اس کی شروح بہت لکھی گئیں، شیخ کے والد نے دو شرحیں لکھی تھیں پھر خود شیخ نے ایک مختصر شرح لکھی، اس کا ایک نسخہ بوہار میں مخطوطہ نمبر ۵۰۴ کے مجموعہ رسائل پر موجود ہے ۔[3]

۱۴۔ النفحۃ العنبریۃ فی شرح البیتین العدنیۃ : اس کی تفصیل نہ کسی کتاب میں ملی، نہ کسی قلمی نسخہ کا پتہ چل سکا ۔

۱۵۔ غایۃ القرب فی شرح نہایۃ الطلب : اس سلسلہ میں شیخ نے لکھا ہے کہ اس شرح کے ساتھ لوگوں نے بہت اعتناء کیا، اور علماء نے اس کو یاد کرنے کا مشغلہ رکھا۔ مگر اس وقت اس کے کسی نسخے کا کسی کتب خانہ میں پتہ نہیں چلتا ۔

۱۶۔ شرح قصیدۃ الشیخ ابی بکر العیدروس النونیہ : یہ اس کے سلسلہ میں قمطراز ہیں، یہ عبارت کی آسانی اور فہم مطالب میں سہولت اور حسن بیان کی دل آویزی میں ممتاز ہے

---

[1] فہرست بوہار ۲/۵۰۰ [2] النور السافر ص۳۳۹ [3] فہرست بوہار ۲/۵۰۸

بہار کی فہرست مخطوطات عربی میں شرح القصیدۃ النونیہ کے عنوان سے مخطوطہ نمبر ۲۳۳ پایا جاتا ہے، اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی خَلَقَ الْاِنْسَانَ فِی اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ پھر اس شعر سے آغاز ہوا۔[1]

کل من یسب یمنع نفسہ عن حضیض الطوی ذاق الھوان

۱۷۔ اتحاف اخوان الصفا بشرح تحفۃ الظرفاء با سماء الخلفاء، اس کے بارے میں مصنف نے کچھ اظہار خیال نہیں کیا ہے، بوہار کے مخطوطہ نمبر ۲۰۰ پر یہ شرح موجود ہے، اس کی ابتدائی عبارت یہ ہے۔

الحمد للہ رب العالمین الذی علمنا ما لم یکن به عالمین۔

الحمد للہ حمد الانفاذ لہ وانما الحمد حقا راس من شکرا[2]

۱۸۔ الفتح القدسی فی تفسیر آیۃ الکرسی :- یہ آیۃ الکرسی کی تفسیر ہے، بوہار کی فہرست میں ایک تو اسی نام سے اور ایک آیۃ الکرسی کے نام سے موجود ہے مخطوطہ نمبر ۵۰۴ کے مجموعہ میں یہ رسالہ موجود ہے۔[3]

۱۹۔ صدق الوفا بحق الاخاء :- احمد بن محمد باجابر مشہور ادیب، شاعر، فقیہ اور عالم تھے۔ وہ شیخ عیدروسی کے چہیتے شاگرد، اور خاص حاضر باشوں میں تھے، گردش روزگار سے شاہی عتاب کی زد میں آئے، اور سلطان نے بہاولا ہور ان کو زہر دلوا دیا، جس سے جانبر نہ ہو سکے، اس دلدوز واقعہ نے استاد عیدروسی کو بے حد صدمہ پہنچایا اس رسالہ میں باجابر کے کمالات علم و فضل کا بیان ہے، اس کے بارے میں شیخ نے نفیس ادلعلائی رد درۃ تاج الفضلاء کے القاب سے یاد کیا ہے، بوہار میں مخطوطہ نمبر ۲۵۴

---

[1] فہرست بوہار ۲/۲۰۴ [2] بوہار ۲/۲۳۵ [3] ایضاً ص ۵۰۰

(نمبر دوم) پر پایا جاتا ہے۔ ایک نسخہ اس کا برین کی لائبریری میں بھی پایا جاتا ہے[1]

۲۰۔ الروض الاریض والفیض المستفیض :۔ یہ شیخ عیدروسی کے مجموعۂ اشعار کا نام ہے، اس دیوان کے کسی قلمی نسخہ کا پتہ نہ چل سکا، البتہ اشعار کے نمونے النور السافر میں جابجا بکھرے نظر آتے ہیں جن سے ان کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے، ان اشعار میں حکمت و معرفت کا گراں مایہ خزانہ، حکیمانہ عشق و معرفت میں ڈوب کر شعر کہنا، خیالات کی بلندی اور تضاد و پیچ سے نکلنا کمال شاعری ہے اور یہ خوبیاں ان کے کلام میں موجود ہیں۔

۲۱۔ روح الراح وراح الارواح :۔ شیخ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، اس کا ذکر صرف بوہار کی فہرست میں مجھے مل سکا، اس کے مقدمہ کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عیدروسی کے جو اشعار سلوک و معرفت سے متعلق ہیں، ان کی تشریح اس میں کی گئی ہے، میرا خیال ہے کہ دیوان الروض الاریض میں سلوک کا باب ہوگا، اور یہ اسی باب سے متعلق شرح ہے، میرے اس خیال کی تائید مقدمہ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے: "الحمد لله الذي شرح صدري وانار بنور معرفته وبعد فقد من الله تعالى علي وله الحمد بان وفقني لنظم ابيات قلتها في السلوك الى ملك الملوك ثم خطر لي ابراز معانيها الدقيقة واظهار رموزها المشيرة الى الطريقة فوضعت هذه الوريقات لتقييد تلك الرشحات فجاء بحمد الله تعالى شرحا فائقا في فنه بديعا في حسنه وسميته روح الراح وراح الارواح"۔ یہ مخطوطہ نمبر ۱۲۵ پر موجود ہے[2]

۲۲۔ فتح الجواد بشرح سعاد :۔ بانت سعاد کی سیکڑوں شرحیں لکھی گئیں، شیخ نے بھی اس کی شرح کی ہے، مگر اس کا ذکر اپنے تذکرہ میں انھوں نے نہیں کیا ہے۔ لیکن

---

[1] تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ۳/۳۱۵ [2] بوہار ۲/۱۲۸-۱۲۹

اس کا ایک مخطوطہ بوہار میں پایا جاتا ہے، اس کا نمبر ۲۳۴ ہے۔[۱]

۲۳۔ الاعتقادیۃ۔ اس کا ذکر میں صرف بوہار کی فہرست میں نظر سے گزرا، میرا خیال اس کتابچہ کے سلسلہ یہ ہے کہ صفحات گذشتہ میں ان کی کتابوں میں الدر الثمین نامی کتاب کا تفصیل سے تعارف کرایا گیا ہے، اس میں عوام کی تفہیم کے لیے بنیادی دینی عقائد کو پہلے باب میں "الباب الاول فی العقیدۃ" کے تحت بیان کیا گیا ہے، غالباً اسی باب کو کسی نے الگ کر دیا، اور اس کو الاعتقادیہ کا نام دیدیا،

۲۴۔ الروض الناضر فی من اسمہ عبد القادر من اہل القرنین التاسع والعاشر | دسویں صدی کے اعیان واکابر کے حالات میں عیدروسی کی مشہور زمانہ کتاب النور السافر موجود ہی ہے۔ یہ نویں دسویں صدی کے ان علماء ومشائخ کا مبسوط تذکرہ ہوگا، جن کے نام عبد القادر تھے، اس میں بہت تلاش وتفحص سے کام لیا گیا ہے، اگر یہ گرانمایہ کتاب منظر عام پر آجائے تو کمالات عیدروسی کا ایک نیا گوشہ سامنے آجائے۔ اس کتاب کا ذکر انہوں نے اپنی کتابوں کے ذیل میں نہیں کیا، البتہ زرکلی نے اس کا ذکر کیا ہے[۲] جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ اس کا ایک قلمی نسخہ برلین کی لائبریری میں پایا جاتا ہے۔[۳]

۲۵۔ الزہر الباسم من روض حاتم ا۔ شیخ عیدروسی کے استاد، بزرگ اور قریبی رشتہ دار سید حاتم الاہدل، بڑے صاحب کمال بزرگ، نامور عالم، ممتاز ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے، سلوک وتصوف میں بلند مقام حاصل ہونے کی وجہ سے عیدروسی نے ان کو ابن عربی کے لقب سے یاد کیا ہے[۴] ان کا انتقال سنہ ۱۰۱۳ھ

---

[۱] بوہار ۲/۴۶۶ [۲] ایضاً ص ۵۰۰ [۳] الاعلام ۲/۵۳۳ [۴] تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ۳/۳۱۵ [۵] النور السافر ص ۱۲۱

میں ہوا۔ عیدروسی نے اپنے استاد کی کتاب، دمف کی شرح دو ضخیم جلدوں میں لکھی، اسوقت النور السافر ختم کر چکے تھے، اس لئے اس میں اس کا ذکر نہیں ہے، مورخ شلی نے اس ذکر کیا ہے[۱] مورخ محبی نے اس شرح کا نام "الدر الباسم" لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ اس کتاب کے کسی قلمی نسخہ کا پتہ نہیں چل سکا۔

۲۶۔ قرۃ العین فی مناقب الولی عمر بن محمد باحسین۔ اس میں ولی کامل عمر بن محمد باحسین کے حالات وکمالات بیان کئے گئے ہیں، غالباً یہ بھی دور آخر کی تصنیف ہو، مورخ شلی نے اس کا ذکر کیا ہے، اس کے کسی قلمی نسخہ کا علم نہ ہو سکا۔

۲۷۔ تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء۔ یہ شیخ کی مشہور تصنیف ہے، اس کے سبب تالیف کے بارے میں خود ان کی زبانی سنئے "ہمارے سردار عبداللہ العیدروس نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے گناہ معاف کرے، جو میرے کلام کو غزالیؒ کے کلام کو شامل قرار دے" میں نے اسی دعا کی لالچ میں اسے لکھا ہے، اس تصنیف سے والد مرحوم کی خواہش کی بھی تکمیل ہوگئی، جو فرمایا کرتے تھے، کہ اگر زمانہ مہلت دے تو میں شیخ عبداللہ کے کلام کو غزالی کے کلام سے ملاؤں اور اس کتاب کا نام الجوہر المتلالی من کلام الشیخ عبداللہ فی الغزالی رکھوں، یہ کتاب انھیں کے کلام ان ہی کی کتابوں اور ان ہی کی تعریف پر مشتمل ہے[۲] سلسلۂ عیدروسیہ کی بنیاد امام غزالیؒ کی یہی کتاب ہے، عیدروسی نے اس کتاب کو ایک مقدمہ ایک مقصد اور ایک خاتمہ میں تحریر کیا ہے، مقدمہ میں تو عنوان کتاب ہے، اور مقصد کے باب میں احیاء العلوم کے فضائل، مدائح اور اکابر کے تعریفی کلمات ہیں، اور ان باتوں کا رد ہے، جس کے سبب صاحب احیاء العلوم کو مطعون کیا جاتا ہے۔

---

[۱] المشرع الروی بحوالہ خلاصہ ۲/ ۲۴۴ [۲] النور السافر ص ۳۲۹

اور خاتمہ مصنف کے حالات زندگی اور تصوف و سلوک کی منزل کو اختیار کرنے کے باب میں ہے۔

عیدروسی امام غزالی کو عالم العلماء وارث الانبیاء، حجۃ الاسلام، حسنۃ الدھور والاعوام تاج المجتہدین جیسے بلند القاب سے یاد کرتے ہیں۔ . . . . احیاء العلوم علماء اور عاملین کے نزدیک نفع و برکت کی بڑی دولت خیال کی جاتی ہے[1]۔ علم سلوک و معرفت پر اس سے بہتر کتاب نہیں ہے یہ شریعت، طریقت اور حقیقت پر مشتمل ہے غوامض و اسرار کو واضح کرتی ہے[2]

میرے والد شیخ بن عبد اللہ (متوفی سنہ ۹۹۰ھ) اس کا بڑی پابندی سے مطالعہ فرماتے انھوں نے اس کے بہت سے نسخے حاصل کئے تھے، طالبین کو اس کا درس دیتے تھے، اور جب ختم ہوتی تو ایک بڑی شاندار ضیافت فرماتے، میں نے بھی والد کی اس سنت کو جاری رکھا[3]

یہ رسالہ کل ۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، مگر احیاء العلوم کے فضائل و مناقب اور فوائد پر بڑی جامعیت سے بحث کی گئی ہے، احیاء العلوم قاہرہ سے چار جلدوں میں سنہ ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی، اس کے حاشیہ پر دو عظیم الشان کتابیں طبع ہوئیں ایک تو تعریف الاحیاء (عیدروسی) اور دوسری عظیم کتاب عوارف المعارف (سہروردی) ہے، مگر ہمارے پیش نظر وہ نسخہ ہے، جو دو جلدوں میں حنائی کاغذ پر سنہ ۱۳۲۲ھ میں مطبع میمنیہ مصر سے شائع ہوئی، اور پہلی جلد میں صرف صفحہ ۴۰ تک یہ طبع ہوئی ہے اس کے بعد عوارف المعارف ہے،

۲۰ ۔ النور السافر عن اخبار القرن العاشر :۔ یہ عیدروسی کی وہ عظیم الشان اور شہرہ آفاق کتاب ہے، جس کی بدولت وہ شہرت و عظمت کے فلک الافلاک پر

---

[1] تعریف الاحیاء، بہامش احیاء العلوم ص ۲ [2] ایضاً ص ۱۲ [3] ایضاً ۱۱ النور ص ۱۹۰

پر پہونچے ان سے پہلے حافظ ابن حجر نے آٹھویں صدی کے مشاہیر کے حالات پر الدررالکامنہ اور حافظ سخاوی نے نویں صدی کے اکابر کے تذکرہ میں الضوٗ اللامع لکھی تھی ۔ علامہ عیدروسی کو اس موضوع پر کتاب لکھنے کا خیال غالباً ابن حجر اور سخاوی کی انھیں تذکرہ بالا کتابوں کو دیکھ کر آیا اور انھوں نے دسویں صدی کے علماء و اعیان پر ایک ضخیم تذکرہ لکھ دیا ۔ یہ تذکرہ ان دونوں تذکروں سے اگرچہ ضخامت میں بہت کم ہے، لیکن باین ہمہ بڑا بیش قیمت اور ایک ہندوستانی عالم کا شاہکار ہے، اگر ابن حجر کی کتاب نقش اول اور سخاوی کی کتاب نقش ثانی ہے، تو علامہ عیدروسی کی یہ کتاب نقش ثالث کا درجہ رکھتی ہے ۔ ابن حجر کی کتاب دائرۃ المعارف ۔ حیدرآباد سے ۱۳۴۸ھ میں چار جلدوں میں، سخاوی کی کتاب مکتبہ قدسی قاہرہ سے ۱۳۵۵ھ میں بارہ جلدوں میں اور عیدروسی کی کتاب مکتبہ العربیہ بغداد سے ۱۳۵۳ھ میں ایک جلد میں شائع ہوئی ہے ۔ یہ صدی وار سلسلۃ الذہب کی ایک تابناک کڑی ہے، اس لئے اس کا جائزہ ذیل کی سطور میں پیش کیا جارہا ہے ۔

النور السافر دسویں صدی کے اکابر علماء، امراء، اور صوفیہ و مشائخ کا مستند تذکرہ ہے، ویسے تو سیکڑوں علماء کا اس میں ذکر ہے، لیکن قابل ذکر علماء میں حافظ سخاویؒ حافظ سیوطیؒ، علامہ قسطلانیؒ، علامہ دوانی، قاضی زکریا انصاریؒ، علامہ عبدالحق سنباطیؒ جمال الدین زبیدی، ابن حجر مکیؒ، علی متقی بن حسام الدین، قطب الدین نہر والی مفتی مکہ، قاضی وجیہ الدین گجراتی، عثمان دیلمی، اور علامہ بحرق وغیرہ کا تذکرہ بہت جامع و مفصل ہے، اس میں متذکرہ بالا علماء کے حالات زندگی اور کارہائے حیات کا ایسا اچھا مرقع پیش کیا گیا ہے کہ ان علماء کی سوانح حیات لکھتے وقت النور السافر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے ۔

امراء و سلاطین میں ملک تاتیبای جرکسی، محمد بن برکات والی مکہ، ملک مصر ناصر ابن تاتیبای، محمود بن احمد سلطان گجرات، سلطان مین عامر بن عبدالوہاب، سلیمان اعظم رومی، سلطان سلیم، بایزید عثمانی، امیر مرجان ظافری، ہمایوں بن بابر، مظفر شاہ گجراتی، سلطان محمود شاہ، سلیم شاہ بن شیر شاہ، برہان نظام شاہ سلطان دکن، احمد وغیرہ کے حالات و مآثر اور ملکی خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے، مشائخ و صوفیاء کے تذکرہ میں بھی یہ کتاب اہم مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے، عیدروسی سلسلہ کے بیشتر مشائخ و اولیاء کے حالات اس کتاب میں تفصیل ملتے ہیں، ان میں سراج الدین عمر بن عبداللہ العیدروس، شیخ بن عبداللہ العیدروس، طاہر بن الحسین اہدل، شیخ ابوبکر ابن سالم باعلوی، عبداللہ بن سعد الدین مدنی، عبداللہ ابن الفقیہ، احمد بن علوی، شہاب الدین بن شیخ عبدالرحمٰن باعلوی، شہاب الدین احمد بن علی حلبی، سید عبداللہ علوی ابوبکر العیدروس، حسین بن عبداللہ العیدروس خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

سبب تالیف | النور السافر لکھنے کی غرض و غایت کیا تھی، اسے مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے، "میں نے اس کتاب میں دسویں صدی کے اکابر کے حالات مع تاریخ وفات درج کئے ہیں، اس طرح اس میں علماء، فقہاء، صلحاء، ادباء، شعراء، امراء اور سلاطین کے حالات درج ہو گئے، ان کے ذکر میں کسی ملک و قوم کی تخصیص نہیں ہے، اس کے اندر مصری، شامی، حجازی، یمنی، رومی، ہندی غرض مشرق و مغرب کے ممتاز لوگوں کا تذکرہ ہے، اسی کے ساتھ بعض حوادث، عجائب و غرائب، حکایات و لطائف کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے، میں نے وہی حالات بیان کئے ہیں جن سے واقف ہوں، اس طرح یہ کتاب حدیث، فقہ، تاریخ اور ادب کا بیش بہا خزینہ

بن گئی "		(مقدمہ النور السافر ص ۲)

اسلوب نگارش عیدروسی کا اسلوب نگارش اس عہد کے رنگ سے ہم آہنگ ہے، وہ دور سجع و قوافی کا تھا، اس لئے ان کے یہاں بھی اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، مگر اسکے باوجود تعقید، ابہام یا اشاریت کا وجود نہیں گویا وضاحت اور شگفتگی ان کے طرز تحریر کا طرۂ امتیاز ہے، اس سے ان کے تبحر علمی اور ادبی کمال کا اندازہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ کتاب محض ادبی نہیں بلکہ تاریخ و تراجم اس کا اصل موضوع ہے۔ اسلئے سجع و قوافی کا زیادہ التزام قائم نہ رکھ سکے، البتہ جابجا اس طرز نگارش کے نمونے ملتے ہیں،

مآخذ کتاب النور السافر کو خلعت دوام سے سرفراز کرنیکے لیے علامہ عیدروسی نے بڑی عرق ریزی، دماغ سوزی اور غیر معمولی جانکاہی سے کام لیا ہے، اس کا اندازہ مآخذ کی طویل فہرست سے ہوتا ہے، جن کے نام اور حوالے کتاب کے صفحات پر بے شمار مواقع پر آتے ہیں۔ کسی مآخذ سے مفید مطلب چیز کے حصول کے لئے جو غیر معمولی محنت کرنی پڑتی ہے، وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں، ذیل میں مآخذ کی چند مستند کتابوں کے نام تحریر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ الضوء اللامع :۔ یہ حافظ سخاوی کی شہرہ آفاق کتاب ہے، عیدروسی نے اسکا بار بار حوالہ دیا ہے، اور اس کے طویل اقتباسات نقل کئے ہیں۔

(۲) امام نووی کی شرح مسلم		(۳) امام ترمذی کی الجامع الترمذی،

(۴) امام بخاری کی الجامع الصحیح،		(۵) تفسیر کبیر

(۶) امام واحدی کی البسیط،		(۷) بقاعی کی تاریخ عنوان الزمان،

(۸) علامہ بحرق حضرمی کی مواھب القدوس فی مناقب ابن العیدروس،

(۹) قزوینی کی مشہور کتاب۔ عجائب البلدان (۱۰) قزوینی کی اخبار البلاد
(۱۱) ابن عربی کی فتوحات مکیہ۔ (۱۲) ابن حجر مکی کی معجم شیوخ۔
(۱۳) المقدسی کی شرح حال الاولیاء ومناقب الاصفیاء
(۱۴) ابن الوردی کی خریدۃ العجائب، (۱۵) سبکی کی طبقات الشافعیہ۔
(۱۶) فخر الدین رازی کی مناقب شافعی، (۱۷) صاحب قاموس مجد الدین فیروزآبادی کی کتاب البلغۃ فی تاریخ ائمۃ اللغۃ۔ وغیرہ۔

متذکرہ بالا کتابوں کے حوالوں کے علاوہ لوگوں کی زبانی روایات اور واردین عرب سے بھی بہت کچھ اخذ کیا ہے، اور اس کو نہایت خوبی وخوش اسلوبی کے ساتھ کتاب میں شامل کر دیا ہے، جس سے ان کی مورخانہ بصیرت اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب کی خصوصیات | جیسا کہ متذکرہ بالا سطور میں تحریر کیا گیا کہ صدی وار تذکرے اس سے پہلے بھی بہت سے ترتیب دیئے جا چکے تھے، اور تراجم وطبقات پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں تھیں، لیکن النور السافر میں ایسی خصوصیات ہیں، جن سے آٹھویں اور نویں صدی کے تذکرے الدرر الکامنہ ابن حجرؒ، اور الضوء اللامع حافظ سخاویؒ، خالی نظر آتے ہیں،

النور السافر کے مصنف اگرچہ عرب نسل کے تھے، مگر پیدائشی اعتبار سے ہندی نژاد تھے، اس لئے ان کی یہ کتاب ہندی علماء کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

۱۔ الدرر الکامنہ اور الضوء اللامع دونوں حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہیں، مگر یہ کتاب سن وار واقعات وحوادث پر مشتمل ہے، اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کا تذکرہ دیکھتے وقت بہت سے واقعات وحالات کا پتہ چل جاتا ہے۔

۲۔ متذکرہ بالا دونوں کتابیں اگرچہ بہت ضخیم ہیں، مگر حالات کے بیان میں اختصار سے

کام لیا گیا ہے، جب تک دوسرے تذکروں کا سہارا نہ لیا جائے، واقعات و حالات زیادہ معلوم نہیں ہوتے۔

۳۔ دونوں کتابیں صرف اشخاص کے سوانح اور علماء کے حالات تک محدود ہیں، مگر اس کتاب میں اس صدی کے سیاسی، ادبی تاریخی واقعات بھی سوانح کے پہلو بہ پہلو مل جاتے ہیں۔

۴۔ دونوں کتابوں میں رطب و یابس بہت ہیں، معروف و غیر معروف، قابل تذکرہ ناقابل تذکرہ، علمی غیر علمی لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے، جس سے ضخامت تو بہت ہو گئی، مگر کارآمد و مفید کی تخصیص و تعیین کے لیے غیر معمولی جدوجہد کرنا پڑتی ہے، اور کافی تلاش و جستجو پر گوہر مراد ہاتھ آتا ہے،

۵۔ دسویں صدی کے اشخاص و واقعات دیکھنے کے لئے یہ کتاب بہترین رہبر ہے

۶۔ یہ کتاب اگرچہ دسویں صدی کے آغاز سے اختتام تک صرف ایک صدی کی تاریخ کو محیط ہے، مگر اس کا آغاز تیمناً و تبرکاً سیرت نبوی کے تفصیلی ذکر سے کیا گیا ہے، جس سے مصنف کی پاک باطنی اور ذات رسالت مآب سے غیر معمولی عقیدت کا پتہ چلتا ہے، یہ بات اسے متذکرہ بالا کتابوں سے ممتاز کرتی ہے،

۷۔ بعض واقعات ایسے ہیں، جن سے معاصر تاریخوں کی تردید ہوتی ہے،

اپنا تذکرہ قدیم علماء کا یہ دستور رہا ہے کہ دیگر علماء کی خدمات و کمالات کا جائزہ لیتے ہوئے "تحدیث نعمت" کے طور پر اپنا تذکرہ بھی سپرد قلم کر دیتے ہیں جس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے، کہ آئندہ نسلوں کے لیے ان کا تذکرہ مستند یادگار بن جاتا ہے، پھر اسی کی روشنی میں سوانح نگار اس کے نقوش حیات کو اجاگر

کرتے ہیں، چنانچہ عیدروسی نے بھی سنہ ۹۷۸ھ (سال پیدائش) کے ذیل میں اپنے واقعات زندگی، تصانیف اور تلامذہ پر دس صفحات میں روشنی ڈالی ہے۔

النور السافر کا ذیل النور السافر کا ایک قلمی نسخہ بوہار میں مخطوطہ نمبر ۲۰۳ پر موجود ہے[1] یہ کتاب استاذ محمد رشید آفندی الصفار کی تصحیح و تحقیق کے ساتھ مطبعۃ الفرات بغداد سے سنہ ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء میں ۵۰۰ صفحات پر شائع ہو چکی ہے، اس کا ایک ذیل شلّی متوفی سنہ ۱۰۹۳ھ نے لکھا ہے، جو المشرع الروی کے نام سے مشہور ہے،[2] یہ ذیل ہماری نظر سے نہیں گزر سکا،

النور السافر کے قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں بھی النور السافر کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آزاد لائبریری کے حبیب گنج کلکشن میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جو خط نسخ میں سنہ ۱۰۹۳ھ کا لکھا ہوا ہے[3] مولانا عبد العزیز میمن کی روایت کے مطابق اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ فرنگی محل میں موجود ہے،[4] ان دو گرانقدر نسخوں کے علاوہ اس کے دو نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہیں، ایک سنہ ۱۲۹۳ھ کا لکھا ہوا، اور ایک سنہ ۱۳۰۰ھ کا لکھا ہوا۔[5]

---

[1] بوہار ۲/۳۰۴ [2] تاریخ ادبیات عربی ۲/۲۸۸ [3] حبیب گنج کے تاریخی نوادر معارف جون سنہ ۳۲ء صفحہ ۴۶۴۔ [4] فہرست آصفیہ جلد سوم صفحہ ۱۸۰ و جلد اول صفحہ ۲۳۴۔

آسٹریلیا میں اسلام اور مسلمان

کچھ نئے معلومات

از

جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی

مئی ۹۵ء کے معارف میں "آسٹریلیا میں اسلام اور مسلمان" کے عنوان سے عربی رسالہ "الدعوۃ" سے ایک مضمون کی تلخیص شائع ہوئی ہے، امسال مارچ میں مجھے آسٹریلیا کے شہر میلبورن میں پچیس ۲۵ دن قیام کا موقع ملا، اس دوران میں وہاں کے مسلمانوں کے بارے میں جو باتیں معلوم ہوئیں وہ قارئین معارف کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں،

آسٹریلیا جغرافیائی اعتبار سے دنیا کے قدیم ترین علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے اس کی عمر صرف ۲۰۰ سال ہے جب کہ کپتان کوک کے ساتھ یورپی قومیں یہاں آکر آباد ہوئیں، اُن سے پہلے یہاں کی اصلی آبادی پرانے باشندوں کی تھی، جو اب برائے نام بعض جنگلوں اور پہاڑوں میں رہ گئے ہیں،

آسٹریلیا کے علاقہ وکٹوریا میں میلبورن بڑا شہر ہے، رقبے کے لحاظ سے تو یہ لندن سے بھی وسیع تر ہے، مگر آبادی کل ۲۰ لاکھ ہے، یہاں کے اکثر حصوں کے زیادہ تر مکانات ایک یا دو منزل کے ہیں، جن کے سامنے خوبصورت پھولوں اور سرسبز جھاڑیوں کا باغیچہ ہوتا ہے البتہ وسط شہر میں دفتروں کی سر بفلک عمارتیں دکھائی دیتی ہیں، سڑکیں بہت کشادہ ہیں، دونوں

جانب سایہ دار درخت قرینے سے لگے ہوئے ہیں، اور میلوں تک سیدھی چلی گئی ہیں، شہر سے باہر بعض سڑکوں پر نوّے کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے کم پر موٹر چلانا جرم میں داخل ہے، لوگوں کے لباس، مکانوں کی آرائش، دکانوں کی سج دھج اور موٹر گاڑیوں وغیرہ کو دیکھ کر یہ آسانی اندازہ لگ جاتا ہو کہ یہاں دولت کی فراوانی ہے، غربت اور افلاس کا نام نہیں، مزدوروں کی اُجرتیں بہت زیادہ ہیں، اس لئے گھر کے سارے کام کاج صفائی سے لے کر رنگ کرنے تک لوگ خود ہی کر لیتے ہیں، کارخانوں میں کام کرنے کی خاطر ان بیرونی ممالک سے مزدور بلائے جاتے ہیں، جہاں کم اجرت پر لوگ تیار ہو جاتے ہیں، میلبورن میں یونان اور ترکی کے مزدوروں کی بہت بڑی تعداد ہے،

معارف کے مذکورہ مضمون میں وکٹوریا کے مسلمانوں کی تعداد پچاس۵۰ ہزار بتائی گئی ہے لیکن مجھے معلوم ہوا کہ صرف میلبورن میں پچاس۵۰ سے ساٹھ ہزار ترک آباد ہیں، اس لحاظ سے پورے وکٹوریا میں مجموعی مسلم آبادی پچاس ہزار سے کہیں زیادہ ہوگی،

میلبورن کے مختلف حصوں میں کل تین مسجدیں ہیں، ایک مسجد برنٹین میں ہے، جو ترکی مسجد کہلاتی ہے، یہ چند سال قبل بنی ہے، اس کی تعمیر جدید طرز پر ہوئی جس میں نہ گنبد ہے نہ مینارہ یورپ کے پرانے قلعہ نما محلوں میں گول ٹاور ہوا کرتا تھا، اسی قسم کا ٹاور اس مسجد میں ایک جانب کو بنا ہوا ہے جہاں سے اذان کی آواز لاوڈ اسپیکر کے ذریعہ نشر ہوتی ہے، نماز کے بڑے ہال میں تقریباً سات آٹھ سو مصلیوں کی گنجائش رکھی گئی ہے، فرش پر دبیز قالین ہے جس پر صف کی درستگی کے لئے لکیریں بنی ہیں جس جمعہ کو میں وہاں شریک ہوا، اس روز ستر مصلی تھے جن میں پانچ چھ ہندوستانی، پاکستانی، اور باقی ترک، البانی، یوگوسلاوی وغیرہ تھے، ہال کے پچھلے حصے میں گیلری بنی ہے جس میں عورتیں جماعت میں شریک ہوتی ہیں لیکن اُن کی تعداد بہت کم دکھائی دی،

یہ خواتین برقع کے بجائے قدیم ترکی وضع کے لباس میں تھیں جس میں چہرہ اور دونوں ہاتھ کھلے رہتے ہیں، مسجد سے متصل بڑی سی کھلی پختہ جگہ موٹروں کے پارک کرنے کے لئے رکھی گئی ہے، غالباً عید بقر عید کے موقعوں پر یہ زمین اور مسجد کے دوسرے بڑے بڑے کمرے مصلیوں کی کثیر تعداد کے مصرف میں آتے ہونگے، باقی دنوں میں یہ کمرے کلاس کے طور پر استعمال ہوتے ہیں طلبہ کے لئے جدید ڈیزائن کے ڈسک اور بنچ ہیں، اتوار اور چھٹیوں کے دنوں میں خاص طور سے قرآن مجید اور دینیات وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے، ترکی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے تاکہ بچے اپنے گھر کے ماحول سے بیگانہ نہ ہو جائیں،

مُصلّیوں میں بوڑھے بھی دکھائی دیئے، اور جوان بھی، بچہ ایک بھی نہ تھا کیونکہ اس وقت وہ سب اسکول گئے ہوئے تھے معلوم ہوا کہ عام مسجدوں میں جو رونق جمعہ کو ہوا کرتی ہے، وہ یہاں اتوار کو دکھائی دیتی ہے،

دوسری مسجد جو میری قیام گاہ سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھی، البانی مسجد کہلاتی ہے، یہ بہت چھوٹی ہے جس میں مشکل سے ستر اسی مصلّی سما سکتے ہیں، میں یہاں دو جمعہ پڑھ سکا، دونوں بار نمازیوں کی تعداد ۳۰ سے ۳۵ تک رہی، ان میں ایشیائی قوم کے تین چار افراد تھے باقی یوگوسلاوی یا البانی وغیرہ تھے مسجد کے دروازے پر البانی رسم خط میں (غالباً) مسجد کا نام لکھا ہے،

دونوں مسجدوں میں صاف ستھرے طہارت خانے اور وضو خانے بنے ہیں، امام پہلے عربی میں خطبہ دیتا ہے، پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں سناتا ہے، خطبہ زبانی اور ہر مرتبہ نیا ہوتا ہے جس میں اللہ اور رسول کے احکام کی وضاحت اور تشریح ہوتی ہے، البانی مسجد کے امام ایک مصری نوجوان ہیں جو شہر میں اپنے مشاغل رکھتے ہیں، اور امامت کی خدمت اعزازی طور پر انجام دیتے ہیں، سلام پھیرنے کے بعد مصلی اپنے دائیں بائیں نمازیوں سے مصافحہ کرتے ہیں، مصر میں بھی یہ رواج ہے،

بورن کے علاوہ دوسرے شہروں اور علاقوں میں بھی مسجدیں موجود ہیں تاسمانیا کے مقام پر نئے امام آئے ہیں، جو بمبئی کے پروفیسر احمد بہاء الدین داور کے داماد اور جبر ان سے صرف فون پر باتیں ہو سکیں، اگر ان کی دعوت قبول کر سکتا تو اس علاقے کی حاصل ہو جاتیں،

رے قیام کے زمانہ میں ایک خبر نمایاں طور پر چھپی تھی، کہ میلبورن شہر میں ایک بہت بڑے رز کی تعمیر کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے، جس پر پانچ ملین ڈالر (تقریباً چار کروڑ روپیے ے گی، اس مرکز میں درسگاہ، کتب خانہ اور معلوماتی مرکز کے علاوہ جمعہ اور عیدین کی نماز م، صحیح ذبیحہ گوشت کی سپلائی اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کی فراہمی اور قربانی کرنے ل انتظام بھی ہوگا، بعض مسلم حکومتوں نے بڑی بڑی رقموں سے اس منصوبے کی اعانت ہ کیا ہے، اس سے آسٹریلیا کی ایک اہم ضرورت کچھ حد تک پوری ہو جائے گی،

سڈنی شہر میں مسلمانوں کی انجمن کی طرف سے ایک مختصر سا رسالہ سائیکلو اسٹائل ہو کر شائع ہوتا ہے ، اسلامی تقریبات "چاند کی تاریخیں اور ان کے علاوہ قرآن مجید، حدیث، سیرۃ رسول لی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ صحابہ سے متعلق کچھ چھوٹی چھوٹی تحریریں بھی ہوتی ہیں، کچھ سوال ب کی صورت میں دینی معلومات ہوتی ہیں، مثلاً ایمان کیا ہے؟ آخرت کیا ہے؟ رسول ائے ہیں وغیرہ،

آسٹریلیا کا معاشرہ مغربی ممالک کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، اس لئے یہاں بھی مسلمان روں کو وہی مسائل درپیش ہوتے ہیں، جو یورپ یا امریکہ میں ہوتے ہیں، ان میں جمعہ کی نماز کا سب سے اہم ہو جاتا ہے، جمعہ کو بچے اسکولوں میں ہوتے ہیں، اور بڑے دفتروں اور کارخانوں میں ول ہوتے ہیں، ہر علاقے میں مسجد نہیں، جہاں لنچ کے اوقات میں یہ لوگ بعجلت جماعت میں شریک

ہوکر پھر اپنے اپنے کاموں پر پہنچ جائیں بچے کلاسوں میں جاکر بیٹھ جائیں، ایسے مقامات بھی خال خال ہوں گے، جہاں مسجد نہ ہوتے ہوئے مسلمان اتنی تعداد میں اکٹھے ہوسکیں کہ کسی مقام پر جماعت سے نماز ادا کرلیں، ایسی ہی دقت بچوں کی دینی تعلیم کے معاملے میں بھی محسوس ہوتی ہے، نہ مدرسے ہیں نہ ایسی معقول کتابیں ہیں جو مختلف عمر کے بچوں کے لئے ان کی نفسیات اور دوسرے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہوں، اور جو طباعت کے معیار سے بھی اُن کی دوسری کتابوں سے کم تر نہ ہوں، اگر ان مسائل کے حل جلد نہ تلاش کئے گئے، تو ڈر ہے کہ کہیں مغربی ملکوں کے مسلمان اتوار ہی کو جمعہ نہ منانے لگیں۔

میلبورن یونیورسٹی میں مڈل ایسٹرن اسٹڈیز کا ایک شعبہ ہے جس میں سندھ کے ڈاکٹر قاضی عبدالخالق پروفیسر ہیں، اور ڈاکٹر فریزر صدر، اس شعبے میں عربی اور اسلامیات کے کورس پڑھائے جاتے ہیں، میں وہاں "اسلام۔ انسانیت کے لئے ہدایت ہے" کے عنوان سے تقریر کرنے گیا تو حاضرین میں اساتذہ کے علاوہ بیس پچیس طلبہ اور طالبات کو موجود پایا، ان میں مصر سے آئی ہوئی ایک لڑکی (شہیر) اور ایک یوگوسلاوی نوجوان (عبداللہ) بھی تھا، یہ دونوں پوسٹ گریجویٹ اسٹوڈنٹ تھے، اس شعبے میں عربی کی تعلیم کی مقبولیت بڑھتی جارہی ہے، بالخصوص مسلمان طلبہ اس کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں، غالباً آسٹریلیا کی نیشنل یونیورسٹی میں بھی ایک اسی قسم کا شعبہ قائم ہے، جو خاصا بڑا ہے،

ان دنوں مغربی تہذیب جس بحران کا شکار ہو رہی ہے، اسے دیکھتے ہوئے اقبال کی پیشینگوئی کی صداقت ثابت ہوتی ہے، یورپ کو مخاطب کرکے شاعرِ مشرق نے کتنا سچ کہا تھا،

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

یورپ اور امریکہ میں دولت کی فراوانی، مشینی زندگی کے سبب تن آسانی اسائش

ٹکنالوجی کے عروج اور تسخیرِ فطرت کے باوجود وہاں کا انسان کرب بے چینی میں سرگرداں نظر آتا ہے، فرار کی راہ تلاش کرنے میں وہ کبھی گانجا، چرس، حشیش اور دوسرے منشیات میں ڈوب کر اک گونہ بے خودی چاہتا ہے، یا جنسی کج روی میں مبتلا ہوکر تہذیب واخلاق کی ساری قدروں سے بالکل بے نیاز ہوکر اپنی عافیت ڈھونڈتا ہے، کچھ لوگ اپنے درد کا مداوا نئے نئے روحانی تجربوں میں تلاش کرنے لگے ہیں، اس جستجو میں وہ کبھی آنند مارگ اور کبھی کرشن بھگتی کی طرف مائل ہوتے ہیں، کبھی بدھ مت یا چین فلسفہ کی جانب رُخ کرتے ہیں، جہاں کہیں بھی کوئی نئی، چونکا دینے والی آواز اٹھتی ہے، یہ لوگ اس سمت دوڑ پڑتے ہیں، مگر اس جستجو اور تگ ودو میں تلاشِ حق مقصود نہیں ہوتی، بلکہ انھیں ایسا آسان نسخہ حاصل کرنا مطلوب ہوتا ہے، جو فوراً اثر پذیر ہو، اور جس سے اُن کے اضطراب میں قرار آجائے، مایوسی، آس میں بدل جائے، زندگی بامعنی اور بامقصد ہوجائے، اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے ہندوستانی معالج سرطیہ علاج کے دعوی کے ساتھ اپنے اپنے نسخے لے کر ان ملکوں میں پہنچے ہیں، اور اچھی خاصی تجارت شروع کردی ہے، ان معالجوں میں یوگا سکھانے والے بھی کئی مرکز کھول چکے ہیں، اور خاصے مقبول ہیں، اُن کے اشتہار ٹی۔ وی، ریڈیو، اخباروں اور رسالوں میں دکھائی دیتے ہیں، مغرب میں چونکہ ہندوستان کی قدیم سرزمین پُر اسرار علوں کی سرزمین مانی جاتی ہے، اس لئے لوگ بڑی بڑی فیس ادا کرکے یوگا سیکھنے جاتے ہیں،

عموماً جسمانی ورزش میں اعضاء اور نفس کا مختلف آسنوں کے ذریعے کنٹرول کرنا یوگا مانا جاتا ہے، اس کے ساتھ ہندو فلسفۂ زندگی اور روح کے تصور کو بھی دخل ہوتا ہے، مگر ان تجارتی قسم کے اداروں سے قطع نظر جو جلبِ منفعت کی خاطر قائم کئے گئے ہیں، میلبورن میں ایک ایسا ادارہ گذشتہ پندرہ سال سے قائم ہے، جو یوگا کو مذہب سے علاحدہ کرکے سائنس

سکی حیثیت سے پیش کرتا ہے، اس کے طریقۂ کار میں مراقبہ نفس کشی، قوت ارادی کی افزائش، اور خدمت گذاری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، اسی ادارے کی طرف سے مجھے آسٹریلیا کی دعوت موصول ہوئی تھی، میرے ذمے زیر تربیت مرد اور عورتوں کی جماعتوں کو سوال و جواب یا مختصر بات چیت کے ذریعے، اخلاق کردار اور معاملات کی باتیں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بتانے کا کام تھا، اس مقصد کے لئے انھیں اسلام کے اصول کے علاوہ سیرۃ رسول اللہ، صحابہ کرام، اور بزرگان دین کی زندگی سے ایسے حالات سناتا جو عمل صالح کے قریب لاسکیں، یہ عورتیں اور مرد جن کی عمریں تیس اور چالیس کے درمیان تھیں، جو ذہنی تناؤ، احساس گناہ، مستقبل کی طرف سے خوف اور مایوسی کی شکار ہوکر اب ان سے نجات پانا چاہتے تھے، میری باتیں بڑے غور سے سنتے، اور اثر قبول کرتے جب ان کے سامنے اسلامی تاریخ سے اعلیٰ اخلاق، اور بلند کردار، نفس کے خلاف مجاہد کی مثالیں پیش کی جاتیں، تو ان کے چہروں پر امید کی جھلک آجاتی، اور وہ مایوسی سے نکل کر یقین کی طرف جاتے ہوئے لگتے، انھیں شروع میں تصوف اور صوفیوں کے بارے میں جاننے کا بڑا شوق تھا کیونکہ وہ غالباً یہ سمجھتے تھے کہ یہ وہ راستہ ہے جس کے ذریعہ صرف وظیفہ اور ذکر کے ذریعے روحانیت کے اعلیٰ درجات حاصل ہو سکتے ہیں، میری جماعتوں میں بعض ایسے آسٹریلین بھی ملے جنھوں نے اسلام کا اچھا خاصا مطالعہ کیا تھا، انھوں نے مجھ سے بعض ایسی کتابوں کی نشان دہی چاہی جو انھیں مزید معلومات بہم پہنچا سکیں،

اس ادارے میں تربیت کے ایک ذریعہ خدمت گذاری کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس پہلو نے مجھے کافی متاثر کیا، ہر ممبر کو مختلف قسم کی خدمت سپرد کی جاتی ہے، اور روزمرہ کی زندگی میں بھی اسے داخل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے، اس انداز عمل میں حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کی تحریک کی وہ جھلک دکھائی دی جسے اکرام مسلم کا نام دیا گیا ہے، اور جس کے تحت آج بھی

تبلیغی جماعت کے ارکان دوروں پر نکلتے ہیں، تو خدمت کرنے کی خاطر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں، یوں تو آسٹریلیا بلکہ تمام مغربی ممالک میں اپنا کام خود کرنا خود معمولی ہو یا بڑا، ایک عام بات ہے لیکن اس ادارے میں اس کا اطلاق اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں پر کیا جاتا ہے، میری جو مہمان نوازی ہوئی اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ ہر روز میری خدمت پر ایک ممبر نامزد کر دیا جاتا، یہ ممبر کبھی کوئی انجینیر ہوتا کبھی کوئی وکیل اور کوئی لیکچرر وغیرہ' وہ مجھے ناشتہ اور کھانے کے لئے وقت پر اکرلے جاتے، (حالانکہ ڈائننگ ہال صرف ایک منزل نیچے تھا) میرا بستر درست کرتا حتی کہ میری بنیائن یا قمیص دھو کر لاتا، اور جوتوں پر پالش بھی کر دیتا، ایک روز میرے ایک رفیق نے (جو علم نفسیات کے ایم۔ اے تھے) تجویز پیش کی کہ ہم ایک پارک کی سیر کو جائیں، پیروں کی تکلیف کے سبب میں زیادہ چلنے سے معذور تھا، اس کا کا خیال رکھتے ہوئے انھوں نے پہیوں والی ایک کرسی موڑ کر موٹر میں رکھ لی، اور پارک پہنچ کر مجھ کو اصرار اس پر بیٹھنے کو کہا، وہ خود اسے ڈھکیل کر مجھے پارک کی سیر کراتے رہے،

یہ لوگ آپس میں روزمرہ بھی ایک دوسرے کی خدمت کرنے پر مستعد رہتے ہیں' ڈائننگ ہال میں کسی کی پلیٹ خالی ہوئی تو دوسرا اسے اٹھالے جائیگا کسی کے لئے چائے لائے گا، ہر شخص اپنا کھانا کچن سے خود لاتا، مگر مجھے میز پر بیٹھا دیکھتے ہی فوراً ہی کوئی ایک اٹھکر میرے لئے پلیٹ میں جو کھانا مجھے چاہئے لے آتا،

میں جب ان لوگوں کو دیکھتا تو دل میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ تربیت کا یہ اثر کس حد تک دیرپا ثابت ہوگا؟ پھر میں نے سوچا کہ اگر پچھلے دس پندرہ سال سے اس ادارے کے ساتھ ارکان اپنے ادارے سے اس حد تک مخلصانہ طور پر وابستہ رہے ہیں، تو یقیناً ان کی قلب ماہیت ہو چکی ہوگی، اور ان کے دل نئے سانچے میں ڈھل چکے ہوں گے،

وفیات

جناب بشیر احمد ڈار مرحوم

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

۲۹ مارچ ۱۹۷۹ء کو پاکستان کے ممتاز، لائق اور مشہور اہلِ قلم جناب بشیر احمد ڈار اللہ کو پیارے ہوئے، ان کی وفات کی خبر دیر سے ملی، دکھ ہوا، کہ پاکستان ایک بہت اچھے مصنف، بہت اچھے فلسفی اور بہت اچھے انسان سے محروم ہوگیا۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۶ء تک پاکستان بار بار جانے کا اتفاق ہوا، تو جناب بشیر احمد ڈار سے کراچی، اسلام آباد اور لاہور میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، پہلی بار جناب سید حسام الدین راشدی کے دولت کدہ پر ملا، جو کراچی کے ارباب علم و دانش کا صنم خانہ بنا ہوا ہے، معارف کے صفحات پر جناب سید حسام الدین راشدی کا ذکر خیر اکثر آیا ہے، میری نظر میں وہ پاکستان کے پرنس اسکالر ہیں، ان گنت کتابوں کے مایۂ ناز مصنف ہیں، اللہ تعالیٰ نے دولت بھی دی ہے، اس لئے علم دوست اور علم نواز بن کر اپنی مرصع کوٹھی پر علمی محفلیں بھی سجاتے رہتے ہیں، جن میں شریک ہوکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جہانگیر کے دور میں سندھ میں غازی خان ترخان کے یہاں بھی ایسی ہی پرکیف مجلسیں ہوا کرتی ہوں گی، ان محفلوں میں جناب

بشیر احمد ڈار کا ہونا لازمی تھا۔ جو کراچی میں راشدی صاحب کی زندگی کے جزو لاینفک بنے رہے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا جب دونوں کی ملاقاتیں نہ ہوتیں، دونوں کی ملاقاتوں میں پروفیسر شیخ عبدالرشید بھی (سابق استاد تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) ضرور شریک ہوتے، پھر یہ تینوں حضرات علم وفن کے تھری مسکیٹیرز بن جاتے۔ کئی بار مجھ کو بھی ان کی دلچسپ صحبت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، راشدی صاحب کی ہر بات کا برجستہ جواب دینے کے لئے پروفیسر شیخ عبدالرشید تیار رہتے، دونوں کی علمی پھلجھڑیوں اور پٹاخوں سے جناب بشیر احمد ڈار محظوظ تو ہوتے، مگر زیادہ تر خاموش ہی رہتے، ان دونوں کی باتوں کی داد صرف اپنی خوشگوار ہنسی کی پریم بتیسی کھول کر دیتے، اور جب بولتے تو سونا پگھلاتے ہی نظر آتے۔ اہل علم کی کچھ قسمیں ایسی ہیں جن کے اندر علم وفن کا خزانہ بھرا رہتا ہے، مگر ان کو دبا کر رکھنے ہی میں اپنی بلندی تصور کرتے ہیں۔ بشیر احمد ڈار صاحب کے ساغر میں علم وفن کی مے بھری رہتی، مگر اس کو ہر جگہ چھلکتے ہوئے دیکھنا پسند نہ کرتے، وہ دوسروں کی گفتگو دن سے لطف لیتے، مگر خودشناسی سے بے نیاز ہو کر اپنی علمی خودی کی بے خودی سے دب کر خاموش بیٹھے ہی رہنا پسند کرتے۔

وہ نسلاً کشمیری تھے، مگر ان کا خاندان لاہور میں آباد ہو گیا تھا، یہیں وہ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے، پہلی دفعہ ان سے ملاقات ہوئی تو چھڑی ٹیک کر کچھ لنگ کھاتے ہوئے چلتے دیکھا، معلوم ہوا کہ بچپن میں اپنے مکان کی چھت پر پتنگ اڑا رہے تھے، اس پر سے گرے تو ایک ٹانگ اس طرح مجروح ہوئی کہ اس کو قطع ہی کر دینا پڑا۔ گھر کے لوگ ان کی زندگی کے اچھے مستقبل سے زیادہ پُر امید نہیں تھے، مگر انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم۔ اے۔ کیا، پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آکر بی۔ ٹی۔ کی

ڈگری حاصل کی، لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے اسکولوں میں ملازمت کر کے ایک شفیق اور لائق استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے، یہاں کے قیام میں ان کو اقبالیات سے بڑی دلچسپی ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں ان کی کتاب انگریزی میں "اے اسٹڈی ان اقبالس فلوسفی" کے نام سے شایع ہوئی، اس میں ان کا یہ مطمح نظر تھا کہ اسلام ہندوستان میں آیا تو یہاں اس کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیمات اصلی طور پر عمل میں نہیں آئیں، کچھ مصلحون اور صوفیوں نے وحدت الوجود کے ذریعہ سے ہندو مذہب اور اسلام کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، اکبر نے دین الٰہی قائم کر کے مذہب کو حکومت کی سرپرستی میں لیا، تو یہ پہلی اور آخری سعی ہو کر رہ گئی، دارا شکوہ کی وجہ سے اس ملک کی ایک بڑی آبادی اخلاقی اور ذہنی فالج میں خطرناک حد تک مبتلا ہونے والی تھی، مگر اس کے خاتمہ سے اس قسم کی تحریک ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی، ایسی تحریکوں کے خلاف حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی تحریکیں چلائیں ۱۸۵۷ء کے بعد........ مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کو دور کرنے کی کوشش برابر جاری رہی اس بار کو اقبال نے بھی اپنے کاندھوں پر اٹھایا جو موجودہ دور کی مادی ترقی سے بددل تھے، ان کو خیال ہوا کہ اگر قرآن مجید کی تعلیمات پر صحیح طور سے عمل کیا جائے، تو نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کو حیاتِ نو مل جائیگی، اور جب یہی بات ان کی جادو بھری شاعری کے ذریعہ سے مسلمانوں کے کانوں تک پہونچی تو ان کو احساس ہوا کہ زندگی کے تخیلات کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں از سر نو ترتیب دیا جا سکتا ہے، ۱۹۴۴ء سے پہلے بھی یہ باتیں کہی گئی تھیں، مگر بشیر احمد ڈار صاحب نے ان کو کچھ ایسے طاقتور اور موثر انداز میں اپنی اس کتاب میں پیش کیا کہ ممتاز ارباب علم کی نظر ان کی طرف اٹھی، انھوں نے اس کو مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے نام سے معنون کیا جس سے ظاہر ہے کہ وہ ان سے بھی متاثر تھے،

اس کتاب کی اشاعت کے بعد وہ مجلۂ اقبال کے نائب مدیر بنائے گئے، جس کے مدیر س وقت اس برصغیر کے مشہور فلسفی ایم۔ ایم۔ شریف صاحب تھے، پھر وہ اقبال اکیڈمی کے ائرکٹر کے عہدہ پر مامور ہوئے، جو ان کی علمی قابلیت کا بہت بڑا اعتراف تھا، وہ اس عہدہ پر ا انتقال ۱۹۷۹ء تک رہے، وہ پاکستان کے فلاسفیکل جرنل کے مینجنگ اڈیٹر بھی آخر وقت ک تھے، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور کے ترجمان ثقافت کے ادارہ تحریر کے بھی رکن رہے۔

۱۹۷۶ء میں کراچی میں ان سے ملنے ان کے گھر گیا تو انھوں نے اپنی دو کتابیں "اقبال ینڈ پوسٹ کانٹین وولنٹرزم" اور "ریلیجس تھاٹ آف سید احمد خان"، نذر کیں، جن کو بار بار پڑھنے کا اتفاق ہوا، اول الذکر کتاب بزم اقبال کی طرف سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی، پانچ سو چھیالیس صفحے پر مشتمل ہے، اس کی انگریزی تحریر میں جو روانی، سنجیدگی اور وقار ہے، اس کو پڑھ کر یہ اثر ہوتا ہے کہ یہ لاہور کے کسی کالج کے فارغ التحصیل کے بجائے انگلستان کی کسی بلند پایہ یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریوں کے پانے والے نے لکھی ہے، اس کے لائق مصنف نے کانٹ کے فلسفۂ استدلال اور قوت ارادی، نطشے کی فکر خود آگاہی، شوپنہار کے تخیل فکر، اور تقلبی معلومات، ملٹن کے نظریہ شیطنت، برگسان کے تخیل عشق، گیٹے کی روشن خیالی، جیمس وارڈ کے فلسفہ پر سائنٹفک اثرات، عقلیت اور میکانزم کے خلاف میک ڈوگل کے خیالات، ولیم جیمس کے نظریۂ عملیت اور اس کے چارٹزم، براؤننگ کی نیچر نوازی اور برنارڈ شا کی قوت ارادی پر جس طرح بحث کی ہے، اس پر ایک انگریز فلسفی کو بھی رشک آسکتا ہے، یورپ کے ان فلسفیوں کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اقبال کے سامنے ان مغربی مفکروں کے خیالات ضرور رہے، مگر ان کے ان ہی افکار کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوئے جو قرآن مجید اور

گذشتہ اسلامی مفکرین کی تعلیمات کے مطابق تھیں،

جناب بشیر احمد ڈار اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ اقبال کی فکری اور نظری تنظیم ملے جلے اجزا سے بنی جن کے کچھ حصے کبھی ایک اور کبھی دوسرے مغربی مفکرین سے مستعار لیے گئے، ان کی فلسفیانہ موشگافیاں بظاہر مغربی مفکرین کی معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ دراصل وہی ہیں جو اسلام کے بنیادی عقاید پر مبنی مسلمان مفکروں کے یہاں بھی گذشتہ دور میں پائی گئی ہیں، اقبال کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے موجودہ دور کے علم وفضل کی ترقی سے فائدہ اٹھا کر ان کو جدید منطقیانہ رنگ اور سریع الفہم انداز میں ترتیب دیدیا ہے، بشیر احمد ڈار صاحب نے اپنی اس کتاب میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ذہن جب قدامت پسندی اور ترقی پسندی کے جھولے میں جھول رہا تھا، تو اقبال نے ان دونوں کے اچھے پہلوؤں کو ملا کر اپنے افکار کے عناصر مرتب کئے، جن کا سرچشمہ سراسر قرآن مجید ہی رہا، جس طرح ابن تیمیہ نے قرآن پاک کی تعلیمات سے اسلام کو ایک نئی زندگی عطا کی، اسیطرح اقبال کا یہ پیام ہے،

چون کہن گردد جہانے در برش می دہد قرآنش جہانے دیگرش

بشیر احمد ڈار صاحب نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید ان لوگوں سے بھی ہوگی، جو اقبال کا گہرا مطالعہ کریں گے، ڈار صاحب نے جس فلسفیانہ اور فاضلانہ انداز میں اس کی وضاحت کی ہے، اس سے لوگ آئندہ بھی برابر مستفید ہوتے رہیں گے، خود انھوں نے قرآن مجید کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے انگریزی میں قرآنی اخلاقیات کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی، وہ اس کے بھی قائل تھے، کہ اقبال کا نظریۂ ارتقار قرآن مجید کی تعلیمات ہی پر مبنی ہے، گو انھوں نے ابن مسکویہ مولانا روم اور شاہ ولی اللہ کے افکار سے بھی

[illegible] انھوں نے زندگی

[illegible] زبانیں بھی

[illegible]

[illegible]

[illegible] اصل اور حقیقی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] مقابلہ کرتا تھا، اس کے ساتھ وہ زبانی طور پر اپنے

[illegible] مگر اپنی زبان [illegible]

...سے اس کتاب

...نئی تہذیب کی فضا میں جیتا

...ان کے خیالات میں ہمکر

...کی وجہ سے مذہب

...یا جو وہ ان سے ساتھ

...پیدا ہو رہے

پہنچایا گیا تھا، اس کو بھی کر ایک

...طوال ہو کر مولانا ابوالکلام آزاد نے

...سب کچھ ہے، جو سید احمد خان نے پیش

...خیالات کے باوجود قرآن مجید کے بعض نکات کے اور

...جا سکتے ہیں۔

...اپنی اس کتاب میں دراصل جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اس کرب
اضطراب کے ترجمان بن گئے ہیں، جو ماڈرنزم تو چاہتے ہیں، مگر اپنے مذہبی عقائد
سمجھ کر ماڈرنزم میں اپنی ذہنی پریشانیوں کا حل نہیں پاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ
وہ اپنے مذہبی عقائد کا ساتھ ماڈرنزم ساتھ کس طرح دیں، کیا ہر جگہ اور ہر زمانہ میں

مددلی ہے، ان کا یہ تصور ڈارون اور برگسان کے نظریے سے بالکل مختلف ہے، انھوں نے اس خیال پر پورا زور اپنے خطبۂ صدارت میں دیا جو انھوں نے اپریل ۱۹۶۰ء میں پاکستان فلاسفیکل کانگریس کے اجلاس میں پڑھا۔

ان کو اقبالیات سے کچھ ایسا لگاؤ تھا کہ انھوں نے اقبال کی مثنوی گلشن راز جدید، بندگی نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق اور قوم کے نوجوانوں کو پیغام کے انگریزی ترجمے بھی کئے، اور ان میں سے بعض پر حواشی بھی لکھے، اقبال کے انگریزی اور اردو خطوط کے مجموعے بھی مرتب کئے۔

اقبالیات کے چمن میں نرگس اپنی بے نوری پر نہیں روئے گی، جہاں اس میں اور دیدہ ور پیدا ہوئے، وہاں بشیر احمد ڈار صاحب نے اپنی دیدہ وری سے اقبال کا جو اصلی اور حقیقی مقام متعین کیا ہے، وہ اقبالیات کی تاریخ میں برابر یاد کیا جائے گا۔

ان کی تصنیف "ریلیجس تھاٹ اف سید احمد خان" پر یہ راقم جنوری ۱۹۶۰ء کے معارف میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہے، یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے ذریعہ کو انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستانی مسلمان اپنے حکمران انگریزوں اور اپنے ہموطن ہندوؤں کے ساتھ رہ کر جن ذہنی، تمدنی اور مذہبی آزمایش میں مبتلا ہوئے، اس کا اس میں اچھا تجزیہ ہے، عیسائی مبلغینِ اسلام پر طرح طرح سے حملے کر رہے تھے، جن سے مسلمانوں میں احساسِ کمتری پیدا ہو رہا تھا، پھر ہندوؤں نے انگریزی تعلیم پا کر بدلے ہوئے حالات میں ہر قسم کے اقتصادی فوائد حاصل کر کے اپنے مذہب میں بھی اصلاحات شروع کر دی تھیں، مسلمانوں کو دونوں سے مقابلہ کرنا تھا، اسی کے ساتھ وہ ذہنی طور پر اپنے سوئی بھی بھر بیکار تھے، وہ ماڈرنزم سے بھی متاثر ہو رہے تھے، مگر اپنی مذہبی روایات کی ...

ہونا نہیں چاہتے تھے، وہ اپنے مذہب کی فرمانروائی کے خواہاں بھی تھے، اسی کے ساتھ ان کو سائنس، فلسفہ اور عقلیاتی علوم سے اپنے مذہبی عقائد کی تطبیق کی جستجو بھی تھی، وہ اپنے قدیم خیالات کے علماء کو نظر انداز کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، لیکن ان کی ہر بات کو تسلیم کرکے اپنے تمام مسائل کا حل بھی نہیں پاتے تھے، وہ تجدد پسند مصلحین کے مغربی افکار کی باتوں کو بھی شوق سے سنتے، مگر غیر شعوری طور پر ڈرتے بھی رہتے کہ کہیں ان کی باتوں کو قبول کرکے اپنی مذہبی روایات سے دور نہ ہوجائیں، اس ذہنی آویزش کی فضا میں سید احمد خاں کی تحریک چلی تو ایک بڑا طبقہ ان کی طرف جھک گیا، جن کے خیالات میں اس کو بہت کچھ ذہنی سکون ملا، سید احمد خاں نے اسلامی تعلیمات کی جو جدت مندانہ تعبیریں کیں، ان کا جائزہ بشیر احمد ڈار صاحب نے اپنی اس کتاب میں لیا ہے، وہ ان سے متاثر ہوکر لکھتے ہیں کہ اب جب مغربی تمدن کی وجہ سے مادی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سید احمد خاں نے جو اسلام پیش کیا تھا، اس کو سمجھ کر ایک موثر ذریعہ بنانے کی ضرورت ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن کے نام سے جو تفسیر لکھی ہے، اس میں وہی سب کچھ ہے، جو سید احمد خاں نے پیش کیا تھا، بلکہ اقبال اپنے فلسفیانہ خیالات کے باوجود قرآن مجید کے بعض نکات کے ادراک میں سید احمد خاں سے آگے نہیں جا سکے ہیں،

ڈار صاحب اپنی اس کتاب میں دراصل جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اس کرب اور اضطراب کے ترجمان بن گئے ہیں، جو ماڈرنزم تو چاہتے ہیں، مگر اپنے مذہبی عقائد سے ہٹ کر ماڈرنزم میں اپنی ذہنی پریشانیوں کا حل نہیں پاتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کا ساتھ ماڈرنزم میں ساتھ کس طرح دیں، کیا ہر جگہ اور ہر زمانہ

سید احمد خان پیدا ہونے کی ضرورت ہے، مگر ایسے سید احمد خان کی بھی ضرورت نہیں جن کے خلاف قدیم خیالات کے علماء کی جماعت کھڑی ہو جائے، پھر ایسے علماء اگر واقعی اسلام کے نگہبان اور پشتیبان ہیں تو ان کو ایسے سید احمد خان کو گوارا کر لینے میں تامل نہ ہونا چاہئے، جو اپنے خاص اسلامی جذبہ سے اسلام کو ماڈرنزم اور ماڈرنزم کو اسلام سے ہم آہنگ کر دے، اسلام ایک دائمی اور عالمگیر مذہب ہے، ہر زمانہ، ہر ماحول اور ہر ملک کے لئے ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر سمجھ کر منکلمانہ اور مخلصانہ انداز میں پیش کیا جائے،

بشیر احمد ڈار صاحب متکلم اسلام تو نہیں تھے، مگر فلسفیانہ انداز میں اسلام کا درد رکھتے تھے، انھوں نے اسی درد کا اظہار کچھ کرب اور بے چینی کے ساتھ کیا ہے، سید احمد خان کے خیالات میں ان کا نیاز لینا اگر صحیح نہیں تھا تو پھر ان کے ہم خیال اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو مطمئن کون کر سکتا ہے؟ ان کی ذمہ داری تو ان پر آتی ہے، جو اپنے کو صحیح معنوں میں اسلام کا نگران اور محافظ سمجھتے ہیں، ڈار صاحب اپنی اس کتاب سے بھی ان پر یہ ذمہ داری عائد کر گئے ہیں۔

جناب بشیر احمد ڈار کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گذرتا، اقبالیات کے علاوہ تاریخ تصوف قبل از اسلام، حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق، پاکستان کیوں؟ وغیرہ اپنی علمی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں، آخر میں تصوف کی فارسی کتاب ثمرات القدس بھی ترتیب دے رہے تھے، پھر رسالوں اور کانفرنسوں، انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی اور ورلڈ آف فلاسفی کے لیے برابر مضامین لکھتے رہتے،

ان کی خود شکن بھلمنساہت کا ایک واقعہ برابر یاد آتا ہے، دسمبر ۱۹۷۰ء میں

لاہور میں علامہ محمد اقبال کے صد سالہ جشن کے موقع پر ہم لوگ انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل میں ایک ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے، وہیں جناب سید حسام الدین راشدی پر قلب کا حملہ ہوا وہ اسپتال منتقل کر دیے گئے، دوسرے دن میں ان کی عیادت کے لئے اسپتال جانا چاہتا تھا، جناب بشیر احمد ڈار اپنی محبت میں میری رہبری کے لئے تیار ہو گئے، جشن کے مہمانوں کو لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کرانے کے لئے مخصوص بسیں اور موٹریں چلیں، ہم دونوں بھی روانہ ہوئے، طے ہوا کہ لاہور کے شاہی قلعہ سے ہم دونوں اسپتال چلے جائیں گے، وہاں پہونچے تو اسپتال جانے کے لئے کوئی ٹیکسی نہیں ملی، جشن کی موٹروں کے انچارج ڈار صاحب کے ایک شاگرد رشید تھے ڈار صاحب ان کو کہتے کیا بلکہ حکم دیتے تو وہ بہت شوق سے ہم دونوں کو اسپتال پہونچا دیتے مگر انھوں نے کہا کہ اتنی سی بات کے لیے احسان کیوں لیا جائے، اور وہ تانگے پر چلنے کو تیار ہوئے، ان کے شاگرد رشید نے ہم دونوں کو تانگے پر بیٹھتے دیکھا تو وہ ایک اچھی موٹر لے کر پہونچ گئے کہ یہ حاضر ہے، جب تک چاہیں، اس کو استعمال میں رکھیں، معلوم نہیں ڈار صاحب کی ایسی بے نیازی کی مثالیں ان کی زندگی میں کتنی ملینگی۔

وہ اپنی تصانیف کو تو علمی دنیا میں چھوڑ گئے مگر وہ سفر آخرت کے لیے بھی زاد راہ لے گئے ہیں، اجتہاد کے ذریعہ سے وہ اسلام کی سربلندی اور اعتدال پسندی کے خواہاں تھے، وہ قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات کی بھی ترویج چاہتے تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی نیکی اور بھلمنساہت کے ساتھ جو تحریریں لکھیں کیا عجب کہ خدا وند قدوس کی بارگاہ میں مغفرت کا باعث بن جائیں۔ آمین۔

جوان مرگ محمد الحسنی

از۔ عبد السّلام قدوائی

جون کا معارف طباعت کے آخری مرحلہ میں تھا کہ اچانک اطلاع ملی کہ ندوۃ
مکفقیب رسالہ البعث الاسلامی کے مدیر مولوی محمد الحسنی کا انتقال ہوگیا، یہ خبر اتنی خلاف
توقع تھی کہ بڑی دیر تک یقین نہیں آیا، ان کی عمر زیادہ نہیں تھی، چالیس سے تین ہی چار سا
آگے بڑھے ہوں گے، صحت بھی اچھی تھی، کبھی کسی طویل یا شدید بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے
تھے، جب ملاقات ہوتی ہشاش بشاش نظر آتے۔

یہ سچ ہے کہ جو آیا ہے، اسے ایک دن جانا ضرور ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ المو
لیکن کسے معلوم تھا کہ ان کا وقت موعود اتنا قریب ہے، ہم لوگوں کے سامنے تو بچے
ان کی پیدایش کل کی بات معلوم ہوتی ہے، ہم کس طرح خیال کرتے تھے، کہ وہ ہم سے
پہلے رخت سفر باندھ لیں گے۔ لیکن ان کے دوستوں اور ہم سنوں کو بھی اس تیز
کا گمان نہیں تھا، ان کی جسمانی ساخت اور صحت کی رفتار دیکھ کر سبھی عمر طویل کی
کرتے تھے، لیکن ظاہر بینوں کے یہ سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور اللہ
مشیت پوری ہوکر رہی، تقدیر کے سامنے تدبیر نے سپر ڈال دی، اور انسان
مجبوری و بے بسی ہی نہیں خام خیالی اور غلط اندیشی بھی نمایاں ہوگئی۔

مصلحت ایزدی تھی کہ وہ چھوٹی عمر ہی میں اس دنیا سے کوچ کر جائیں
تقدیر الٰہی کے رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی انسان کے بس میں نہیں ہے، اس کا علم ناقص
اس کی نظر کوتاہ اور اس کا علم محدود ہے، ان حالات میں وہ حکمت الٰہی کا احاطہ کس طرح
کر سکتا ہے، عالم غیب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، ہم ظاہر بیں باطن کے حقائق
سے ناواقف ہیں، البتہ اللہ کی مصلحت پر ہمارا ایمان ہے، اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ
اس کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہے، یہ ہماری کم نگاہی ہے کہ موت کو زندگی کا
خاتمہ سمجھتے ہیں، اس سے تو حیات نو کا آغاز ہوتا ہے، دنیا مطیۃ الآخرہ ہے، انسان
اس جہان فانی سے گزر کر عالم جاودانی میں قدم رکھتا ہے، جہاں اسے مادہ کے جامۂ
تنگ کو اتار کر خلعت لامحدود عطا ہوتی ہے، اور فنا کے گھاٹ سے اتر کر بقائے دوام
نصیب ہوتا ہے، اسے انحطاط و زوال کے خوف سے نجات ملتی ہے، اور عروج مسلسل
اور ارتقائے پیہم کی مسرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

محمد میاں اب ہمیں نظر نہیں آتے ہیں، لیکن یہ ہماری نظر کی کوتاہی اور نگاہ کی نارسی
ہے، اگر مادیت کا حجاب حائل نہ ہوتا تو ہم دیکھتے کہ وہ لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون[1]
کے عالم میں پہونچ کر فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ[2] کے زمرہ میں شامل
ہوگئے ہیں، وہاں نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ[3] کے مزے لے رہے ہیں، اور پسماندگان
کو خوف وحزن سے نجات کی بشارت سنا رہے ہیں، وذالک فضل اللہ یوتیہ
من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم اللہ کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے، وہ جسے
جو چاہے دے، وہ سمیع وبصیر علیم وخبیر ہے، وہ دلوں کی آواز سنتا اور نیتوں کے

---

[1] ان کو خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے [2] اللہ نے اپنے فضل سے انھیں جو عطا کیا اس پر خوش ہیں [3] غفور رحیم کی طرف سے مہمانی۔

خلوص کو دیکھتا ہے، وہ ماضی سے آگاہ، حال سے باخبر اور مستقبل سے واقف ہے، اس کے یہاں مزد پابند وقت نہیں، بلکہ مزدور کے حسن عمل اور صلاحیت کار پر موقوف ہے، کسی کو سارے دن کی جانکاہی کے بعد چند پیسے ملتے ہیں، اور کسی کو صرف چند منٹ کی کارگذاری پر اشرفیاں عطا ہوتی ہیں، قلت وکثرت کا فیصلہ مالک کی نظر پر منحصر ہے اس کو کسی کا کام پسند آجائے تو تھیلیوں کے منہ کھول دیتا ہے،

محمد میاں نے عمر بہت کم پائی اس زندگی کی چوالیس بہاریں بھی پورے طور پر دیکھ نہ پائے کہ مادی آنکھیں بند ہوگئیں، اور روح فنا کے مرحلہ سے گزر کر بقا کی منزل میں پہنچ گئی، وہ ڈاکٹر عبد العلی مرحوم کی آخری اولاد تھے، پانچ بیٹیوں کے بعد اللہ نے انھیں یہ بیٹا عطا کیا تھا، سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، ڈاکٹر صاحب بھی مسرور ہوئے، انھوں نے اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا، اور طے کر لیا کہ اس عطیۂ ربانی کو اسی کی راہ میں لگائیں گے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی طرح دینی و دنیاوی تعلیم دلا کر اس بچے کو ڈاکٹر بنائیں گے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے سوچنے کا انداز دوسرا تھا، وہ اللہ کے دین اور اس کے . . بندوں کی خدمت کے قائل ضرور تھے، مگر موقع ومحل اور حالات ضروریات کے پیش نظر وہ خدمت کی نوعیت اور دائرۂ کار کا تعین کرتے تھے، محض مادی نفع تو کبھی ان کا مطمح نظر نہیں رہا۔ وہ خالص دنیاوی کاموں میں بھی روحانی قدروں کو پیش نظر رکھتے تھے، اور رضائے الٰہی کی طلب سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے، مگر اس بارہ میں بھی وہ ادنیٰ و اعلیٰ پر نظر رکھتے تھے، انھوں نے محمد میاں کی تعلیم و تربیت میں بھی یہ نقطۂ نظر پیش نظر رکھا، وہ نصاب و نظام تعلیم کے بارہ میں تقلید کے بجائے اجتہاد کے قائل تھے، اور خوب سے خوب تر کی فکر میں رہتے تھے، پہلا تجربہ

انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی (علی میاں) پر کیا، پھر اسی روشنی میں محمد میاں کے لیے بھی نصاب وطرز تعلیم کا ایک موثر اور تیز رفتار لائحۂ عمل مرتب کیا، مجھے یاد ہے کہ تجربہ کار مدرسین اس پر سخت تنقید کرتے تھے، اور وثوق کے ساتھ اس کی ناکامی کی پیشین گوئی کرتے تھے، مگر ڈاکٹر صاحب اپنی رائے پر جمے رہے، بالآخر ان کی رائے صحیح ثابت ہوئی، اور محمد میاں قواعد وضوابط کی پُرپیچ راہوں سے گزرے بغیر ادب وانشا کی ایسی بلند منزل تک پہونچ گئے، جس پر لوگ رشک کرتے تھے، ان کی تحریریں فصاحت وبلاغت، زورِ کلام، قوت استدلال اور انداز بیان کا بہترین نمونہ ہوتی تھیں، ان کے مضامین عرب ملکوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے، وہ مقرر نہ تھے، مگر جب کبھی مجمع کے سامنے کوئی مضمون پڑھتے تو سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے۔

اللہ نے ان کے دل کو اسلام کی محبت اور ملت کے درد سے سرشار کر دیا تھا، باپ کی تربیت اور صاحبان علم وبصیرت کے فیضانِ نظر نے اس نشہ کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا تھا، ابھی شعور کی آنکھیں ٹھیک سے کھلنے بھی نہیں پائی تھیں کہ وہ اسلام کی خدمت اور ملت کی تنظیم کے خواب دیکھنے لگے، اس غرض سے ایک سوسائٹی کی تشکیل کی اور اسلام کی بین الاقوامی زبان عربی میں ایک اعلیٰ درجہ کے رسالہ کے اجرا کا منصوبہ بنایا، ان کے حسن نیت نے اس خیال کو مقبولیت عطا فرمائی اور البعث الاسلامی کے نام سے ایک وقیع رسالہ جاری ہو گیا، اور ملل اسلامیہ کے درمیان ربط ونظم کی طرح پڑ گئی جس نے آگے چل کر ایک موثر اور مضبوط نظام کی شکل اختیار کی، ندوۃ الشباب العالمیۃ اور رابطۃ العالم الاسلامی دونوں ان کے خواب کی تعبیر ہیں، ان کے قلم کا اثر روز بروز بڑھ رہا تھا، اور مصر وشام، نجد وحجاز اور دوسرے عرب ممالک میں ان کے

مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے، ان کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے، مزید کتابیں زیر ترتیب تھیں، لیکن ؏ آں قدح بشکست واں ساقی نہ ماند

عربی کے ساتھ وہ اردو کے بھی بہت اچھے انشا پرداز تھے، اس کم عمری میں مختلف کہن، سال مصنفین سے خراج تحسین وصول کیا، مولانا محمد علی مونگیری کی ضخیم سوانح عمری کے علاوہ تصانیف و تراجم کا ایک سلسلہ یادگار ہے، مشہور صاحب علم جرمن مسلمان لیوپولڈ اسد کی کتاب "روڈ ٹو مکہ" کا ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے ایسا رواں اور شستہ کیا کہ اہل زبان عش عش کرنے لگے، مولانا ابوالحسن علی کی تحریروں کے بڑے باکمال مترجم تھے، ان کی بہت سی کتابوں اور رسالوں کو عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں منتقل کیا ہے، اور ابھی چند ماہ ہوئے ان کی ضخیم سیرت نبوی کا ترجمہ اس خوبی کے ساتھ اردو میں کیا کہ اصل کا گمان ہوتا ہے، علی میاں ان کی ترجمہ نگاری کے بڑے مداح تھے، اور کہا کرتے تھے کہ محمد میاں نقل کو اصل بنا دیتے ہیں۔

علم و ادب میں اس کمال کے ساتھ وہ تہذیب و شائستگی اور شرافت و متانت کا بھی بہترین نمونہ تھے، خوردوں کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آتے، دوستوں کی دلداری و دلنوازی کی کوشش کرتے، بزرگوں کی تعظیم و توقیر کا ہمہ وقت خیال رکھتے اور ہم نشینوں کی خوشنودی کی فکر کرتے، اجنبی آدمی سے بھی ملاقات ہوتی تو مسکراتے ہوئے ملتے، ان کے چہرہ کی بشاشت اور خندہ جبینی ان کی لطافت طبع اور پاکیزگی قلب کی ترجمان تھی، انکی کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ ؏

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

جی چاہتا تھا کہ ابھی کچھ دن اور زندہ رہتے، اپنے بچوں کی بہار دیکھتے، گھر والے

ان کو دیکھ کر خوش ہوتے، عزیز ان کے حسن سلوک سے مستفید اور دوست انکی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی سے محظوظ ہوتے، اور ان کے دل ان کی باغ و بہار طبیعت سے باغ باغ ہوتے، ملک وملت کی خدمت کے نئے نئے میدان تلاش کرتے، ان کا اشہب قلم نئی وادیوں میں قدم رکھتا، اس کی جولانیاں نئے معرکے سرکرتیں اور وہ اپنی سحر آفریں تحریروں سے دلوں کو مسخر کرتے لیکن۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مشیت ایزدی کے سامنے کسے مجال دم زدن ہے بندگی تسلیم ورضا کی طالب ہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ایک اور سانحہ

محمد اسحٰق جلیس مرحوم

ابھی یہ سطور زیر تحریر ہی تھیں کہ مولوی محمد اسحٰق جلیس ندوی کے انتقال کی اطلاع ملی وہ ندوہ کے کتب خانہ کے نائب مہتمم، رسالۂ تعمیر حیات کے ایڈیٹر اور تحریک پیام انسانیت کے سرگرم سکریٹری تھے، مولانا ابوالحسن علی ندوی ان کے بڑے قدرشناس تھے، اور ان سے بڑی توقعات رکھتے تھے، افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور عین شباب کے عالم میں اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے، اللہ تعالےٰ ان کو اپنی رحمت سے نوازے، پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے اور ندوہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

غالب: مدح و قدح کی روشنی میں

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

کا

ایک مکتوب

دارالمصنفین کی روایت رہی ہے کہ جب اس کی نئی مطبوعات شائع ہوتی ہیں، تو ریویو کے لئے بہت کم جگہیں بھیجی جاتی ہیں، مگر مولانا سعید احمد اکبرآبادی اڈیٹر برہان کے پاس خاص طور پر ارسال کی جاتی ہیں، غالب پر مذکورۂ بالا کتاب شائع ہوئی تو اُن کے پاس روایت کے مطابق بھیجی گئی، اس کی پہلی جلد پر انھوں نے جو تبصرہ کیا اُس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:-

"غالب صدی تقریبات کے سلسلے میں مرزا غالب پر چھوٹی بڑی، اچھی بری سیکڑوں کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن میں غالب کی زندگی اور اس کے فن کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جو زیر بحث نہ آگیا ہو، اس لئے سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے جب ان تقریبات میں شرکت کا ارادہ کیا، تو اپنے لئے مندرجۂ بالا عنوان منتخب کیا، جو ایک حد تک ان سب کا جامع ہے جو آج تک غالب پر مدح یا قدح میں لکھا گیا تھا، چنانچہ زیر تبصرہ کتاب میں جو صرف حصہ اوّل ہے، غالب کے معاصرین اور اُن کے شاگردوں سے لے کر ڈاکٹر عبداللطیف تک تمام لوگوں کی تحریری آرا، کو جن میں غالب کی نسبت

اظہار خیال کیا گیا ہے، یک جا کر دیا گیا ہے، اس بنا پر اس کتاب کا یہی فائدہ کچھ کم نہیں ہے، کہ یہ بہت سی کتابیں پڑھنے سے بے نیاز کر دیتی ہے، مزید برآں لائق مولف نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان تحریروں پر تبصرہ بھی کرتے گئے ہیں، اس چیز نے کتاب کی افادیت کو دو چند کر دیا ہے، کتاب بڑے سلیقے اور عمدگی سے مرتب کی گئی ہے، انداز بیان دلکش اور لطف آفریں ہے، غالب اور غالبیات کے طالب علم اور اساتذہ کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

(مارچ ۱۹۷۹ء)

اس کتاب کی دوسری جلد پر مولانا نے تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:-

"..... اس دوسرے حصہ میں جن ادیبوں اور نقادوں کی تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے ان کی مجموعی تعداد چھتیس ہے، جن میں مشہور اور بلند پایہ حضرات ہیں .... ان پر جو تبصرے ہیں، وہ بڑے دلچسپ اور فکر انگیز ہیں، علی الخصوص شیخ اکرام، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، نیاز فتح پوری اور شوکت سبزواری پر انھوں نے جو تبصرے کئے، اور ہلکی ہلکی جو چٹکیاں لی ہیں، وہ بڑی معنی خیز ہیں، اور ادب کا ایک نمونہ بھی، اس حیثیت سے کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب بڑی قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے، غالب کی مدح یا قدح میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے بہت بڑے حصہ کا عطر اور لب لباب اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے، اور چونکہ اس پر دیدہ ورانہ تبصرہ بھی ہے، اس لئے قاری ہر مصنف کے محاسن اور معائب سے واقف ہو جاتا ہے، تمام بحث و گفتگو کے بعد کتاب کے آخری حصہ پر لائق مصنف

نے اپنی جو ایک جامع رائے لکھی ہے، ہم حرف بحرف اس سے متفق ہیں' لکھتے ہیں:۔

"مولانا حالی نے اپنی طبیعت کی سنجیدگی، نظر کی ژرف بینی، فکر کی گہرائی اور تنقید نگاری کی نکتہ پروری سے غالب کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے میں جو اعتدال پسندی اور میانہ روی اختیار کی ہے، وہی غالب کی شاعری کے تنقیدی لٹریچر کا راس المال ہے، اس کے بعد جو کچھ لکھا گیا، اس میں کچھ تو واقعی مفید اور قابلِ مطالعہ ہے، مگر بہت کچھ یا تو تفریحی ہے، یا تنقید نگاری کی ذہنی مشق اور ورزش"

(مئی ۱۹۷۹ء)

ان دونوں تبصروں کو پڑھ کر راقم نے مولانائے محترم کو ایک خط لکھ کر ان سے پوچھا کہ انھوں نے ان دونوں جلدوں پر جو تبصرہ کیا ہے، کیا یہ رسالہ کے ایک اڈیٹر کی حیثیت سے ایک رسمی فرض انجام دینے کے سلسلہ میں ہے، یا یہ تحریریں اس محبت کی بنا پر لکھ دی گئی ہیں، جس کی کچھ بوندیں اس کے عاجز مصنف کے لئے اُن کے دل میں ٹپکتی رہتی ہیں، اس کے جواب میں اُن کا یہ نجی مکتوب ملا،

علی گڑھ — یکم جولائی ۷۹ء

محب محترم و مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

والانامہ پہنچا، شکریہ! میرے دل میں بقول آپ کے آپ کی محبت کی ایک بوند نہیں، بلکہ یقین مانئے ایک دریا موجزن ہے، لیکن تبصرہ نگاری کا فرض بڑا بے رحم ہے، وہ دوست اور دشمن میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا، اس لئے میں نے جو کچھ

لکھا ہے، اس میں آپ کی محبت اور آپ کے ساتھ غیر معمولی تعلق خاطر کا دخل نہیں ہے، بلکہ میں نے محض اس لئے لکھا ہے کہ میں نے آپ کی کتاب مزے لے لے کر از اول تا آخر پڑھی ہے، اور میں واقعی اس سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ آپ کے خیالات و افکار خود میرے اپنے خیالات و افکار کا عکس نظر آتے ہیں، میں بہت مشغول آدمی ہوں، اور پھر تبصروں میں قلم و دل کا خیال رکھتا ہوں، ورنہ درحقیقت آپ کی کتاب اس کی مستحق تھی کہ اس پر پانچ چھ صفحات میں تبصرہ کرتا، اور ادب کی جو پھول جھڑیاں آپ نے چھوڑی ہیں، ان سے لطف اندوزی میں اپنے ساتھ قارئینِ برہان کو بھی شریک کرتا، اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے، آپ نے شبلی اور حالی کے اسکول سے تعلق رکھنے والے ہم لوگوں کی خوب ترجمانی کر دی

ع: ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند،

والسلام

سعید احمد اکبر آبادی،

اقبال کامل

اس میں علامہ اقبال کے سوانح کے علاوہ اُن کے شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے، پھر اُن کے فارسی و اردو کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ اُن کے کلام کی ادبی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، اس کے بعد اُن کی شاعری کے اہم موضوعات یعنی فلسفۂ خودی، بیخودی، نظریۂ ملیت، تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف، فنونِ لطیفہ، اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، قیمت :- ۱۶ روپیہ

مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی،

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

اسلام اور عصر حاضر: مرتبہ مولانا سمیع الحق صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۷۴۰، مجلد، قیمت: ۲۷ روپیہ، پتہ:- موتمر المصنفین دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور) پاکستان،

گذشتہ مہینہ ان صفحات میں موتمر المصنفین کی پہلی کتاب کا ذکر آچکا ہے، یہ اس کی دوسری کتاب ہے، جو سترہ ابواب پر مشتمل اور مولانا سمیع الحق مدیر الحق کے ان اداریوں کا مجموعہ ہے جو موجودہ مسائل اور تحریکوں کے متعلق گذشتہ پندرہ ۱۵ برس کے اندر وقتاً فوقتاً ماہنامہ الحق میں شائع ہوئے تھے، دراصل مغربی تہذیب نے اخلاق و روحانیت کی بنیادیں متزلزل کردی ہے دین کے بارے میں طرح طرح کے شبہات پیدا کر دیئے ہیں، اس کے اثر سے خود مسلمانوں کا تجدد پسند طبقہ شرعی احکام و عبادات کی غلط تعبیر کر رہا ہے اور اسلامی آئین احکام، حدود و تعزیرات کو وحشیانہ قرار دے رہا ہے، اس کے نتیجہ میں مذہب سے بعد و بیگانگی اور نفرت و بدگمانی بڑھتی جارہی ہے، اور تن آسان و سہولت پسند لوگ مذہبی قیود اور بندشوں سے آزاد ہوتے جارہے ہیں، اس صورت حال سے پورا عالم اسلام دوچار ہے، اور پاکستان بھی اس کی زد میں ہے، اس کتاب میں مغربی تہذیب و تمدن کے ان بڑھتے ہوئے اثرات اور خطرناک نتائج کا جائزہ لیا گیا ہے، اور دینی حقائق و مسلمات میں تحریف، اسلامی عبادات و احکام

کی غلط تعبیر اور ان شرعی مسائل و قوانین سے انحراف کا جواب دیا گیا ہے جن کو خاص طور پر پاکستان میں تختہ مشق بنایا جا رہا ہے، جیسے زکوٰۃ، قربانی، حدود و تعزیرات، بے پردگی، خاندانی منصوبہ بندی، سود، تعدد ازدواج اور عائلی قوانین میں اصلاح و ترمیم وغیرہ، مصنف نے پاکستان کے مخصوص حالات کے تحت تجدد پسندوں، قادیانیوں، بہائیوں، منکرین حدیث اور بعض دوسرے فرقوں کی تردید کی ہے، اور جشن منانے کے مروجہ طریقوں کی خامیاں واضح کی ہیں، اس سلسلہ میں نزول قرآن، اور میلاد النبی کا جشن منانے والوں کو کتاب و سنت سے وابستگی کی تلقین بھی کی ہے، اور بتایا ہے کہ جشن منانے کی اصل صورت یہی ہے، ایک باب میں دینی مدارس کے نظام و نصاب تعلیم میں اصلاح کی ضرورت اور علما کے خصوصیات و فرائض بیان کیے ہیں، ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دونوں حصوں کی علیحدگی اور اس سے پیدا ہونے والے بحران اور ۱۹۶۷ء کی عرب و اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کے اسباب کا تجزیہ بھی کیا ہے، یہ اور اسی طرح کے متعدد وقتی اور ہنگامی مسائل پر اس کتاب میں بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے، اصولی حیثیت سے مصنف کا نقطۂ نظر صحیح ہے لیکن خود ان ہی کے بقول "یہ وقتی مسائل پر ایک رسالہ کے اداریوں کا مجموعہ ہے، جس کی حیثیت مربوط و مستقل تصنیف کی نہیں ہے" اس لیے اکثر تحریروں میں غصہ، جھنجھلاہٹ اور صحافی رنگ پیدا ہو گیا ہے، اور جواب منطقی و علمی استدلال کے بجائے الزامی نوعیت کے ہو گئے ہیں، بعض اداریوں کی تازگی بھی باقی نہیں رہ گئی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے ان تحریروں کی اشاعت فائدہ سے خالی نہیں، مصنف کی اسلامی و دینی حمیت ہر مضمون سے ظاہر ہوتی ہے،

آپ مرتبہ جناب عرفان عباسی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۹۶، مجلد قیمت ۱۰ روپئے، پتے (۱) اردو پبلشرز نظیر آباد لکھنؤ، (۲) اردو سماج ڈاکٹر موتی لال بوس روڈ، لکھنؤ،

یہ لکھنؤ کے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۸۰ء تک وفات پانے والے پچاس شعرا کا مختصر سوانحی خاکہ ہے، ان شاعروں میں اکثر کا وطن لکھنؤ تھا، مگر کئی ایسے بھی ہیں، جو اس کے قرب وجوار یا دوسرے مقامات کے رہنے والے تھے، مگر انھوں نے یا تو لکھنؤ ہی میں بودوباش اختیار کرلی تھی، یا عمر کا زیادہ حصہ وہیں بسر کیا تھا، اور لکھنؤ کے شعری ماحول اور ادبی فضا میں ان کی نشو و نما ہوئی تھی، مولانا حسرت موہانی، اور ترقی پسندوں میں احتشام حسین، سجاد ظہیر، مجاز اور بعض دوسرے شاعروں سے قطع نظر سب ہی شعرا لکھنؤ کے خاص رنگ سخن کے نمائندہ تھے، اس فہرست میں مسعود حسن رضوی ادیب، مرزا محمد عسکری، مولانا عبدالماجد، ناظر، نیاز فتحپوری، شوکت تھانوی اور فرقت کاکوروی وغیرہ کے نام بھی ہیں، جن کی شہرت نثرنگار کی حیثیت سے زیادہ ہے، مگر وہ شاعر بھی تھے، مصنف کو سبھی سے ملنے، قریب سے دیکھنے اور ان کا کلام سننے کا موقع ملا تھا، اس لیے انھوں نے ان کا سراپا اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کی وضع قطع، شکل وصورت، سیرت و اخلاق، اہم واقعات وحالات اور شعری و ادبی خصوصیات بڑی حد تک سامنے آگئی ہیں، کلام کا نمونہ اور تصویریں بھی دی گئی ہیں، شعرا کا یہ تعارفی سلسلہ قومی آواز لکھنؤ کے سنڈے اڈیشن کے لئے لکھا گیا تھا، اب اس کی کتابی صورت میں اشاعت ایک مفید ادبی خدمت ہے، اس سے ان شعرا پر آئندہ کام کرنے والوں کو مدد ملے گی، زبان وبیان دلکش ہے، مگر بعض لفظوں کا املا غلط ہے، جیسے السلام علیکم کا اسلام وعلیکم، سبقت کا صبقت، تشبیہ کا تشبیع، اور نسب کا نصب وغیرہ،

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی تحقیقی وادبی تنقیدی وتاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے
جو مطالعہ وبصیرت تجربہ ومشاہدہ اور فکر ونظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفا
کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

جرین جلد دوم قیمت: ۹-۱۲

ر صحابہ جلد ۶ " ۴-۹

م حسین کے حالات زندگی کے ضمن میں
تعہ حزنیہ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

سیر الصحابہ جلد ۷،

ابعین: ۶۹، اکابر تابعین کے سوانح،
قیمت: ۵۰-۱۲

یخ اسلام اول (عہد رسالت خلافت راشدہ)
قیمت: ۵۰-۱۲

یخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۰-۱۱

یخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اول)
قیمت: ۰-۱۴

یخ اسلام چہارم خلافت عباسیہ دوم
قیمت: ۰-۱۵

۹۔ اسلام اور عربی تمدن قیمت ۶۵-۵

۱۰۔ عرب کی موجودہ حکومتیں،
قیمت

۱۱۔ ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲۔ دیار رحمت قیمت ۱- ۰۰-۱۰

۱۳۔ خریطۂ جواہر ۵ ۴
زندگی کی آخری کتاب

۱۴۔ حیات سلیمان یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی علمی تعلیمی قومی ملی سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع اور اپنے اسلوب و طرز انشا اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا مثنی، دلکش و دلچسپ قابل مطالعہ ہیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے۔ قیمت: ۵۰-۲۶

معارف کے گذشتہ برسوں کے مکمل فائل

(۱)

متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور خود دین علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، اس کے علمی و دقیق مضامین اور تحقیقات کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا ہے، مستشرقین کے بعض اہل قلم نے غلط فہمی کی بنا پر جب کبھی اسلام پر اعتراضات کئے تو یہ صاحب دار المصنفین کی نگرانی میں دار المصنفین کے ارباب تحقیق نے ان کے دندان شکن جوابات اس کے صفحات پر دیئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل سالوں کے کامل فائل موجود ہیں،

مکمل فائلوں کی تفصیل

[illegible]

[illegible]

[illegible]   منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ

جلد نمبر ال ۵۲۰ اگست ۱۹۷۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن، عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۱۲۴ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۹ء عدد ۲

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

دہلی کی مرکزی حکومت کے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی کی جگہ پر چرن سنگھ نے وزارت عظمیٰ کی باگ سنبھالی تو پورا ہندوستان چیخ اٹھا کہ یہ کیا ہوا؟ اندرا گاندھی کی حکومت سے انتہائی آزردہ ہوکر جنتا نے جنتا پارٹی کو اپنی امیدوں اور امنگوں کا مرجع بنایا تھا مگر پارٹی کے ارباب حل وعقد کے ذاتی مفاد اور باہمی رقابت سے ان سب پر پانی پھر گیا،

— • —

اس کے بعد نجی مجلسوں میں یہ بحث جاری ہے کہ اس ملک میں جمہوریت کامیاب ہو سکتی بھی ہے کہ نہیں، بادشاہت کا نعم البدل جمہوریت ہے مگر اس کی تاریخ بادشاہت ہی کی طرح داغدار رہی، عہد قدیم میں ایتھنس میں تیس سال کی عمر کے شہریوں کے ایک کانسل کے ذریعہ سے شہری ریاست قائم ہوئی، تو یہ ناکام ہو گئی، سقراط اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ کانسل کا ہر رکن ہر عہدہ کے لئے موزوں ہو، اس کے خیال میں اچھے اخلاق کا اچھا انسان ہی اچھا شہری بن کر حکومت کا اچھا عہدیدار ہو سکتا ہے، اس کے شاگرد افلاطون نے اچھے اخلاق کے شہریوں کی ایک جمہوری ریاست بنانے کی کوشش کی، وہ اپنے زمانہ کے سیاست دانوں پر یہ کہکر حملہ آور ہوا کہ وہ زیادہ تر مسائل سے ناواقف ہوتے ہیں، اُن کی ناواقفیت جمہوریت کے لئے لعنت ہوا کرتی ہے، وہ خود غرض بھی ہوتے ہیں، ان کے ذہن پر ذاتی اغراض ہی کی بنا پر اپنے طبقہ کا مفاد حاوی رہتا ہے، وہ معاشی ناہمواری کو دور کرنے میں ناکامیاب رہتے ہیں تو امیروں اور غریبوں کا جھگڑا قصداً کھڑا کردیتے ہیں، افلاطون اپنے عام شہریوں سے بددل ہوکر حکومت کی باگ ڈور ایسے آدمیوں کے ہاتھ میں دینے کا خواہاں ہوا جو فلسفی بھی ہوں،

— • —

وہ فلسفیوں کی جمہوریت بنانے میں ناکام رہا تو اس کے شاگرد ارسطو نے اپنی کتاب "پالٹکس" میں بادشاہت اور امارت (اریسٹوکریسی) کے علاوہ جمہوریت پر بحث کرتے ہوئے اس کی کئی قسمیں بتائیں، عوامی جمہوریت (اکسٹریم ڈیموکریسی)، کسانوں کی جمہوریت، معتدل قسم کی جمہوریت (موڈریٹ ڈیموکریسی)، اور چند لوگوں کی

جمہوریت تما حکومت (اولی گارکی) اس کے نزدیک عوامی جمہوریت پسندیدہ نہیں ہوئی، کیونکہ اس میں زیادہ تر شہر کے رہنے والوں کا قبضہ ہوجاتا ہے جو صاحب اقتدار ہونے کے بعد ڈیماگوگس ہوجاتے ہیں، وہ قانون کا زیادہ احترام نہیں کرتے، ان کی جمہوریت ظلم کی طرف مائل ہوجاتی ہے، اُن کو اپنے عوام کے سفلی جذبات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے جس کے بعد حکومت کے نظم ونسق کا اچھا ہونا ضروری نہیں،

ارسطو کی رائے ہے کہ جب کسانوں کی جمہوریت قائم ہوتی ہے تو اُن کو اپنے مسائل کے علاوہ کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی ہے، ایسی جمہوریت پر اوپر کے طبقہ کے لوگ چھا جاتے ہیں، جو کسانوں کے مسائل کے حل کرنے کے بعد اپنے ذاتی مسائل کی تکمیل میں لگے رہتے ہیں، اس سے چند لوگوں کی حکومت یعنی اولی گارکی پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے، اگر اولی گارکی قائم ہوجاتی ہے تو اس پر قابو پانا جمہوریت سے زیادہ مشکل ہوجاتا ہے، ارسطو کے نزدیک موڈریٹ ڈیموکریسی نسبتاً زیادہ بہتر ہے، اس کو وہ مڈل کلاس کی جمہوریت بھی کہتا ہے، اس کے خیال میں یہ اس وقت کامیاب ہوتی ہے، جب اس کو چلانے کے لئے تجربہ کار افراد حاصل ہوجائیں، اس کی یہ بھی رائے تھی کہ موڈریٹ ڈیموکریسی کے ساتھ اولی گارکی بھی ہو، تو ایک پائدار حکومت قائم ہوجاتی ہے،

جمہوریت کے بہت سے تجربات ہوچکے ہیں، اس میں بھی بادشاہت ہی کی طرح راج ہٹ ہوتی رہی ہے، جس سے جمہور کم وبیش ہر جگہ غیر مطمئن اور بے چین رہے، اُن کی آزادی کے لئے خدا جانے کتنے سیاسی فلسفی پیدا ہوئے، روسو، ہابس، ایڈم اسمتھ، لاک گرین، اور جان اسٹورٹ مل وغیرہ سب ہی نے جمہور کی آزادی کا راگ الاپا ہے، مگر جمہور کا استحصال اسی طرح جاری ہے جس طرح کہ بادشاہت کے زمانہ میں تھا، جمہوریت کے نمائندے جب ارباب حکومت بن جاتے ہیں تو ان سیاسی فلسفیوں کے زریں اصولوں کو سامنے رکھنے کے بجائے اٹلی کے ایک شاطر سیاست داں میکاؤلی کو اپنا رہبر بنا لیتے ہیں جس کی سیاست کا لب لباب یہ ہے کہ سیاست میں بداخلاقی کوئی چیز نہیں، سیاسی مقصد کے حصول اور اقتدار قائم رکھنے کی خاطر اصحاب حکومت بداخلاق ہوکر طاقت اور فریب بھی استعمال کرسکتے ہیں، اس کا خیال تھا کہ جمہور عموماً بزدل ہوتے ہیں، بڑے آدمیوں کے

بڑا ہی بن کر حکومت کی باگ لیتی ہے جمہور کی امید دن کی کوئی خدمت نہیں ہوتی ہے جس سے معاشرہ بگڑتا رہتا ہے، اس کو درست کرنے کے لئے جمہوریت کی پُر فریب مطلق العنانیت کی ضرورت ہوتی ہے،

*

میکاولی ہی کے ایک ہم نوا سیاسی فلسفی کا خیال ہے، کہ سیاست میں سلامت روی گدھے سیاست دان اختیار کیا کرتے ہیں، اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جمہوریت میں سب سے زیادہ احمق سب سے زیادہ عاقل، اور سب سے زیادہ عاقل سب سے زیادہ احمق بن جاتا ہے،

*

ہمارے ملک نے اپنے سیاسی نظام کے تمام اصولوں کو یورپ ہی سے درآمد کیا ہے، یہاں تمام منزلوں سے گذر رہا ہے، یہاں کے شہری ابھی تو دم سادھے اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ یہ جمہوریت اُن کو کہاں لے جاکر چھوڑتی ہے، سردست وہ اپنے اپنے حلقہ کے نمائندہ سے زبان حال سے کہہ رہے ہیں،

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

*

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ نظر و فکر نکلنا شروع ہوا ہے، اس کے مدیر جناب اسلوب احمد انصاری صدر شعبۂ انگریزی ہیں، انگریزی کے فاضل اور لائق استاد ہونے کی حیثیت سے وہ انگریزی زبان میں بہت کچھ لکھ کر اپنی قابلیت اور استعداد کا ثبوت دے سکتے تھے، مگر اردو زبان کی محبت میں اردو ہی میں برابر مضامین اور کتابیں لکھ کر اس کے ادبی نقادوں میں نمایاں و امتیازی جگہ حاصل کر لی ہے، ابھی تو اس کا ایک ہی شمارہ نکلا ہے لیکن امید ہے کہ اُن کے ادبی ذوق کی لطافت اور سلامت روی سے ان کی نگرانی میں آیندہ جو شمارے نکلیں گے اُن میں زبان کی ہمواری اور خوبی کے ساتھ تنقید نگاری کا اعلیٰ معیار اس طرح قائم رہیگا کہ اس سے اردو کی علمی و ادبی دولت میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا، مسلم یونیورسٹی کی یہ روایت رہی ہے کہ جب کچھ اچھے مضامین جمع ہو جاتے ہیں تو ایک مجلہ شان سے نکل آتا ہے، اور پھر سناٹا چھا جاتا ہے، خدا کرے اسلوب احمد انصاری صاحب اپنی نگرانی میں اس روایت کے خلاف اپنی شاندار روایت قائم کریں،

*

استاذی المکرم جناب مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور تصنیف خیام کا نیا اڈیشن چھپ گیا، شائقین اس کو طلب کر سکتے ہیں،

مقالات

مطالعہ ملفوظاتِ خواجگانِ چشت کے مبادیات

(خواجگانِ چشت کے ملفوظات کی روشنی میں)

از مولانا اخلاق حسین دہلوی بستی نظام الدین دہلی:

عہد حاضر میں ہند و پاک میں کتب ملفوظات پر تنقیدیں لکھی جا رہی ہیں، اہل علم تو نہیں، البتہ ناواقف ان کے مطالعہ سے گمراہ ہو سکتے ہیں۔ لہذا کتب ملفوظات پر کچھ لکھنے سے پہلے ان امور سے روشناس کرانا مناسب ہوگا جو ان کے خیالات کی اساس اور غلط فہمیوں کے اسباب ہیں، انھیں ذہن نشین رکھنے سے کتب ملفوظات کا مطالعہ نفع بخش ہوگا، (انشاء اللہ تعالیٰ) ان میں سے اہم ترین یہ ہے کہ کتب ملفوظات آج تک نقد و تصحیح کے ساتھ شائع نہیں ہوئی ہیں،

ملفوظات کیا ہیں؟ ملفوظات مجموعہ ہوتے ہیں، اُن بیانات کا جو اخلاق فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کی ترغیب و تحریص کے لیے صوفی بزرگ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے مجمع میں بیان کیا کرتے ہیں اور کرتے تھے۔ ان میں سامعین کی استعداد کا، ان کے امراضِ قلبیہ کے دفعیہ کا اور ان کی روحانی ترقی کا پورا پورا لحاظ ہوتا ہے، اکابر اولیاء اللہ کا ذکر بھی آجاتا ہے، جو اثر و تاثیر کو دو بالا کر دیتا ہے۔ ملفوظات کو اشارات و ارشادات اور اقوال و فوائد

بھی کہتے ہیں، اور ان کے مجموعوں کو کتبِ اہلِ سلوک اور کتبِ مشائخؒ سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ ملفوظات کی اہمیت | ملفوظات کو زمانۂ قدیم سے اہمیت و مقبولیت حاصل ہے۔ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور انھیں اصلاحِ حال کے لیے نفع بخش مانا جاتا ہے، ان کا شمار کتبِ اہلِ سلوک اور کتبِ مشائخ میں ہوتا ہے، حضرت باباصاحبؒ کا ارشاد ہے۔

اگر کسے را شخصے کامل نباشد کتابِ اہلِ سلوک پیشِ خود دارد و متابعتِ آں نماید	اگر کسی کو شیخِ کامل نہ ملے تو وہ اہلِ سلوک کی کتاب کا مطالعہ کرے، اور اس کی پیروی کرتا رہے۔
(راحت القلوب ص ۱۵)	

حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے بارہا خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ کو نصیحت فرمائی ہے۔

کتابِ مشائخ و اشاراتِ ایشاں کہ در سلوک راندہ اند در نظر می باید داشت	مشائخ کی کتاب اور ان کے اشارات جو انھوں نے سلوک کے باب میں فرمائے ہیں مطالعہ میں رکھنے چاہئیں۔
(فوائد الفواد ص ۳۰)	

ان ارشادات سے مشائخِ کرام کی کتابوں کا وجود۔ ان کا منفعت بخش ہونا، اور انکی قدر و منزلت واضح ہے، اس اجمال کی تفصیل کے بعد حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے!

چوں بخدمت شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز پیوستم ہمیں معنیٰ در خاطر کردم کہ آنچہ از لفظِ مبارک ایشاں خواہم شنید خواہم نوشت	جب میں حضرت باباصاحبؒ کی خدمت فیض درجت سے وابستہ ہوا تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جو کچھ میں آپ کی زبان مبارک سے سنوں گا لکھ لیا کرونگا . . . . لہٰذا جو کچھ
ہرچہ از شیخ شنودہ شد نوشتم چوں بمقام خود باز آمدم نسخہ کردم۔ بعد از آں ہرچہ سماع	میں حضرت باباصاحبؒ سے سنتا وہ لکھ لیا کرتا۔ جب اپنی قیام گاہ پر واپس آتا تو کتاب میں

می افتاد در قلم می آورد م تا ایں معنی بخدمت شیخ باز نمودم۔ بعد ازاں ہرگاہ کہ حکایتے و اشارتے بیان کردے می فرمودے حاضر ہستی تا ایں عنایت کہ اگر من غائب بودے چوں بخدمت باز پیوستمے فائدہ کردے در غیبت فرمودے آں را اعادہ کردے۔ (فوائد الفواد ص ۳۰)

لکھ لیتا اس کے بعد جو کچھ سنتا اسے لکھ لیتا حتیٰ کہ یہ بات میں نے حضرت بابا صاحبؒ کو بتا دی اسکے بعد حضرت بابا صاحبؒ کوئی حکایت یا کوئی اشارہ و نکتہ بیان فرماتے تو مجھ سے فرماتے حاضر ہو یہاں تک عنایت تھی کہ اگر میں موجود نہ ہوتا اور دیر سے حاضر خدمت ہوتا۔ تو جو کچھ بیان فرما چکے ہوتے اسے دوبارہ بیان فرماتے تھے۔

(۱) ایسا لگتا ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت بابا صاحبؒ کے بیان فرماتے وقت ہی لکھ لیا کرتے تھے، یا بعض ارشادات کی مدد سے بعد میں تفصیل سے لکھ لیتے تھے، راحت القلوب کی عبارت دیگر ملفوظات سے مختلف ہے مگر دیرینہ روزی کے اثرات کے باوجود سلیس و رواں اور موثر ہے۔

(۲) حضرت بابا صاحبؒ کی خانقاہ میں مریدوں کے قیام کے لیے علیحدہ جگہ تھی، جہاں حضرت محبوب الٰہیؒ کے لیے پلنگ بچھوایا گیا تھا، اور جہاں دیگر مرید بھی مقیم تھے جن میں حافظ قرآن بھی تھے، (سیر الاولیاء ص ۱۰۶)

(۳) حضرت بابا صاحبؒ کی قیام گاہ علیحدہ تھی، جہاں ایک بار حضرت محبوب الٰہیؒ نے آپ کے پلنگ اور بستر کی زیارت کی تھی، اور آپ کو عالم وجد میں دیکھا تھا، (فوائد الفواد ص ۵۱-۵۲۔ سیر الاولیاء ص ۱۲۳)

(۴) ملفوظ میں لفظ نسخہ کردم یہ بتاتا ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت بابا صاحبؒ کے ارشادات کو کمال حزم و احتیاط سے اور اخلاص و احترام کے ساتھ بشکل کتاب مدون فرماتے تھے، وہ یادداشت سی نگر تھی بصورت کتاب۔ جو نصف صدی کے

قریب تک آپ کے پاس محفوظ تھی۔

(۵) یہ اہتمام کہ اگر کبھی حضرت بابا صاحبؒ کچھ فرمانا شروع کر دیتے اور حضرت محبوب الٰہیؒ موجود نہ ہوتے تو آپ کے پہنچتے ہی اعادہ فرماتے اور بیان کو دہراتے تھے اس سے بھی ملفوظات کی افادیت ظاہر ہے۔

(۶) اس سے بھی ملفوظات کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اگر حضرت بابا صاحبؒ مزید توجہ کی ضرورت سمجھتے تو دورانِ بیان میں متنبہ کرتے اور فرماتے حاضر ہستی توجہ سے سن رہے ہونا۔

(۷) "سماع می افتاد" اور "در قلم می آورد" ماضی استمراری کے افعال ہیں جو سننے اور لکھنے کے باہمی تواتر کو ظاہر کرتے اور بتاتے ہیں کہ اس کا تعلق قیام اجودھن سے ہے، حضرت بابا صاحبؒ کی مجلس میں جو کچھ سنا، قیام گاہ پر آکر اسے مرتب کر لیا، شوق اور لگن کا اقتضا بھی یہی تھا۔

(۸) یہ بھی یقینی ہے کہ تالیف ملفوظات کی روایت بزرگانِ سلف سے تعلق رکھتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت بابا صاحبؒ اس قدر اہتمام نہ فرماتے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ ہرگز اپنے مریدوں کو ملفوظات کی تدوین کی اجازت نہ دیتے۔ اور آپ کے بزرگ خلفا جن میں شیخ برہان الدین غریبؒ[1] اور مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ[2] کے نام نامی سرفہرست ہیں ہرگز اس پر عمل پیرا نہ ہوتے۔

(۹) حضرت بابا صاحبؒ کے اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے معمول سے اس کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ خواجۂ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین

---

[1] نفائس الانفاس [2] خیر المجالس ۹

بختیار اوشیؒ سے جو کتب ملفوظات منسوب ہیں وہ دیرینہ اثرات کے باوجود بایقین ان ہی کے رشحاتِ قلم کا ثمرہ ہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

کرامتے معائنہ کردم۔ ہم دراں	میں نے ایک کرامت دیکھی، ان ہی دنوں میں
ایام مردے مرا کاغذہا سفید داد یکجا[۱]	ایک شخص نے مجھے سفید کاغذ دیے جو یکجا جلد بستہ
جلد کردہ۔ من آں را بستدم	تھے، میں نے لیے اور ان پر شیخ کے ملفوظات
فوائد شیخ ہم دراں ثبت کردم،	کو لکھا۔

(فوائد الفواد ص ۳۰)

لفظ کرامتے بتاتا ہے کہ سفید کاغذوں کا ملنا ملفوظات کی اہمیت کے پیش نظر تھا جو حضرت باباصاحبؒ کی توجہ ہی کا ثمرہ تھا، اسی لیے اسے کرامتے سے تعبیر کیا ہے، اس گفتگو کے دوران حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا۔

تاایں غایت آں مجموعہ برمن است	اب تک وہ مجموعۂ ملفوظات میرے پاس ہے

حضرت محبوب الٰہیؒ نے ۲۰ شوال ۷۰۰ھ کی مجلس[۲] میں یہ ذکر کیا تھا۔ گویا کہ چالیس برس کا طویل زمانہ گزر چکا تھا، مگر آپ نے اسے کلیجے سے لگا رکھا تھا، اس سے زیادہ ملفوظات کی اہمیت اور کیا ہوگی۔ (ص ۳۱)

اس مجموعہ کے رواج میں آنے کی اطلاع ہمیں شمائل الانقیا و دلائل الاتقیا[۳] سے

---

[۱] پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اس جملے کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ایک شخص نے سفید کاغذ جلد بندھا ہوا مجھے دیا (حضرت نظام الدین اولیا۔ حیات و تعلیمات ص ۶۰) یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے، عبارت میں کاغذہا ہے جو واحد نہیں جمع ہے، اس امتیاز کو نظر انداز کرنے سے ترجمہ خلاف محاورہ بھی ہوگیا، تاہم اس سے یہ واضح ہے کہ مرحوم کو اردو فارسی اسالیب سے کتنی آگاہی تھی، [۳] ایک فاضل نقاد نے نام شمائل الاتقیا و دلائل اتقیا لکھا ہے، (منادی دہلی جلد ۲۰ شمارہ ۷ تا ۸ ۱۹۷۷ء) جو غلط ہے اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے جو فارسی مخطوطات کی کیٹلاگ مطبوعہ ۱۹۲۶ء ص ۱۰۵ میں، ۱۱۹ نمبر پر ہے اور ۱۱۱۰ھ کا

ملتی ہے، جس کو حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ خلیفہ شیخ برہان الدین غریبؒ (المتوفی ۷۳۲ھ) کے ایماء سے ان کے فاضل ترین مرید مولانا رکن الدین کاشانیؒ نے تصنیف کیا تھا، اس میں متعدد کتب ملفوظات کی فہرست ہے، جس میں یہی مجموعۂ ملفوظات راحت القلوب کے نام سے موجود ہے، جو اس کے مستند و معتبر اور مقبول و مروج ہونے کی بین دلیل ہے، اس مجموعۂ ملفوظات کی متعدد روایتیں کتاب مفاتح الجنان[1] میں بھی ہیں جو مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے مرید معتبر عالم محمد مجیر وجیہ ادیبؒ کی تصنیف ہے اور جو ۷۵۶ھ کی یادگار ہے۔

ایسے بیانات اور بھی ہیں، جن سے ملفوظاتِ مشائخ کی اہمیت و افادیت واضح ہے، حضرت باباصاحبؒ کے ایسے ہی ایک بیان کا اعادہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا ہے، جو افضل الفوائد (ص ۱۱۱ - ۱۱۲) کی زینت ہے، الغرض اخلاق و سلوک میں ملفوظات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اگر انھیں صحت کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا جائے تو وہ آج بھی ہمارے دکھ کی دوا ہیں، اور آیندہ بھی۔

۳۔ ملفوظ و ملفوظات | ملفوظ اور اس کی جمع ملفوظات کا معنی معروف میں استعمال زمانۂ قدیم سے ملتا ہے، خیر المجالس تالیف ۷۵۵ھ میں اور مفاتح الجنان تالیف ۷۵۶ھ میں بھی متعدد جگہ ذکر ہے، سیر الاولیاء اولین و قدیم ترین تذکرہ ہے، اس میں بھی ملفوظ و ملفوظات کا استعمال جابجا ملتا ہے، مثلاً

خیر المجالس

(۱) ملفوظ مولانا برہان الدین بجاری (صفحہ ۱۰)

---

[1] مفاتح الجنان کا ایک قدیم قلمی نسخہ راقم کے پاس ہے، ایک نسخہ مفتاح الجنان نام سے ذخیرۂ مخطوطات ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے جو کیٹلاگ مطبوعہ ۱۹۲۶ء کے ص ۸۹ پر ہے۔

(۲) در ملفوظ خواجہ عثمان ہارونیؒ مشکلے شدہ است (صفحہ ۵۲)

(۳) ملفوظاتِ شیخ قطب الدین و شیخ عثمان ہرونیؒ (صفحہ ۵۳)

مفاتح الجنان

(۱) از ملفوظ شیخ المشائخ والاولیا فرید الدین قدس سرہ العزیز (ورق ۳۴)

(۲) از ملفوظ شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز (ورق ۱۱۹)

(۳) از ملفوظ شیخ الاسلام شیخ فرید الدین " (ورق ۲۳۰ ب)

سیر الاولیاء

(۱) در بعضے ملفوظاتِ شیخ شیوخ العالم فرید الحق..... قدس سرہٗ العزیز سلطان المشائخ قدس اللہ سرہٗ العزیز بخطِ مبارک خود در قلم آوردہ (ص ۴)

(۲) بزرگے از ملفوظات شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز پانصد کلمہ جمع کردہ است۔ (ص ۶)

(۳) خواجہ شمس الدین دھاریؒ..... از ملفوظاتِ سلطان المشائخ کتابے نوشت۔ (ص ۱۱۸)

(۴) از ملفوظات جان بخشِ سلطان المشائخ کتابے نبشتہ است و انوار المجالس نام کردہ است۔ (ص ۲۰۰)

(۵) در آخر عمر فوائد الفواد کہ ملفوظاتِ سلطان المشائخ است بخط مبارک خود نوشت۔ (ص ۲۰۰)

(۶) از ملفوظاتِ روح افزاے سلطان المشائخ فوائد چند نبشت......

امروز آں فوائد الفواد مقبول اہل دلانِ عالم شدہ است۔ (ص ۳۰۸)

۷۔ امیر خسروؒ کرات گفتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا تبکے تمامی کتب کہ عمر در آں صرف کردہ
۔ ادرم امیر حسن را بود ے و ملفوظات سلطان المشائخ کہ جمع کردۂ اوست مرا بودے (ص ۳۹۸)

۸) در ملفوظات حضرت شیخ الاسلام معین الدین سجزی نبشتہ دیدہ ام ۔ (ص ۳۶۶)

(۹) در ملفوظات شیخ الاسلام معین الدین سجزی نبشتہ دیدہ ام (ص ۳۹۱)

لفظ ملفوظ و ملفوظات معنی معروف میں زمانۂ قدیم سے مروج ہیں، ان کے علاوہ
کتب قدیمہ میں بھی ملتے ہیں، انھیں اختراع جدید تصور کرنا صحیح نہیں ہے، بہرحال
اقوال و شواہد سے ان الفاظ کا رواج اور ان کی قدامت بخوبی واضح ہے۔

کتب ملفوظات کی تدوین | سعادت مند مرید اور معتقد جن میں نوشت و خواند کا ذوق
تھا، وہ ان بیانات کو قلم بند کر لیا کرتے تھے، جو اپنے شیخ بزرگ سے سنتے تھے، تاکہ
ہیں پیش نظر رکھیں، ان کے مطالعہ سے مستفید ہوتے رہیں، اور فیوض و برکات حاصل
تے رہیں۔ بعض دوران بیان ہی میں لکھتے جاتے تھے، اور بعض یادداشت کی مدد سے مرتب
لیا کرتے تھے، حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان سے مترشح ہے کہ آپ دوران بیان ہی میں
بند کر لیا کرتے تھے۔ اور فوراً بعد ہی نہایت شوق و اہتمام سے کتاب میں لکھ لیا کرتے تھے
ملفوظات کے لیے مخصوص تھی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کو حضرت باباصاحبؒ سے جو
الہانہ شغف اور قلبی لگاؤ تھا، جس کے معترف حضرت باباصاحبؒ بھی تھے، (فوائد ۱۱۲)
س کا اقتضا یہی تھا، کہ ہاتھوں ہاتھ اس کو انجام دیں۔ وہ کب یہ گوارا کر سکتے تھے
کہ التوا میں ڈالے رہیں، اور جب دلی جائیں تو مرتب فرمائیں، یہ بعید از قیاس ہے۔
لغرض کتب ملفوظات کو مرتب کرنے کا دستور قدیم سے ہے، اس کا تعلق ذوق و ارادت
سے ہے، نشر و اشاعت سے نہیں۔ صوفیائے کرام مستثنیٰ حالات کے سوا ایسے امور میں

محتاط رہتے تھے، جو نام و نمود کا سبب ہوں، غالباً یہی سبب تھا کہ حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات جو حضرت محبوب الٰہیؒ نے مرتب فرمائے تھے، مدت مدید تک آپ کے پاس محفوظ رہے۔ مگر ان کے رسمی نشر و اشاعت کی طرف آپ متوجہ نہیں ہوئے۔ آج کس سے یہ بات بن پڑتی ہے، اس زمانہ میں ایسا صبر و ضبط عنقا ہے،

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے شیخ محترم کے ملفوظات کو کچھ اس طرح مرتب فرمایا ہے کہ دیرینہ افواہات کے باوجود اس میں حضرت باباصاحبؒ کی معجز بیانی کی آب و تاب جابجا جلوہ ریز ہے، جو مطالعہ کرنے والے کے دامن دل کو پکڑ لیتی ہے۔ اسلوب بیان دیگر کتبِ ملفوظات سے مختلف سادہ و سلیس اور جاذب توجہ ہے، یہ اسی اخلاص کا پرتو ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کو حضرت باباصاحبؒ کی جناب میں تھا، شیخ محترم کا ایسا متوالا کوئی دوسرا نہیں ملتا۔

غرض کہ کسی پہلو سے جائزہ لیجئے ملفوظات اور ان کی تدوین کی اہمیت روز روشن کی طرح جگمگاتی نظر آئے گی۔

تدوین ملفوظات کے باب میں یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے کہ کتب ملفوظات کو مرتب کرنے والے کتنے ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہوں۔ مگر وہ راہ سلوک میں مبتدی ہوتے تھے، وہ خیالات کو ہوبہو گرفت میں لانے کی سعی کرتے ہوں گے مگر کیا ضروری ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوتے ہوں، مشاہدہ شاہد ہے کہ مقرر جتنا سحربیان ہوتا ہے تقریر جس قدر جامع اور دلپذیر ہوتی ہے، اتنا ہی اس کا ہوبہو اور لفظ بلفظ گرفت میں آنا دشوار ہوتا ہے، ذہن و فہم اور علمی استعداد کے علاوہ مشق و مہارت اور کمال انشاپردازی کو بھی اس میں بڑا دخل ہے، تاوقتیکہ قلم و زبان پر قدرت نہ ہو اس فرض سے عہدہ برآ ہونا

ے وارد ہے۔ کہتے ہیں وہ مجموعۂ ملفوظات جنھیں قدامت کی سند حاصل ہے، بہت سے
پید ہوگئے ہیں، کچھ ہیں جو اہمیت کہ مسمیٰ ندارد کی مصداق ہیں۔ البتہ جن میں خلوص اور
ال فن کا پرتو ہے، وہ ہیں مگر عقیدت مندوں کی بے اعتنائی سے ہدف تنقید بنے
ے ہیں ع قیاس کن زخزان من بہار مرا۔

ریر و تحریر | تقریر و تحریر کے اسلوب میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے، اہل علم اس نکتہ
ے آگاہ ہیں کہ حشو و زوائد اور اعادہ و تکرار تقریر میں کھپ جاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات
ن سے تقریر میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ادنیٰ سے تصرف سے تقریر دلوں کو موہ لیتی ہے۔
قرر کا اسلوب اختصاصی شے ہے، جو مجمع کے مزاج کے مطابق ہوتا ہے، دوران تقریر
قرر کی وجدانی کیفیت غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتی، اور مجمع کو مسخر کر لیتی ہے۔ جو
ناطہ تحریر میں سما نہیں سکتی۔ مجمع جب جوش و خروش اور جذبے سے معمور ہوتا ہے،
خطیب و مقرر کے الفاظ اور حرکات و سکنات اور چشم و ابرو بھی کچھ کہنے لگتے ہیں، اور ایسے
ذبات و کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں، جو انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے، وہ پیکر اپنا
مل بن جاتے ہیں، لیکن قلم عاجز رہتا ہے، ان کیفیات کو گرفت میں لانے سے وہ تعدیۂ
ثر کا ثمرہ ہوتی ہیں، الفاظ کے پیکر بے جان ہیں ان کی تلاش سعیِ لاحاصل ہے، نظامی گنجوی
ے کلام سے اس کی تائید ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

گفت و من بشنودم ہر آنچہ گفتن داشت — کہ در بیان نگنجش کرد بےزباں تقدیم
لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت — فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

اس نے نہیں کہا مگر جو کچھ اسے کہنا تھا، وہ میں نے سن لیا سمجھ لیا۔ دوران تقریر
میں اس کی نگاہ نے زبان کھلنے سے پہلے ہی مجھ سے کہہ دیا تھا، جب ہونٹوں نے

نگاہ سے اپنی بازی لی اور زبان سے بات نکلی تو ایسا لگتا تھا کہ قوتِ سامعہ بلکہ دل و دماغ کوثر و تسنیم کی لہروں میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔

ماہرین نفسیات اس پر متفق ہیں کہ تقریر اپنے مناسب ماحول میں جس قدر مؤثر اور دلپذیر ہوتی ہے، اس کے غیر میں نہیں ہوتی خصوصاً وہ تقریر جس میں سامعین کی کامل توجہ اور مقرر کے اسلوب کی کارفرمائی اور تعدیۂ اثر کو دخل ہوتا ہے، بے پناہ اور ہر گرفت سے بالاتر ہوتی ہے، جس کا راز اس کے اشارات و اجمال میں مضمر ہوتا ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے :-

كَلَامُنَا اِشَارَةٌ فَاِذَا	ہمارا کلام اشاروں میں ہے جب
صَارَ عِبَارَةً صَارَ جَفَا۔	وہ عبارت کے روپ میں آتا ہے تو
	خشک ہو جاتا ہے۔

گویا وہ لطافت جو تقریر میں ہوتی ہے، تحریر میں برقرار نہیں رہتی، یہ بہت بلیغ اشارہ ہے۔ اور یہ وہی شخص کہہ سکتا ہے، جو تقریر کی نفسیات سے کما حقہٗ آگاہ ہے، لہٰذا کسی مجموعۂ ملفوظات میں تقریر کے مینہ موثرات کی تلاش بے سود ہے۔ ملفوظات کا وصف یہ ہے کہ صدہا سال گزر جانے کے باوجود اور عقیدت مندوں کی بے اعتنائی کے باوجود طبائع ان سے متاثر اور کیف اندوز ہوتی ہیں۔ مرزا غالب کا یہ کہنا بھی بجا و درست ہے ؎

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

وہ دل و دماغ جو مبتلائے مادیت ہیں۔ وہ روحانی فضا سے کوسوں دور ہیں انہیں بعد المشرقین ہے۔ ان سے چشم امید بے سود ہے، یہ بھی اس باب میں ایک اہم نکتہ ہے۔

کہ بعض تقریروں کے بعض جملے ایسے سحر آگیں ہوتے ہیں جو سالہا سال بلکہ صدیوں تک محفوظ رہتے ہیں، اور سننے والوں پر جادو کا سا اثر کرتے ہیں۔ انہیں مستثنیات میں سمجھنا چاہئے۔ تقاریر جو شائع ہوتی ہیں، جو راز درون پردہ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں۔ وہ بعینہٖ ہی اسٹیج کی آواز نہیں ہوتیں، بلکہ انہیں حک و اصلاح سے تحریر کے سانچے سے ڈھالا جاتا ہے، البتہ انداز تخاطب کی رعایت محفوظ رہتی ہے، فوائد الفواد میں بعدازاں فرمود، گفتے اور آن گاہ فرمود کی پیوندکاری بھی اسی کی مؤید ہے، الغرض، تقریر اور مجامع کی کیفیات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے روح الاجتماع کا مطالعہ سودمند ہے، جو فرانسیسی ماہر نفسیات موسیو لیبان کی مشہور تصنیف کراؤڈ کا ترجمہ ہے، اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوتا رہا ہے۔

فوائد الفواد کا کمال فوائد الفواد حضرت محبوب الٰہیؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو خواجہ امیر حسن علاء سجزی نے مرتب فرمایا تھا، اس میں بقول امیر خورد کرمانیؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کے اسلوب کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے: "عین تقریر سلطان المشائخ بقدر امکان رعایت کردہ" (ص ۳۰۸) اس میں بقدر امکان قابل لحاظ ہے، کیونکہ مولف نے جابجا بعدازاں فرمود۔ آن گاہ فرمود اور گفتے کا سہارا لیکر عبارت کو مربوط کیا ہے، اور بقول مولانا ضیاء الدین برنی وہ اسی عہد سے مقبول و مروج ہے، جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں ہم تک محفوظ نہیں پہنچ سکا ہے، کہیں تاریخ دن اور مہینہ ہے، بیان ندارد (ص ۱۹۹) کہیں دن اور تاریخ میں مطابقت نہیں ہے کہیں دن ندارد ہے تو کہیں تاریخ ندارد۔ متن میں بھی خاصا کچھ خلفشار ہے۔ یہ حال ہے اس مجموعۂ ملفوظات کا جو متداول چلا آتا ہے۔ اوروں کا تو ذکر ہی کیا۔

خواجہ امیر حسن علاء سجزی نامور شاعر و ادیب کہنہ مشق انشاء پرداز اور باکمال

اہل قلم تھے، انھوں نے ۳ شوال ۷۰۷ھ کی مجلس میں حضرت محبوب الٰہیؒ سے عرض کیا تھا،

از سالے زیادہ باشد کہ در بندگی پیوستہ ام۔ ف (ص ۳۰)

اس بیان سے یہ واضح ہے کہ خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ ۶۹۰ھ میں بیعت ہوئے تھے، مولانا حامد جمالی کا بیان ہے کہ بیعت ہونے کے وقت خواجہ امیر حسن علا سجزی کی عمر [illegible] برس کی تھی[1] (سیر العارفین ص ۸۰) گویا کہ خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ پختہ کار اہل قلم تھے۔ انھوں نے فوائد الفواد کو بڑی خوبی سے مرتب کیا۔ ان کے اخلاص اور خون جگر کی چاشنی لفظا لفظا سے مترشح ہے۔ انھوں نے دیدہ ریزی اور باریک بینی سے کام لیا۔ خون پسینہ ایک کیا۔ نوک پلک کو سنوارا۔ اور بیان کو اس خوبی سے مرتب کیا کہ تقریر کا اسلوب بھی برقرار رہا ہے، اور حشو و زوائد اور اعادہ و تکرار کی پرچھائیں بھی پڑنے نہ پائی جو تقریر کے لوازم میں سے ہے۔

خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ نے غالباً اس کام کے لیے اپنے کو فارغ بلکہ وقف کر لیا تھا، ان کا یہ شاہکار ہو نہ سے بڑا بول رہا ہے کہ آخری ایام حیات کا ان کے لیے یہی دلچسپ مشغلہ تھا جس میں وہ ہمہ تن مشغول رہتے تھے، اس لیے فوائد الفواد کو مقبولیت بھی نصیب ہوئی، اور حیات جاویدہ بھی، غالباً ان ہی اثرات سے متاثر ہو کر خواجہ سید محمد حسینی گیسو درازؒ کو یہ کہنا پڑا تھا۔

ملفوظ شیخ نظام الدین کہ امیر حسن	حضرت محبوب الٰہیؒ کے ملفوظات
شاعر جمع کردہ است آں معتبر است	جو امیر حسن شاعر نے جمع کیے ہیں، وہ
و ملفوظ ہائے دیگر از ان شیخ بنشستہ	معتبر ہیں، اور جو دوسرے ملفوظات
اند ہمہ باد ہوا است۔	آپ کے لکھے ہیں، وہ سب باد ہوا
	ہیں (سعی طلب کا ثمرہ ہیں یا خواہش
	بے جا کا نتیجہ ہے)

---

[1] معارف۔ یہ بات تحقیق طلب ہے۔

[illegible] ساتھ ہی میں ان [illegible]

اسنیخ کی آمرت گیسو دراز اپنے مرشد کے دو [illegible] ب الی کے نیاز مندوں کیلئے ا۔

الفاظ کس طرح استعمال کر سکتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ نقل در نقل میں کچھ کا کچھ ہو گیا۔ ۴

یہ کلام خود رائی اور بے اعتنائی کا آئینہ لگتا ہے، اس میں نہ تحقیق ہے نہ کیف، نہ صوفیہ کے کلام کی سی لذت و انکسار ہے، حضرت گیسو دراز تو بڑی چیز ہیں کسی معمولی اہل دل سے بھی ایسے کلام کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے، اس میں ایسا کچھ ہے، جو ذوق کو گراں گزرتا ہے، مثلاً۔

(۱) حضرت محبوب الٰہیؒ کو شیخ نظام الدین سے یاد کیا ہے، اس کے برعکس ان کے پیرو مرشد مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے جب کبھی یاد فرمایا ہے، نہایت احترام سے یاد فرمایا ہے، حتیٰ کہ مطالعہ کرنے والے تک سر تسلیم جھکائے بغیر نہیں رہ سکتے، مگر خواجہ گیسو درازؒ کا بیان اس وصف سے معرا ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی معمولی شخص کا ذکر کر رہے ہیں۔

(۲) خواجہ امیر حسن علا سجزی کوئی ایسے ویسے شاعر نہیں تھے، یگانۂ روزگار اور بے مثل شاعر گزرے ہیں، حضرت امیر خسروؒ جیسے باکمال انھیں برادرم امیر حسن کہہ کر یاد کرتے تھے، راج دربار میں انھیں وقار حاصل تھا، درویشی میں بھی آپ اپنی مثال تھے، خواجہ گیسو درازؒ کے پیرو مرشد مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے برادر طریقت اور بے تکلف دوست تھے، حضرت محبوب الٰہیؒ کے نیاز مند، مخلص اور یار اور اعلیٰ ہمت تھے، اور وہ ایسی کتاب کے مؤلف و جامع ہیں جو یادگار زمانہ ہے، اور آج تک مشعل راہ ہے، خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ ہر اعتبار سے لائق احترام ہیں، ایسے شخص کو امیر حسن شاعر کہہ دینا کہاں تک روا ہے۔

...ذاتی تصرف اس کی کہاں تک اجازت دیتا ہے۔

(۳) علت وسبب بتائے بغیر یہ حکم لگانا کہ یہ بادہواست کہاں تک معقولیت پر مبنی ہو سکتا ہے ذاتی تصرف اسے کہاں تک برداشت کرتا ہے، حضرت امیر خسروؒ ایک اہم دو مجموعۂ ملفوظات کے مولف ہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ کے نوعمری کے ساتھی (ص ۱۰۰) حضرت محبوب الٰہیؒ کو جان سے زیادہ عزیز (۳۰۲) اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مخلص وجان نثار تھے، وہ بادشاہوں سے وابستہ تھے، مگر شہنشاہ دین پر قربان تھے، وہ سر دے سکتے تھے، اپنے حضرت سے راز مخفی نہیں رکھ سکتے تھے، درویشی میں ان کا مقام اللہ اکبر، کون بتا سکتا ہے کہ کیا ہے۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق ؛ ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

ان پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، کہ زندگی کا کوئی گوشہ چھپا یا نہیں، آپ کی پوری زندگی نظروں کے سامنے ہے، کوئی کہہ سکتا ہے کہ بادہوا کا کوئی جھونکا انھیں چھو کر نکلا ہے، اگر ایسے ایسے بادہوا کی لپیٹ میں آگئے تو۔ اے وائے برحال ما شما شیخ سعدیؒ علیہ الرحمۃ نے خوب فرمایا ہے ؎

گر نظر صدق را نام گنہ می نہی ؛ حاصل ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن

ملفوظات کا شمار عبادتِ متعدی میں ہے، لازم میں نہیں۔ اس کے لیے اخلاص بھی درکار نہیں پھر بادہوا اور خواہشاتِ دلی کا تموج کیا لگا رہ سکتا ہے، اور بادہوا کا اطلاق ان پر کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ محل نہ تنقید کا مقتضی ہے نہ تفصیل کا۔ بسبیل تذکرہ کچھ باتیں زبان قلم پر آگئی ہیں بلا شبہ آئندہ کا نقاد جب خواجہ گیسو درازؒ کے اسلوب و بیان کا

اس ارشاد کا مدعا بظاہر تو یہی ہے، کہ خواجہ امیر حسن علا سجزی نے جتنے ذوق و شغف
جانسوزی سے فوائد الفواد کو مرتب فرمایا ہے انکے معاصر اہلِ قلم اس باب میں ان کے ہم مرتبہ
ہیں، بلکہ انھیں ان سب پر فوقیت حاصل ہے، مگر اسلوب بیان نظرِ عقیدت میں کھٹکتا
حضرت گیسو درازؒ اپنے مرشد کے دوستوں اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے نیاز مندوں کیلئے ایسے
ناظ کس طرح استعمال کر سکتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ نقل در نقل میں کچھ کا کچھ ہو گیا۔
لام خودرائی اور بے اعتنائی کا آئینہ لگتا ہے، اس میں نہ تحقیق ہے نہ کیف، نہ صوفیہ کے کلام
سی لذت و انکسار ہے، حضرت گیسو دراز تو بڑی چیز ہیں کسی معمولی اہلِ دل سے بھی ایسے کلام کی
ع نہیں کی جا سکتی ہے، اس میں ایسا کچھ ہے، جو ذوق کو گراں گزرتا ہے، مثلاً۔
(۱) حضرت محبوب الٰہیؒ کو شیخ نظام الدین سے یاد کیا ہے، اس کے برعکس ان کے
مرشد مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے جب کبھی یاد فرمایا ہے، نہایت احترام سے یاد فرمایا
حتیٰ کہ مطالعہ کرنے والے تک سرِ تسلیم جھکائے بغیر نہیں رہ سکتے، مگر خواجہ گیسو درازؒ کا
ن اس وصف سے معرا ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی معمولی شخص کا ذکر کر رہے ہیں،
(۲) خواجہ امیر حسن علا سجزی کوئی ایسے ویسے شاعر نہیں تھے، یکتائے روزگار اور
ل شاعر گزرے ہیں، حضرت امیر خسروؒ جیسے باکمال انھیں برادرم امیر حسن کہہ کر
تے تھے، راج دربار میں انھیں وقار حاصل تھا، درویشی میں بھی آپ اپنی مثال تھے،
گیسو درازؒ کے پیر و مرشد مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے برادرِ طریقت اور بے تکلف دوست
حضرت محبوب الٰہیؒ کے نیاز مند، مخلص اور یارانِ اعلیٰ میں سے تھے، اور وہ ایسی کتاب کے
ن و جامع ہیں جو یادگارِ زمانہ ہے، اور آج تک مشعلِ راہ ہے، خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ
نہار سے لائقِ احترام ہیں، ایسے شخص کو امیر حسن شاعر کہہ دینا کہاں تک روا ہے۔

اسلام اور مذاقِ تصوف اس کی کہاں تک اجازت دیتا ہے۔

(۳) علت وسبب بتائے بغیر یہ حکم لگانا کہ یہ ہوا و ہواست کہاں تک معقولیت پر مبنی ہو سکتا ہے
مذاقِ تصوف اسے کہاں تک برداشت کرتا ہے، حضرت امیر خسروؒ ایک نہیں دو مجموعۂ ملفوظات
کے مولف ہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ کے نو عمری کے ساتھی (ص ۱۰۰) حضرت محبوب الٰہیؒ
کو جان سے زیادہ عزیز (۳۰۲) اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مخلص وجان نثار تھے، وہ
بادشاہوں سے وابستہ تھے، مگر شہنشاہ دین پر قربان تھے، وہ سر دے سکتے تھے، اپنے
حضرت سے راز مخفی نہیں رکھ سکتے تھے، درویشی میں ان کا مقام اللہ اکبر، کون بتا سکتا ہے
کہ کیا ہے۔

درکفے جامِ شریعت درکفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نہ داند جام وسندان باختن

ان پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، کہ زندگی کا کوئی گوشہ چھپا ہوا نہیں، آپ کی
پوری زندگی نظروں کے سامنے ہے، کوئی کہہ سکتا ہے کہ بادِ ہوا کا کوئی جھونکا انھیں
چھو کر نکلا ہے، اگر ایسے ایسے بادِ ہوا کی لپیٹ میں آگئے تو۔ اے وائے بر حالِ ما شما
شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے خوب فرمایا ہے ؎

گر نظر صدق را نام گنہ می نہی حاصل ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن

ملفوظات کا شمار عبادتِ متعدی میں ہے، لازم میں نہیں۔ اس کے لیے اخلاص
بھی درکار نہیں پھر بادِ ہوا اور خواہشاتِ دلی کا توجہ کیا لگا رکھتا ہے، اور بادِ ہوا
کا اطلاق ان پر کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ محل نہ تنقید کا مقتضی ہے نہ تفصیل کا۔ بسبیل تذکرہ کچھ باتیں زبانِ قلم
پر آگئی ہیں بلا شبہ آئندہ کا نقاد جب خواجہ گیسو درازؒ کے اسلوب و بیان کا

تجزیہ کرے گا تو اسے تکلف ہوگا یہ تسلیم کرنے میں کہ یہ جملے خواجۂ موصوف ہی کے فرمودہ ہیں، اور صحت کے ساتھ منقول ہوتے رہے ہیں۔ یہاں تو صرف اتنا کہنا ہے کہ فوائد الفواد میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے اسلوب کو سنبھالے رکھنے میں خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ کے کمال فن کو بڑا دخل ہے، ورنہ تقریر کے ضبط تحریر میں آنے کے بعد اثرات وکیفیات کا برقرار رہنا کارے دارد ہے، اور ایسی توقع بے حاصل ہے۔ یہ بھی حادثہ ہے کہ کتاب فوائد الفواد بھی ہم تک محفوظ نہیں پہنچی ہے۔

۷۔ **قلمی کتابیں** | قلمی کتابوں کو ان کی قدامت کے اعتبار سے بلکہ گوناگوں اوصاف کی بنا پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور وہ فی الواقع ہوتی بھی ہیں لائق قدر، لیکن صحت کے اعتبار سے ان میں وہ خوبی نہیں ہوتی، جو مطبوعات کا وصف ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ صحت کا جو اہتمام مطبوعہ کتب کے لیے ہوتا ہے، اور ہو سکتا ہے، وہ قلمی کتب کے لیے ناممکن نہیں تو دشوار تر ضرور ہے۔ یہی سبب ہے کہ قلمی کتابیں جو متعدد نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد شایع کی جاتی ہیں۔ ان میں حواشی ہوتے ہیں، جو اختلاف نسخ کی نشان دہی کرتے ہیں، بعض جملے جو لکھنے سے کسی نسخے میں رہ جاتے ہیں، اور عبارت بے ربط ہو جاتی ہے، ان کا پتہ چل جاتا ہے، اور خامی رفع ہو جاتی ہے، اسی طرح الحاقی عبارتوں کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک کتب ملفوظات میں سے خیر المجالس کے سوا کوئی کتاب صحت و مقابلہ سے مرتب ہو کر شائع نہیں ہوئی ہے۔ اور یہ بات عقیدت مندوں کے لیے سخت لائق ندامت ہے۔ فوائد الفواد بھی صحت و مقابلہ کی محتاج ہے، جسے بہت اہم مانا جاتا ہے۔

اختلاف نسخ | قلمی کتابوں کے مختلف نسخوں میں جو اختلاف پائے جاتے ہیں ان کے اسباب

مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً :۔

(۱) کوئی لفظ یا جملہ کاتب سے نقل کرنے میں رہ گیا۔ جب کسی نے پڑھا تو منقول عنہ موجود نہ ہونے کی صورت میں خود ہی مناسب سا کوئی لفظ لکھ دیا۔ یا یوں ہی رہنے دیا۔ بہر حال جو بھی تھا نقل در نقل ہوتا رہا۔ مگر اصل سے مختلف ہوگیا۔

(۲) امتداد زمانہ کے ہاتھوں کچھ عبارت مٹ گئی۔ اور قابلِ خواندگی نہ رہی۔ ایسی صورت میں یا توکسی نے اپنے صواب دید سے اس خلا کو پُر کردیا۔ یا وہ یوں ہی نقل در نقل ہوتا رہا۔ جس سے مفہوم اصلی تک رسائی مشکل ہوگئی۔ نایابی کی صورت میں اسی کو غنیمت سمجھ لیا۔ اور بات کچھ سے کچھ ہوگئی ایسے تغیر و تبدل سے اختلافِ نسخ لاحق ہوتا ہے، جو صحت و مقابلے سے بہت کچھ رفع ہوسکتا ہے۔

(۳) یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اوراق اس قدر از کار رفتہ اور کرم خوردہ ہوجاتے ہیں کہ انھیں شامل رکھنا مزید ضرر کا باعث ہوتا ہے۔ لامحالہ انھیں نکالنا اور نظر انداز کرنا پڑتا ہے، اگر کتاب نایاب یا کمیاب ہے تو اسی ناقص الحال پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، جو کچھ محفوظ ہوسکتا ہے، محفوظ کرلیا جاتا ہے، میرے پاس بھی قلمی کتابوں کے کچھ اوراق ہیں، جو میں نے محفوظ کر لیے ہیں۔

یہ اور اس قسم کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ جن سے ناقص نسخے رواج پانے لگتے ہیں جو تبرکاً نقل در نقل ہوتے رہتے ہیں اور اصل سے مختلف ہوجاتے ہیں۔ مگر ان پر بھی جعلی ہونے کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے امام ابوعبدالرحمٰن محمد سلمیؒ نیشاپوری کی مشہور کتاب طبقاتِ صوفیہ کے متعلق لکھا ہے۔

تصحیف و تحریف نویسندگان بجائے لکھنے والوں کی تصحیف و تحریف

رسیدہ کہ دریسیاری از مواضع فہم مقصود بسہولت دست نمی داد (نفحات الانس ص ۳)

اتنی بڑھ گئی کہ بہت سے مقامات کا یا عبارتوں کا مقصد بسہولت گرفت میں نہیں آتا۔

یہی حال مروجہ کتب ملفوظات کا ہے۔ مولانا جامی علیہ الرحمۃ نے اسی دشواری سے چھٹکارا پانے کے لیے نفحات الانس لکھی تھی جو اضافہ معلومات کے ساتھ طبقاتِ صوفیہ پر مبنی ہو۔ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں قلمی نسخوں کی حالت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، پھر بھی انھیں غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ مشائخِ چشت کے ملفوظات کی بھی یہی کیفیت ہے۔ افضل الفوائد تالیف حضرت امیر خسروؒ کے ناشر کا بیان ہے:

چوں کہ کتاب منقول عنہ قلمی بسیار غلط بود۔ و از آخر یک ورق چناں کرم خوردہ بود کہ درخواندن نمی آید۔ لہذا کتاب موصوف دریں جاتمام کردہ شد۔ نیز درصحت ہم کوشش تام کردہ اید۔ (افضل الفوائد ص ۱۹۷ حاشیہ مطبع رضوی دہلی ۱۳۰۵ھ)

ایسا لگتا ہے کہ فوائد الفواد کو بھی ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جلد چہارم کی ۲۵ویں مجلس کا آغاز چہارشنبہ ۲۲ ماہ مذکور سے ہوا ہے، مگر یہی آغاز اور یہی انجام ہے، اور کچھ بھی نہیں ہے، (ص ۱۶۶) بیان غالباً ضائع ہو گیا، مگر ناشر نے کچھ نہیں بتایا۔

(۲) افضل الفوائد کے ناشر سید امیر حسن دہلوی مرحوم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ نسخہ جس سے مطبوعہ نسخہ منقول ہے، اغلاط سے بھرا ہوا تھا، ناشر نے ان اغلاط کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہیں۔ اور ان کی اصلاح کہاں تک اصل کے مطابق ہے۔

(۳) ناشر کی اصلاحی کوشش کے باوجود یہ نسخہ بھی اغلاط سے پاک نہیں، ان کے

علاوہ کہیں کہیں عبارت بے ربط ہے۔ تاہم ناظرہ لائق شکریہ ہیں، کہ انھوں نے کمیاب نسخہ فراہم کیا۔ اور ان کی اس سعی جمیل کے بدولت ہمیں بھی استفادہ کی سعادت نصیب ہوئی۔

اللہ پاک اجر عظیم عنایت فرمائیں۔

۷۔ تاریخی خلفشار ملفوظات کے نسخوں میں عموماً سنین اور تاریخیں۔ مہینے اور دن ایسے ملتے ہیں جو تقویم کے مطابق نہیں ہیں، یہ نقص کسی ایک میں نہیں سب ہی میں پایا جاتا ہے، حتیٰ کہ مشہور کتبِ تاریخ میں بھی یہ نقص ہے۔ مولانا ضیاء الدین برنی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ فیروز شاہی کے سنین کی سر سید مرحوم نے تصحیح فرمائی تھی۔ جو مطبوعہ کلکتہ کے حواشی میں موجود ہے، تاریخ فرشتہ نہایت متداول ہے، وہ بھی اس نقص سے مبرا نہیں، حضرت بابا صاحبؒ کا سنہ وفات فرشتہ مطبوعہ نولکشور میں ۶۰ ، ھ لکھا ہے، قلمی نسخوں میں اس سے مختلف بھی ہے۔ یہ عام دبا ہے، اس کی بنا پر کس کس کتاب کو جعلی بتایا جاسکتا ہے، یہ صحیح ہے کہ تاریخی غلط اندراجات سے ملفوظات کے اعتماد کو نقصان پہنچتا ہو گا، نقطۂ نظر رکھنے والوں کو تعجب ہوتی ہے ان ملفوظات میں تاریخ اور سنہ کے کچھ اندراج ملاحظہ ہوں۔

(۱) دن ہے مہینہ ہے سنہ ہے۔ تاریخ ندارد (فوائد ص ۱۵۲-۳۳۵)

(۲) دن۔ تاریخ مہینہ ہے، سنہ ندارد بیان مجلس ندارد (فوائد ص ۱۶۴)

(۳) ایک ہی تاریخ دو مجلسوں میں ہے مگر دن مختلف ہیں۔ (فوائد ۱۰۶ - ۱۰۸)

(۴) ۲۳ رمضان کی مجلس پہلے ہے، ۱۰ رمضان کی بعد میں۔ دن مہینہ اور سنہ ایک ہی ہے۔ (فوائد ص ۲، ۲ - ۲۹)

(۵) ۲۰ شوال پہلے ہے اور ۸ شوال بعد میں ہے، دن مختلف ہیں۔ (فوائد ص ۳۴۳)

(۶) دن ہے سنہ ہے نہ مہینہ نہ تاریخ،

(۷) دن مہینہ اور سنہ ہے۔ تاریخ ندارد

(۸) دن تاریخ مہینہ ہے سنہ ندارد

(۹) دن غلط۔ دن ہے نہ تاریخ نہ مہینہ نہ سنہ

(۱۰) دن تاریخ مہینہ سنہ سب کچھ ہے۔ مگر سب غلط۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ اس کا سبب کیا ہے؟ بظاہر تو سبب وہی ہے، جس کا ذکر ہو چکا ہے کہ کتابت کی غلطیاں اور دیرینہ روزی کے اثرات۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیر الاولیاء (صفحہ ۱۹ سطر ۲ تا ۹) کی الحاقی عبارت کو کسی نے معتبر مان کر ترمیم کر لی ہو۔ بہرحال تا وقتیکہ صحت و مقابلہ سے ملفوظات مرتب ہو کر شائع نہ ہوں، کسی کو اصل سبب قرار دینا قبل از وقت ہوگا۔

یہ واقعہ ہے کہ جب مسلمانوں پر کوئی نازک وقت پڑا ہے تو تصوف ہی نے دستگیری کی ہے، درگرتوں کو سنبھالا ہے، جو مخالفینِ اسلام اس رمز سے آگاہ ہیں، وہ طرح طرح سے صوفیانہ خیالات کی بیخ کنی کے درپے رہے ہیں، بظاہر کوئی تنظیم نہیں ہے بلکہ یہ راز درون پردہ ہے، آج کل ہند و پاک میں ملفوظات کے خلاف جو یورش بپا ہے، ممکن ہے اس کے پس پشت بھی یہی جذبہ کارفرما ہو۔ آیندہ کا مورخ بتائے گا کہ راز درونِ پردہ کیا ہے۔

میرے نزدیک اس گران قدر تہذیبی اور روحانی سرمایہ کے تحفظ کی کارگر تدبیر یہی ہے کہ کتبِ ملفوظات کو کمال صحت سے مرتب کر کے شایع کیا جائے، اور ان کے تراجم بھی مختلف السنہ میں شائع کیے جائیں، وہ عقیدت مند جو اولیاء اللہ سے عقیدت رکھتے ہیں اور زرِ کثیر صرف کرتے رہتے ہیں، اور اہل علم و بصیرت اگر متوجہ ہو جائیں تو یہ مشکل ...

آسان ہو جائے۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ ملفوظات کے خلاف جو ہنگامہ بپا ہے وہ اگرچہ بادر ہوا ہی سہی لیکن تدارک ضروری ہے۔

ع کہہ دیا اخلاق نے کہنا جو تھا المختصر

۸۔ نقد و تنقید | نقد و تنقید کا حق ادا نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ کتب ملفوظات صحت و مقابلہ سے مدون ہو کر سامنے نہ آئیں۔ تنقید نگار کو اپنے موضوع سے ہمدردی اور دلچسپی ہونی چاہیے۔ محض تخریبی نقطۂ نظر سے لکھنا تنقید نہیں تنقیص ہے، جانب داری سے حق تنقید ادا نہیں ہوتا، کتب ملفوظات سے متعلق جو تنقیدیں بروئے کار آئی ہیں، ان میں اصول نقد و تنقید کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ تنقید نگاروں سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں، تاہم ان سے استفادہ کرنا چاہیئے کہ ان کی بدولت اصلاح حال کا رجحان بروئے کار آیا ہو۔

حاصل ہوئی آگاہی عشرت گہہ باطل سے
ہم شمع اٹھا لائے سوئی ہوئی محفل سے

خدا کرے کہ اس رجحان کو عملی صورت میں آنا نصیب ہو۔

۹۔ عادتِ الٰہیہ | ملفوظات کے مطالعہ کے دوران یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ عادتِ الٰہیہ یہ ہے کہ جس قوم و ملک کی حالت اس کی مقتضی ہوتی کہ ان میں کسی نبی کی بعثت ہو، تو نبی محترم کو ان اوصاف سے بالاتر اوصاف سے متصف فرما کر مبعوث فرمایا ہے، جن سے اس عہد کے ممتاز ترین اشخاص متصف تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کو ساحری اور جادوگری کے عہد میں مبعوث فرمایا تو ید بیضا اور عصائے موسیٰ کا ایسا معجزہ عنایت فرمایا۔ جس کے مقابلے میں ساحری ہیچ ہو کر رہ گئی۔ اور ساحروں کی ہوا اکھڑ گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام طب و حکمت کے عہد عروج میں مبعوث ہوئے،

انھیں اس معجزے سے نوازا کہ وہ بحکم الٰہی اندھوں کو بینائی عطا فرماتے، کوڑھیوں کو شفا عنایت فرماتے اور مردوں کو قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ کہہ کر زندہ کر دیتے تھے۔ ان کے سامنے اس عہد کے حاذق اطباء اور خواص الادویہ کے ماہر سپر انداز ہو گئے۔

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام پاک کا معجزہ عطا ہوا تھا، جس کے آگے فصحائے عرب عاجز و حیران تھے۔ جو اپنی شیوا بیانی کے مقابلے میں تمام عالم کو گونگا جانتے تھے، ان کو اعتراف کرنا پڑا۔ لیس ھذا بکلام البشر یہ کلام تو اس پایہ کا ہے کہ انسانی کلام اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔

اولیاء اللہ جو علوم ظاہری و باطنی سے مالا مال اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب و جانشین ہوتے ہیں اور انبیاے بنی اسرائیل کے مثل ہوتے ہیں، جب انھیں کسی قوم کی خدمت تفویض ہوتی ہے، تو انھیں بھی ان اوصاف سے نوازا جاتا ہے جو اس قوم کے ممتاز ترین اشخاص کے اوصاف سے بالاتر ہوتے ہیں

خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ہندوستانی قوم کی خدمت تفویض ہوئی اور آپ ہندوستان تشریف لائے۔ تو اس عہد میں ہندوستانی اذہان، جوگیوں اور سنیاسیوں کے دام میں جکڑے ہوئے تھے، جو فن ساحری میں کمال رکھتے تھے۔ جیپال جوگی اور شادی دیو سنیاسی سر فہرست تھے، انھوں نے خواجۂ بزرگؒ کو ناکام کرنے کے لیے جیسے جیسے جتن کیے وہ شہرۂ آفاق ہیں۔ آخر کار ناکام ہوئے، اور خواجۂ بزرگ کی غلامی میں پناہ لی۔

بزرگانِ چشتؒ جنھوں نے اس عہد میں اور اس کے بعد تقریباً ایک صدی تک ہندوستان میں رشد و ہدایت کی شمع روشن رکھی اور مخلوق کی خدمات انجام دیں، انھیں ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا، ان کے ملفوظات میں خرق عادت کا ہونا تعجب خیز نہیں بلکہ نہ ہونا حیرت انگیز ہو۔

انھیں نظر انداز کرکے کوئی مورخ و محقق اور نقاد نہ تو صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ نہ صحیح طور پر استفادہ کر سکتا ہے۔

۱۰۔ اخذ و اقتباس | قلمی کتب سے اور ان کے ایسے نسخوں سے جو صحت و مقابلہ کے ساتھ شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اخذ و اقتباس میں کامل شعور اور پوری احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصنف کے اسلوب اور اس کے رجحان سے کامل آگاہی درکار ہوتی ہے تاکہ ہر وہ عبارت جو مصنف کے رجحان اور اس کے اسلوب کے مطابق نہ ہو۔ ذوقِ سلیم کی گرفت میں آجائے۔ اور الحاق و تحریف نظر سے اوجھل نہ رہے۔ یہ وصف پیدا ہوتا ہے۔ مطالعہ کثیر اور مصنف کے اسلوب کی آگاہی سے۔ ذہن رسا اور نظر دوربین بھی درکار ہوتی ہے۔ اگر اخذ و اقتباس میں پوری احتیاط سے کام نہیں لیا جائے گا تو الحاق بھی مقتبس ہو جائیں گے۔ مذہبیات سے متعلق وہ کتابیں جن سے مختلف العقیدہ طبقات کو اختلاف رہا ہے، ان میں بھی الحاق و تحریف کا عمل ہو سکتا ہے۔ ایسے بھی ہوئے ہیں، جنھوں نے موضوع حدیثیں بنائی تھیں۔ محفوظ ترین کتاب صرف اللہ ہی کی کتاب ہے، جس کا وہ خود محافظ ہے۔ لہذا اخذ و اقتباس میں پوری احتیاط برتنی چاہیئے۔

۱۱۔ بیانِ واقعہ | یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ بیانِ واقعہ سے مراد واقعہ ہی نہیں ہوتا، بلکہ اکثر و بیشتر وہ نتائج اور تاثرات مراد ہوتے ہیں جو اس سے متعلق ہوتے ہیں۔ ماہر زبان داں اس نکتے سے خوب واقف ہیں۔ مثنوی مولانا رومؒ، منطق الطیر، اور گلستان و بوستان اس وصف سے مالامال ہیں، اس نکتے سے ناواقفیت واقعات کی تفہیم میں سخت مخل ہوتی ہے۔ ملفوظات میں بھی

[illegible] فرمایا ہے۔

اطباء اور خواص الادویہ کے عام قصوں سے یہ مقصود نہیں کہ ان واقعات سے آگاہی ہمارے حضور صلی اللہ مقصود یہ ہے کہ ان سے سننے والوں کے ذہن شرک اور معاصی کی برائی کی جانب منتقل ہو جائیں۔" (الفوز الکبیر ص ۲۲)

مطالعۂ ملفوظات کے دوران اس نکتے کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ورنہ ذہن واقعہ کی تہ تک پہنچ نہ سکے گا۔ اور مقصودِ اصلی حاصل نہ ہوگا۔

(باقی)

امیر خسروؔ کی صوفیانہ شاعری

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

امیر خسروؔ کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ عشق کے دلدادہ، شعر و سخن میں یار کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر، اور چشمِ یار کے سرشار رہے، مگر انھوں نے کسی صنفِ نازک کو اپنا معشوق نہیں بنایا، اُن کی پاکیزہ زندگی مجازی عشق سے بالکل پاک رہی، مجازی عشق کی آلودگی سے وہ مُبرا رہے، تو اُن کے عشق حقیقی میں تقدس پیدا ہو گیا، جو مختلف صورتوں میں تبدیل ہوتا رہا، اسی لئے جب اپنی شاعری میں عشق الٰہی کا اظہار کرتے ہیں، تو اس میں عارفانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے،

ان کا کوئی دیوان اور کوئی مثنوی حمد سے خالی نہیں، جن میں جہاں اُن کے شاعرانہ کمالات کا اظہار رہے، وہاں اُن کے روحانی جذبات اُن کے قلب کے اندر سے امنڈتے نظر آتے ہیں، اپنی پہلی مثنوی قران السعدین لکھی تو حمد سے اس کا آغاز کرتے ہوئے فخر سے کہتے ہیں،

شکر گویم کہ بتوفیقِ خداوند جہاں ۔۔۔ بر سرِ نامہ ز توحید نوشتم عنوان

توحید اُن کی ہر حمدیہ نظم کا موضوع رہا ہے، جس سے نہ صرف اُن کا جذبۂ ایمانی ظاہر ہے، بلکہ چشتیہ سلسلہ کا یہ مسلک بھی عیاں ہے کہ وہ راہ سلوک میں اس پر خاص طور

سے نوازا کہ وہ یکجا فرماتی ہے۔ اور دیگر علوم و فنون میں بھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

...م القرآن کے باب میں فرمایا ہے۔

"قصوں سے یہ مقصود نہیں کہ ان واقعات سے آگاہی ... بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان سے سننے والوں کے ذہن شرک اور معاصی کی برائی کی جانب منتقل ہو جائیں۔" (الفوز الکبیر ص ۲۲)

مطالعہ ملفوظات کے دوران اس نکتے کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ورنہ ذہن واقعہ کی تہ تک پہنچ نہ سکے گا۔ اور مقصودِ اصلی حاصل نہ ہوگا۔

(باقی)

بزم صوفیہ

بکثرت اضافوں کے ساتھ بزم صوفیہ کا دوسرا ضخیم ایڈیشن جس کے آخر میں آٹھویں صدی کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالحق توشہ ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تعلیمات و ملفوظات کا مستقل اضافہ ہے۔

اس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصنیف اکابر صوفیہ مثلاً شیخ علی ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، خواجہ گنج شکرؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، شیخ بو علی قلندرؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ، (کچھوچھہ) سید گیسو دراز وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات و تعلیمات و ارشادات پیش کیے گئے ہیں۔ جن کو پڑھ کر روح میں بالیدگی اور ایمان میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مرتبہ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت ۔ ۱۶/۵۰

امیر خسروؒ کی صُوفیانہ شاعری

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

(۲)

امیر خسروؒ کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ عشق کے دلدادہ، شعر و سخن میں یار کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر، اور چشمِ یار کے سرشار رہے، مگر انھوں نے کسی صنفِ نازک کو اپنا معشوق نہیں بنایا، اُن کی پاکیزہ زندگی مجازی عشق سے بالکل پاک رہی، مجازی عشق کی آلودگی سے وہ مُبرا رہے، تو اُن کے عشق حقیقی میں تقدس پیدا ہو گیا، جو مختلف صورتوں میں تبدیل ہوتا رہا، اسی لئے جب اپنی شاعری میں عشق الٰہی کا اظہار کرتے ہیں، تو اس میں عارفانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے،

ان کا کوئی دیوان اور کوئی مثنوی حمد سے خالی نہیں، جن میں جہاں اُن کے شاعرانہ کمالات کا اظہار ہے، وہاں اُن کے روحانی جذبات اُن کے قلب کے اندر سے امنڈتے نظر آتے ہیں، اپنی پہلی مثنوی قران السعدین لکھی تو حمد سے اس کا آغاز کرتے ہوئے فخر سے کہتے ہیں،

بر سرِ نامہ ز توحید نوشتم عنوان　　شکر گویم کہ بتوفیقِ خدا وند جہاں

توحید اُن کی ہر حمدیہ نظم کا موضوع رہا ہے، جس سے نہ صرف اُن کا جذبۂ ایمانی ظاہر ہے، بلکہ چشتیہ سلسلہ کا یہ مسلک بھی عیاں ہے کہ وہ راہ سلوک میں اس پر خاص طور

سے زور دیتے تھے، امیر خسرو اپنی مثنوی قران السعدین (ص ۱) میں یہ کہتے ہیں کہ

واجب اول بوجودِ قدم نے بوجودے کہ بود از عدم

یہ گویا سورۂ اخلاص کا خلاصہ ہے، یعنی خداوند تعالیٰ واجب ہے، قدیم ہے، اس کا وجود کسی وجود سے نہیں ہوا، اس شعر میں کلامی رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے، یعنی اگر اس کی ذات واجب اور قدیم ہے تو اس کی صفات بھی واجب اور قدیم ہیں، ہر حمد میں واجب الوجود اور قدیم بالذات کا مسئلہ ضرور زیر بحث لایا جاتا ہے، اس کے بعد اس کی ربوبیت کا ذکر ہوتا ہے، اس لئے امیر خسرو کہتے ہیں کہ اس کی ذات کی معرفت کے لئے کسی علت اور معلول کی ضرورت نہیں، وہ تحقیق کے ذریعہ سے نہیں معلوم کیا جا سکتا، اگر توفیق الٰہی حاصل ہے، تو اس کی ذات بھی معلوم ہو سکتی ہے، اس کی ذات میں وحدت ہے، البتہ اس کی صفات میں کثرت ہے، مگر اپنی تمام صفات کے تمام تغیرات کے امکانات سے منزہ ہے، اور اس کو ابدی بقا حاصل ہے، (قران السعدین ص ۲ و ۳)

نقش علل در رہش افگندہ سم علت و معلول در و ہر دو گم

کس نبرد راہ بہ تحقیق او در برد آنکہ بہ توفیق او

ثابت مطلق بہ صفات احد زندۂ باقی بہ بقائے آید

غیرت غیر از قدمش دور سیر پاک ز امکان تغیر چو غیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج سے واپس آئے تو صحابہ نے پوچھا کہ کہ یا رسول اللہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ وہ تو نور ہے جو کسی پیکر میں دیکھا نہیں جا سکتا، اس کو امیر خسرو اس طرح شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہیں (صفحہ ۱)

چشم جہت بینش حسد بند پنو تا نکند خود جہت از دیدہ دور

اللہ تعالیٰ کائنات کا صانع ہے، مگر اس کائنات میں دکھائی نہیں دیتا، وہ ہرجگہ موجود ہے لیکن کہیں بھی نہیں ہے، اس کو کس خوبی سے بیان کرتے ہیں، (ص ۳)

بستہ مکاں را بجہات صفات　　ہم زمکاں فارغ وہم از جہات

بے ہمہ جا و بہ جا درون　　در ہمہ جا و زہمہ جا برون

کہتے ہیں کہ اسی کی رہنمائی سے اپنی اور خداوند تعالیٰ کی ذات کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے، (ص ۶)

معرفتش گر نشدے رہنمائے　　نے زخود آگہ بدے نے از خدائے

امیرخسرو کے یہاں حمد میں سراسر وہی توحید ہے جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام پاک کے ذریعہ سے دی ہے یعنی اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، خالق عالم و صانع کائنات ہے، وہ انسانی عقل و فہم سے بالاتر ہے، ہر جگہ اور ہر حال میں موجود ہے اس کے وجود میں کوئی شک نہیں، یہ گوناگوں عالم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ آسمان، یہ زمین یہ سورج، یہ چاند، یہ سمندر، اور یہ پہاڑ وغیرہ ایک ہی خالق کائنات کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں، عرش سے فرش تک جو کچھ ہے، اسی کا ہے، اس پر اس کی حکمرانی ہے، وہ ہر قسم کی صفات عالیہ، اوصاف کمالیہ اور محامد جمیلہ سے متصف ہے، وہ جمال، جلال اور باکمال بن کر ہر طرف نمودار ہوتا رہتا ہے، توحید کی انہی سادہ تعلیمات کو امیرخسرو اپنی حمد میں مختلف صورتوں سے پیش کرتے رہتے ہیں جن کو پڑھنے میں لطف اُن کی شاعرانہ بلاغت کی وجہ سے دوبالا ہو جاتا ہے،

مجنون لیلیٰ میں کہتے ہیں کہ وہی دل کے راز کا خزانچی ہے، عقل اسی سے ملتی ہے، وہ دوربینوں کا دیدہ کشا ہے، تہی نشینوں کو خزانہ دینے والا ہے، بندہ نواز ہے، مغز کو

پوست دیکھنے والا ہے بہار رخشاں کا جلوہ گر ہے، ہوش مندوں کی آنکھوں کو بینائی دینے والا ہے،
جسم کا صانع ہے، روح کا خالق ہے، مجروح سینوں پر مرہم رکھنے والا ہے۔ (ص ۲-۱)

اے دادہ بدل خزینہ راز ‏ ‏ ‏ ‏ عقل از تو شدہ خزینہ پرداز
اے دیدہ کشاے دوربیناں ‏ ‏ ‏ ‏ سرمایہ دہ تہی نشیناں
اے بندہ نواز بندگی دوست ‏ ‏ ‏ ‏ زآں تو جہاں زمغز تو پوست
اے جلوہ گر بہار رخشاں ‏ ‏ ‏ ‏ بینا کن چشم ہوش منداں
اے صانع جسم و خالق روح ‏ ‏ ‏ ‏ مرہم نہ سینہ ہاے مجروح

شیریں خسرو میں اللہ تعالیٰ کی تکوینی قوت کے بارہ میں کہتے ہیں، کہ یہ کونین کی
صنعت اس کے باغ کا محض ایک پھول ہے، یہ تو آسمان کی حیثیت محض اس کے چراغ کا
دھواں ہے، اس نے اپنی عنایت سے کلک تقدیر کے ذریعہ کائنات کو تو لکھ ڈالا ہے،
اور اس کو دنیا کے سپرد کرکے بے نیاز ہو گیا ہے، پھر بھی اس پر لگام لگائے ہوئے ہے،
(ص ۳۰)

دو کون از صنع یک گل زباغے ‏ ‏ ‏ ‏ زہ کش نہ فلک دود چراغے
بعنوان عنایت کردہ تحریر ‏ ‏ ‏ ‏ حساب کائنات از کلک تقدیر
سپردہ در جہاں بے نیازی ‏ ‏ ‏ ‏ ارادت را عنان کارسازی

آئینۂ سکندری کی حمد میں کہتے ہیں، کہ ازل سے ابد تک اسی کی بادشاہی ہے، وہی
اول وہی آخر ہے، عقل کو وہی کنجی دینے والا ہے، آدمی کو وہی بلند کرنے والا ہے، کائنات
پر وہی خط کھینچنے والا ہے، وہی ضمیر کا راز داں ہے، وہی زندگی میں دست گیر ہے،

جہاں بادشاہا خدائی تراست ‏ ‏ ‏ ‏ ازل تا ابد بادشاہی تراست

توئی اول و آخر جملہ چیز | نہ آغاز داری نہ انجام نیز
در کار روانی تو کردی پدید | خرد را بر آں در تو دادی کلید
فلک را تو بستی گرہ در جہات | تو راندی قلم بر خط کائنات
توئی راز دار ضمیر ہمہ | بدرماندگی دست گیر ہمہ

دول رانی خضر خاں میں اللہ تعالیٰ کی جمالی صفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسی نے چین کے حسینوں اور دوسرے خوبرویوں کو اس لئے پیدا کیا کہ عشق ظاہر ہو، حسینوں کی آنکھوں کو یہ کرشمہ عطا کیا کہ آہو ہو کر شیر کا شکار کریں، ماہرویوں کی زلفوں کو اس لئے دراز کیا کہ محبت کرنے والوں کے دل مشوش ہوں، وہ تو صورتہائے زیبا کا نقاش ہے، اسی لئے مٹی کو اس نے دنیا کی شکل عطا کر دی (ص ۲)

بتانِ چین و خوبانِ طرازی | پدید آورد بہرِ عشق بازی
کرشمہ داد چشمِ نیکواں را | شکارِ شیر فرمود آہواں را
مسلسل کرد زلفِ ماہ رویاں | مشوش روزگارِ مہرجویاں
زہے نقاش صورتہائے زیبا | کہ خشتِ خاک ازو شد روئے زیبا

پھر اس حمد میں تمام پیغمبروں کی زندگی کے واقعات کو ایک ایک شعر میں سمیٹ کر ربانی فضائل کی تصویر کھینچ دی ہے، اس میں آدمؑ وابلیس، طوفانِ نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ کی تلاش وحدانیت، حضرت یوسفؑ کی گمشدگی پر حضرت یعقوبؑ کی پریشانی، حضرت موسیٰؑ کا کوہِ طور پر نورِ خداوندی دیکھنے، حضرت زکریاؑ کے سر پر آرہ چلانے، حضرت علیؓ کے روح اللہ ہونے، اور ہمارے رسول اللہ سے شق القمر کے معجزہ کے صادر ہونے وغیرہ کے واقعات کا سارا ذکر آگیا ہے، یہ ایجاز کا عمدہ نمونہ ہے، (ص ۳)

بآدم داد شمع روشنائی | نہاد ابلیس را داغ جدائی
چو بر نوح از تف غیرت زند برق | بطوفاں مردم چشمش کند غرق
بنوری بخشد ابراہیم راداد | کہ درچشمش نیاید انجم و ماہ
چو خواہد عین یعقوب از پسر نور | زعینش گر قرة العینش کند دور
کند بر موسیٰ آن راز آشکارا | کہ تاب آن نیارد کوہ خارا
یکے را بر گلو راند بلا رگ | یکے را آرہ بر بالاے تارک
چو تاب مہر بر روح اللہ فشاند | ز مہر دوستی جان خودش خواند
چو مہرش زد بزلف مصطفےٰ دست | چناں صد جاں بتار موے او بست
جمالی داد احمد را بدرگاہ | کہ چاک افتادزاں درسینہ ماہ

خداوند تعالیٰ نے جنیدؒ اور ہم شبلیؒ اور منصورؒ کو جس طرح نوازا اس کا بھی ذکر ہے۔ (ص ۳)

گہے بخشد جنیدے را کلاہے | کہ تنہا از اہل دل باشد سپاہے
گہے او ہم برد حبل عقیدہ | دہد از خیل حب اللہ طویلہ
گہے با شبلے آن ہمت کند ضم | کہ صید خویش نہ بیند دو عالم
گہے در پیش شادروان اسرار | نماید جلوۂ منصور بردار
ہمو داند کہ ایں رازنہاں چیست | چہ داند مردم گم گشتہ کان چیست

مثنوی ہشت بہشت میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ یہ آفرینش اسی کی تحریر ہے، جو کچھ ہے اسی کی پیدا کی ہوئی ہے، اس نے جو کچھ بنایا، اس کو یہ دنیا والے سمجھ نہیں سکتے، اُن کے خیال میں اس کی باتیں نہیں آسکتی ہیں، یہ آدمی محض مٹی

کا تپلا ہے، وہ خدا اللہ تعالیٰ کے راز کو نہیں جان سکتا ہے، دنیا میں جو کچھ ہے، اس کو کوئی شخص نہیں جان سکتا ہے، وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ باتیں صرف خدا ہی جانتا ہے یہ سب کچھ کن کا ظہور ہے (ص ۲-۱)

آفرینش رقم کشیدۂ تست | ہرچہ جز تست آفریدۂ تست
در نیابی لبعنکرِ عالمیاں | در نگنجی بوہم آدمیاں
آدمے کیست خاک بے سروپائے | کو بداند خدائے راچو خدائے
ہرچہ اندر جہاں نداند کس | ہمہ دانند کاں تو دانی وبس
ساختی از قضا جریدہ راز | بستی از حرف کاف ونون طراز

پھر لا الٰہ الا اللہ کی توضیح اس طرح کرتے ہیں کہ لا ایک اژدہا بن کر بہت سے خداؤں کو کھا گیا، اس لانے عارفوں کو بڑے بڑے خیالات عطا کئے، خدا ہے بھی نہیں بھی ہے کھلا ہوا بھی ہے، اور چھپا ہوا بھی ہے، وہی سب کچھ ہے، اس کے کہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، وہ تھا، اور کوئی چیز نہیں تھی، وہی رہے گا، اور کچھ بھی نہیں رہے گا،

لائے توحید اژدہاست بپائے | کہ خدایان خورد بغیر خدائے
اندراں لائے معرفت پیشہ | لام الف گشت پائے اندیشہ
ہست بے نیست آشکار ونہفت | ہم تو ئی جز ترا نشاید گفت
تو بدی و نبود ایں ہمہ چیز | ہم تو مانی و کس نماند نیز

امیر خسرو کے ایسے اشعار میں کہیں کہیں وحدۃ الوجود کی بھی کچھ بحث آگئی ہے، مگر اُن کے یہاں وحدت الوجود کا وہ فلسفیانہ غلو نہیں، جو بعد کے صوفیوں اور شاعروں کے یہاں پیدا ہو گیا تھا، اور اس کی بعض ایسی تعبیریں کی گئیں، جن سے یہ مسئلہ متنازعہ فیہ

بن گیا ہے، امیر خسرو کی حمد میں واجب الوجود، ربوبیت، تخلیق، اور عبد و معبود کے تعلقات کے ذکر میں وہی ساری باتیں آئی ہیں، جو اسلام کی سادہ تعلیمات کے مطابق ہیں، ان میں فلسفیانہ رنگ پیدا نہیں ہونے پایا ہے، اسی لئے اس کے سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی، البتہ اُن کے بیان کرنے میں اپنی سخنوری کی جو ہر دانی دکھائی ہے، اس سے کہیں کہیں مسئلہ غامض اور دقیق نظر آتا ہے، اگرچہ مسئلہ کی نوعیت کے لحاظ سے یہ سادہ ہی ہے، اور یہی مسلک خواجگان چشت کا رہا، جنھوں نے توحید کو عارفانہ رنگ میں ضرور پیش کیا، مگر اس میں فلسفیانہ رموز و نکات پیدا نہیں کئے،

دول رانی خضر خاں کی حمد میں کہتے ہیں، کہ اُن کی آنکھیں ایسی ہو جائیں کہ وہ صرف خداوند تعالیٰ کا دیدار ہی دیکھیں، اور اُن کی قسمت بنتی رہے، وہ اپنی ایسی زندگی کے خواہاں ہوتے ہیں کہ جس میں وہ خدا ہی کو ڈھونڈتے رہیں اور اسی کی آرزو لے کر مر جائیں، اُن کے لئے اس کی ذات کے سوا کوئی اور مقصود نہ ہو، پھر وہ ایسی ہمت چاہتے ہیں، کہ افلاک کے راز کو معلوم کر سکیں، وہ خدا ہی کی راہ پر چلنے کے خواستگار ہوتے ہیں، اور ایسی کنجی چاہتے ہیں جس سے خداوند تعالیٰ کی رحمت کا دروازہ کھل سکے، کہتے ہیں کہ وہ اس کی اطاعت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، تو پھر ان کو ایسی توفیق ہو کہ وہ اسی کے لئے سجدے میں پڑے رہیں، وہ خداوند تعالیٰ سے ایسی رہنمائی کی بھی خواہش کرتے ہیں کہ شیطان ان کو بہکا نہ سکے، وہ ایسی زندگی کی تمنا کرتے ہیں کہ جس میں اُن کا دل زندہ رہے،

کشادہ کن جہاں چشم امیدم | کہ بخت آرزو بدارست نویدم
چنانے دہ مرا در جستجویت | کہ میرم تا زیم در آرزویت
بداں مقصود خواہش بخش راہم | کہ از تو جز تو مقصودی نخواہم

زہمت نرد بانی نہ دریں خاک — کہ بتوانم شدن بر بام افلاک
امیدی دہ کہ رہ سویت نماید — کلیدی دہ کہ در سویت کشاید
چو دادی از پئے طاعت وجودم — بہ طاعت بخش توفیق سجودم
بہ کاری رہنمونی کن دلم را — کہ نہ سپارد بہ شیطان عالمم را
مرا باز ندگانی بخش یاری — کہ تا جان دانم دل زندہ داری

توحید کی نغمہ سرائی کے بعد وہ مناجات بھی لکھتے ہیں جس میں وہ اپنی عاجزی، بندگی اور عبودیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں اُن کا وہ سوزِ عشق بھی نظر آتا ہے جس کے لئے وہ مشہور ہے مطلع انوار کی پہلی مناجات میں کہتے ہیں کہ وہ کیا ہیں محض خاک زبوں ہیں، تھے نہیں، مگر پیدا کر دیئے گئے، اپنی ہستی کو خدا کے ساتھ یاد کرنے میں تو اُن کو اپنی ہستی سے شرم معلوم ہوتی ہے، وہی باقی رہنے والا ہے، اور آدمی تو فانی ہے،

من کہ بوم خاک زبوں آمدہ — صورتے از نیست بروں آمدہ
گر کنم از ہستی خود با تو یاد — از خود و ہستی خودم شرم باد
گر ز تو موجود بناشد بہ زیست — آدمی فانی و معدوم کیست

دوسری مناجات میں کہتے ہیں کہ اُن کا نفس سزا کا مستحق ہے، خدا ہی اس کو اپنی رحمت سے نواز سکتا ہے، وہ نہ نوازے گا تو کون نواز سکتا ہے، وہ اس دنیا میں گم ہو کر رہ گئے ہیں، خدا ہی راستہ دکھا سکتا ہے، وہ تو دوزخ کی زنجیر کے لائق ہیں، مگر وہ امید رکھتے ہیں کہ خدا ہی کوثر کا طوق اُن کے گلے میں ڈال سکتا ہے، پھر دعا کرتے ہیں کہ پل صراط پر سے وہ سلامتی کے ساتھ گذر جائیں،

نفس مرا گوشت سزائے گداخت | گرنہ نوازی تو کہ خواہد نواخت
گم شدہ ماییم دریں تنگ نائے | رہ تو نمائی کہ توئی رہنمائے
گرچہ بزنجیر ورک درخورم | طوق دہ از سلسلۂ کوثرم
دہ بہ مراعلم قدمے مستقیم | تا زپل آں سوئے گرایم سلیم

پھر اس کی تیسری مناجات میں کہتے ہیں کہ اگر ان کا دامن امید خدا کے کرم سے پُر ہے، تو یہ اُن کے لئے نعمتِ جاوید ہے، وہ چاہتے ہیں کہ تمام لوگوں سے منھ موڑ کر خدا کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اگر انھوں نے خدا کو پالیا، تو سب کو پالیں گے، پھر کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کی بخشش ہے، اس کے لئے ان کا دل ایسا ہو جائے کہ وہ کسی حال میں خدا کی نعمتوں کے ناشکر گذار نہ ہوں

اے بہ تر تو بُرِ دامنِ امید ما | وز کرمت نعمتِ جاوید ما
از ہمہ کاں سوے تو رو تافتم | تا ہمہ یابم چو ترا یافتم
زاں ہمہ بخشش کہ ز تو سوے ماست | گرچہ سپاسش نہ بہ بازوی ماست
نیز توی کن بدلم ایں اساس | تا نبوم در رہ تو ناسپاس

مجنوں لیلیٰ میں مناجات لکھتے وقت زاری کرتے ہیں کہ گنہگاروں کی تقصیر خدا ہی معاف کر سکتا ہے، وہ ایک عاجز بندہ ہیں، اُن کی عاجزی خدا ہی کے سبب سے ہے، وہی دور کر سکتا ہے، پھر گڑگڑاتے ہیں کہ وہ پست اور لاپرواضرور ہیں لیکن وہ امید رکھتے ہیں کہ خدا اُن کو اپنے سے دور نہ کرے گا، پھر کہتے ہیں کہ اُن کے دل میں خدا کی یاد ایسی آجائے کہ وہ اپنی ہستی کی یاد نہ کریں، وہ اس کے بھی خواہاں ہوتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کے گلشن میں وہ ایک نہال بن کر رہیں، مصیبت کی بھٹی میں جلنے کے لئے چھوڑ نہ دیئے جائیں،

اے قدرپذیرِ عذر خواہاں   عفو تو شفیع بے گناہاں
خسرو کہ کمینہ بندۂ تست   در ہر چہ رفت دلفگندۂ تست
بردار ز خاک رہ کہ پستم   از دست رہا مکن کہ مستم
از یاد خودم کہ آں چناں شاد   کز ہستی خود نیایدم یاد
در گلشنِ قدس کن نہالم   مگذار بہ گلخن و بالم

مثنوی ہشت بہشت (ص ۲) میں دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ میرے سر سے خسروانہ خیال دور کر دے، میری روشنی میں اپنی غلامی کی خاک بھر دے، اپنی بے نیاز درگاہ کے علاوہ تمام لوگوں کے دروازے سے بے نیاز کر دے، تیرے راستے پر چلنے کے علاوہ کسی اور کی طرف رُخ نہ کروں،

دور کن باد خسروی ز سرم   پُر کن از خاک بندگی بصرم
بے نیازم کن از در ہمہ کس   جز ز درگاہ بے نیازی و بس
آنچناں رہ بخویش کن بازم   کز تو با دیگرے نہ پردازم

شیریں خسرو کی مناجات (ص ۶) میں کہتے ہیں کہ مجھکو ایسی بلند ہمت عطا کر کہ دونوں جہان سے آزاد ہو کر دل تیرے ہی طرف لگائے رکھوں، صرف اپنی یاد میں اس طرح مشغول رکھ کہ اس سے اس طرح خوش رہوں کہ پھر کوئی اور میری یاد میں نہ آئے، میری آنکھ کی تپلی میں ایسا نور عطا کر دے، کہ کسی وقت بھی دور نہ ہو اور نہ مجھ کو اپنے سے ایسا قریب کر دے کہ میں خود اپنے سے ہمیشہ دور رہوں،

چناں دہ پایۂ ہمت بلندم   کہ از ہر دو جہاں دل با تو بندم
بیاد خویش کن زاں گونہ شادم   کہ نایدہیچ گہ از خویش یادم

چناں دہ مردم چشم مرا نور — کہ نبود ہیچ گاہ از مردمی دور

چناں نزدیک خویشم کن یگانہ — کہ از خود دور مانم جاودانہ

آئینۂ سکندری (ص ۲) کی مناجات میں کہتے ہیں کہ اے اللہ مجھ کو دنیا میں اس طرح بیدار رکھ کہ عارف بھی مجھ کو سویا ہوا نہ سمجھیں، میرے زخمی دل کو اپنا شناسا ایسا کر دے کہ اپنے کو پہچانتا رہوں، اپنی یاد سے میرے سینہ کو پر نور کر دے، تاکہ کسی حال میں تجھ کو فراموش نہ کروں،

چناں دار بیدارم اندر جہاں — کہ خفتہ نخوانند کارآگہاں

شناسا چناں کن دل ریش را — کہ بشناسد اندازۂ خویش را

زیاد خودم سینہ پر نور کن — فراموشی خود ز من دور کن

امیر خسرو نے اپنے ہر دیوان کے شروع میں بھی حمد لکھی ہے، اُن کے حمدیہ قصائد میں مضامین تو وہی ہوتے ہیں، مگر اپنی قادر الکلامی سے اُن کے پیش کرنے میں ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل نئی بات کہہ رہے ہیں جو پہلے نہیں کہہ سکتے تھے،

نہایۃ الکمال کی جو حمد ہے اس کا مطلع یہ ہے کہ

سپاس آں کردگاری را کہ شد زامرش جہاں پیدا

نہاں از دیدۂ پیدا و در چشم نہاں پیدا

پھر لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا اس پر یقین کرنے کے سوا وہم اور گمان کا دخل نہ ہونا چاہئے، اس کا جمال تو سب کو نظر آتا ہے، مگر اس کا راز انسانی عقل سے نہیں کھل سکتا ہے، اس کا نشان ہر جگہ ہے، مگر وہ خود بے نشان ہے اس نے جو کچھ پیدا کیا، کوئی نہ کوئی اس کا مستحق ہے، کوئی اونی کمل کا مستحق ہے تو کوئی پرنیاں کا سزاوار ہے،

انسان کو صاحبِ اختیار ضرور بنایا گیا ہے، مگر اُس کے لئے دوزخ اور جنت بھی بنائی گئی، یہ بھی اس کی قدرت ہے، گھاس سے کسی مریض کو شفا ہو جاتی ہے، لیکن کسی مریض کو اس سے اس کی ہڈی میں بخار ہو جاتا ہے، زہر انسان کی جان کا دشمن ہے، مگر جذامیوں کے لئے وہ دوا بھی ہے،

گمانہا گم شدہ در وے یقین گم یقیناں — کہ در صدق یقین ست نہ در کذب گماں پیدا
جمالش از ہمہ پنہاں و رازش از خرد پنہاں — نشانش در ہمہ پیدا و دانش بے نشاں پیدا
سزا وارست ہر کس بہر چیزے زاں سبب کردہ — ز بہر ایں گلیم و بہر او دیبا پرنیاں پیدا
بشر را اختیار فعل داد است بہت بہر او — کہ ہم دارالعذاب آورد و ہم دارالجناں پیدا
گیاہے کاں شفا بخشد یکے بیمار را در تن — دگر بیمار را زو تپ شود در استخواں پیدا
چناں زہر کشندہ کوست تن را دشمنِ جانی — شدہ مجذوم را داروی جسم و جاں ہماں پیدا

آخر میں کہتے ہیں کہ جب اُن کی روح کا قابض اُن کے پاس آئے تو وہ اس دنیا سے سلامتی کے ساتھ رخصت ہوں، اسی بات کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں،

ہمیں حاجت کہ با ایماں بری از عالم بیروں — چو گردد قابض ارواح بہ پیشم ناگہاں پیدا

اپنی قادر الکلامی، زورِ طبیعت اور غیر معمولی ذہانت اور لیاقت کے سہارے اساتذۂ فن کی تقلید میں بھی حمدیہ قصیدہ کہتے رہے، مثلاً غرۃ الکمال میں جو حمد لکھی ہے وہ سنائی کے تتبع میں ہے، پھر کبھی پوری غزل حمد میں کہہ جاتے، مثلاً اپنے دیوان بقیہ نقیہ کی ایک غزل میں اللہ تعالیٰ کی بے نیازی سے متعلق کہتے ہیں، کہ انسان کی با کمال عقل بھی اس کی صفات کو پا نہیں سکتی، وہ ایسا بے نیاز ہے کہ اگر اس کے درو ناسے پر تمام لوگ اور دنیا کے تمام ممالک برباد ہو کر خاک ہو جائیں تو بھی اس کو ملال نہ ہوگا، اس کی کبریائی کا کنگرہ لامکاں سے بھی بلند ہے، ہمارے

خیال کا پرندہ بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، اس کی بے نیازی کی ایسی ہے کہ سیکڑوں حسین تشنہ رہ جائیں، تو اس کو فکر نہیں ہوتی کہ ان کو آب زلال مل جائے، اس کے جلوہ کا تخت گاہ تو انسان کا دل ہے، جہاں وہ دن رات قرب میں ہنستا ہے لیکن چشم خیال اس کا جلوہ نہیں دیکھ سکتی، اس کے چمن کے سزاوار تو حضرت جبرئیل بھی نہیں، پھر اس دنیا کے گل چیں اس کے وصال کی بو کیا پا سکتے ہیں؟

آخر میں کہتے ہیں کہ حاجی تو حرم پاک میں رحمتِ الٰہی سے سرفراز کر دیے جاتے ہیں مگر خسرو بت پرست کی ظاہری حالت بھی وہاں پہنچ تو کیسے پہونچے، اُن کے حمدیہ تغزل کا لطف اس کے معانی و مطالب میں نہیں ملتا، بلکہ خود اُن کے اشعار کے پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے، یہ وہ غزل ہے جس سے محفلِ سماع میں وجد طاری ہوتا ہے:

اے زخیالِ ما بروں در تو خیال کے رسد
با صفت تو عقل را لاف کمال کے رسد

گر ہمہ مردم دملک خاک شوند بر درت
دامن عزتِ ترا گرد ملال کے رسد

کنگر کبریائے تو ہست فراز لامکاں
طائر ما در آں ہوا بے پر و بال کے رسد

بر در بے نیازیت صد چو حسین کربلا
تشنہ بماند بر گذر تا بہ زلال کے رسد

ہست بہ تخت گاہ دل جلوۂ قرب روز و شب
لیک بہ جلوۂ چناں چشم خیال کے رسد

در چمنے کہ بلبلش روح قدس نمی سزد
گل چنیان خاک را بوئے وصال کے رسد

آیت رحمت از حرم ہست برائے حاجیاں
خسرو بت پرست را جز خط و خال کے رسد

امیر خسرو اپنی درد بھری آواز میں موسیقی کے پورے فن کے ساتھ اپنے قصیدے اور غزل کے حمدیہ اشعار اپنے مرشد کو سناتے ہوں گے، تو اُن کی مجلس کی پوری فضا انوار الٰہی سے معمور ہو جاتی ہوگی، اُن کی حمد اور مناجات کے نغموں میں وہی کیفیت ہے، جو خواجگان چشت کے یہاں

توحید کی تعلیمات میں ملتی ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فرماتے ہیں، کہ عارف جب وحدانیت اور ربوبیت کا جلال دیکھتا ہے، تو پھر اس کی نظر غیر پر نہیں پڑتی ہے، اور وہ گویا نابینا ہوجاتا ہے، عارف کی محنت یہ ہے کہ حق کے سوا کسی چیز سے لگاؤ نہ رکھے، عارف کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں، ہیبت تعظیم، اور حیا، اپنے گناہوں سے شرمندہ ہونا ہیبت ہے، طاعت گذاری تعظیم ہے، اور خدا کے سوا کسی پر نظر نہ ڈالنا حیا ہے، (دلیل العارفین ص ۴۸ - ۴۵) سیر الاقطاب ص ۱۳۹)

حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کی تعلیم یہ تھی کہ ہر حال میں خداوند تعالیٰ کی پناہ کا جویاں ہونا چاہئے، اس کا نام عزیمت ہے، اور اس عزیمت کو عمل میں کر دینا چاہئے، (فوائد الفواد ص ۸۱) حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے یہ تعلیم دی کہ درویش اہل عشق ہوتے ہیں اور علما اہل عقل (افضل الفوائد) اُن میں سے کون ایسی بات ہے جس کے لئے امیر خسروؒ نے اپنی حمد اور مناجات میں دعا نہیں کی، اور پھر اپنے مرشد کی طرح عشق الٰہی کے جویاں بھی رہے، جیسا کہ ان کے حمدیہ اشعار اور مناجات سے ظاہر ہے، مثلاً دول رانی خضرخاں (ص ۶) میں کہتے ہیں، کہ اے خدا اس دل میں عشق کی بنیاد ایسی ڈال دے، کہ یہ مٹی ہمیشہ سبزہ زار بنی رہے، اور اے اللہ عشق کی ایسی شراب پے در پے پلا دے کہ قیامت کے روز عشق کی شراب کے نشہ میں مست رہوں،

چناں بنیادِ عشق افگن دریں دل — کہ روید جاودانی سبزہ زیں گل

چنانم دہ مئے پے در پے عشق — کہ فردا مست خیزم از مئے عشق

اور اُن کی دعا مقبول ہوئی کہ ان کے دل میں جو عشق کا سوز پیدا ہوا وہ ہماری روحانی وراثت کا بہت بڑا سرمایہ ہے، اسی کی بدولت انھوں نے اپنی غزلوں کو

عشقِ الٰہی سے کچھ ایسا گداز اور لالہ زار بنا دیا ہے، کہ آج بھی سماع کی محفلوں میں اُن کے عشقیہ اشعار کے سوز و گداز سے روحانی کیفیات کی ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے، انھوں نے عشقِ الٰہی پر کیسے کیسے اشعار کہہ کر اپنے جذبات کے گل اور بوٹے کھلائے ہیں، اس کا ذکر آگے آئے گا،

چشتیہ سلسلہ کے اولیا عشقِ الٰہی کے بعد عشقِ رسول پر بڑا زور دیتے رہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے ملفوظات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بڑے ہی والہانہ انداز میں کرتے ہیں، حدیث نبویؐ کا ذکر کرکے رونے لگتے، ایک جگہ اپنے ملفوظات میں فرمایا کہ افسوس ہے اس شخص پر جو قیامت کے دن آپ سے شرمندہ ہوگا اس کی جگہ کہاں ہوگی، جو آپ سے شرمندہ ہوگا، یہ فرما چکے تو ہاتھ کو ہاتھ کرکے رو پڑے (دلیل العارفین مجلس دوم) حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ہر رات تین ہزار بار درود شریف پڑھ کر رسول اللہ کے دربار گوہر بار میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے (سیر الاولیا ص ۵۰) حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی مجلس میں جب ذکرِ رسول آتا تو زار و قطار رونے لگتے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا خود ہی ذکر کرنے لگے، تو آہ کھینچ کر نعرہ لگایا، اور روتے روتے بیہوش ہوگئے (راحت القلوب ص ۶۸) حضرت نظام الدین اولیاء کی محبتِ رسول کا یہ عالم تھا کہ وصال سے کچھ دنوں پہلے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ نظام تم سے ملنے کا اشتیاق ہے، اس خواب کے بعد سفرِ آخرت کے لئے بے چین رہے، کھانا پینا بالکل ترک کر دیا، برابر آنکھوں سے آنسو جاری رہتا، کبھی کچھ کھانے کے لئے اصرار کیا جاتا تو فرماتے کہ حضرت رسالت مآبؐ کے مشتاق کو دنیاوی غذاؤں کی ضرورت نہیں، دوا پینے کے لئے کہا جاتا تو فرماتے ؏

دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

اسی حالت میں وفات پائی، (سیرالاولیا ص ۱۵۵-۱۵۴)

یہی ساری والہانہ عشقیہ کیفیات امیرخسرو کی نعتوں میں ملتی ہیں جن کا اظہار طرح طرح سے کرتے ہیں،

مطلع الانوار کی نعت (ص ۱۱-۱۰) میں کہتے ہیں، کہ چرخ کی ساری آرایش رسول عربؐ ہی کے لئے ہے، احمدؐ کا نام لکھا گیا تو اس میں حمد بھی آگیا ہے، اور کلام پاک کی سورۂ ختم بھی آپؐ ہی پر ختم ہوئی۔ آپؐ اُمّی تھے، مگر مکتب ازلی میں ساری عقل سیکھ لی تھی، آپؐ نے اپنی پریشان حال امت کے سامنے سارا پردہ اٹھایا، اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے جو بخشش ہوگی، اس کے آپؐ ضامن ہیں، آپؐ کا سینہ نازک تھا، اور دل بھی، مگر اس میں ساری دنیا کا بار اٹھا لیا، خاص و عام کو جو آزادی کا پروانہ ملا، وہ آپ کی رسالت کی توقیع کے ذریعہ سے ملا، آپ ہی کے نور سے آفتاب آسمان پر چلتا ہے، اور صبح بھی نمودار ہوتی ہے،

چرخ کہ زیں ساں عجب آراستند — بہر رسول عرب آراستند
احمد مرسل کہ نوشتہ قلم — حمد بنام وے و ختم ہم
زاں ازلی مکتب او امی لقب — عقل کل آموختہ لوح ادب
پردہ کش امت شوریدہ کار — ضامن آمرزش آمرزگار
بار جہاں بر دل آں نازنیں — سینہ چناں و بارے چنیں
نامہ کہ آزادی خاص ست و عام — کردہ بہ توقیع رسالت تمام

مطلع الانوار کی نعت سوم میں کہتے ہیں، کہ آپ کی بات خدا کے خزانہ کی کنجی ہے، آپ ہی کی وجہ سے الست کی آواز بلند ہوئی، اور نیست ہست میں تبدیل ہوگیا، آپ ہی کا خم ابرو ہلال میں ہے، آپ ہی کے موے مبارک کی شکن شام ہے، آپ کے گیسو کی سیاہی تاریک شب ہے،

اور آپ ہی کی وجہ سے پھولوں کو آبرو حاصل ہوئی،

اے سخت گنج خدا را کلید گوہر آن گنج تو کردی پدید
از تو صلائے بہ الست آمدہ نیست بہ ہمانی ہست آمدہ
غرۂ ماہ از خم ابروے تست طرۂ شام از شکن موے تست
بردہ ز گیسوے تو شب تار موے وز خوے تو یافتہ گل آبروی

شیریں خسرو کی نعت میں کہتے ہیں کہ آپ نہ ہوتے تو آسمان پیدا نہ کیا جاتا، اور کعبہ کو بھی رفعت حاصل نہ ہوتی، حضرت عیسیٰ نے اپنے دم سے آپ کی جگہ صاف کی، اور حضرت خضر نے آب حیات سے آپ کے قدم دھوئے،

ز مویش چرخ را منشور لولاک ز نعلش کعبہ را زنجیر افلاک
مسیحا از دم خود رفتہ جایش خضر از آب حیواں شستہ پایش

مجنوں لیلیٰ کی نعت میں رقمطراز ہیں کہ آپ رسولوں کے بادشاہ ہیں، شفاعت کرنے والے ہیں آپ کا نور پہلے اور بعد میں آفتاب پیدا ہوا، آپ عقل کے چراغ کو نور عطا کرنے والے ہیں آفرینش کے چشم و چراغ ہیں، آسمانی تخت کے شہنشاہ ہیں، جو چیز چھپی ہوئی ہے، اس کے جاننے والے ہیں، رسالت کی مملکت کے سلطان ہیں صحیفۂ جلالت کے طغرا ہیں،

شاہ رسل شفیع مرسل خورشید پسین و نور اول
ہم نور دہ چراغ بینش ہم چشم و چراغ آفرینش
شاہنشہ تخت آسمانی خوانندۂ تختۂ نہانی
سلطان ممالک رسالت طغرائے صحیفۂ جلالت،

آئینۂ سکندری کی نعت میں کہتے ہیں کہ آپ رسول نبی ہیں اور آپ حق کے واضح ثبوت ہیں آپ کی حکمت

درست ہے، اور آپ نے جتنا حکم دیا ہے، وہ ہر طرح مضبوط ہے آپ نیلے آسمان کے تخت کے بادشاہ ہیں، آپ ہی کی وجہ سے ہستی کی عمارت تعمیر ہوئی، یہ آسمان جو رخشندہ باغ دکھائی دیتا ہے آپ ہی کے نور سے روشن ہے، آپ کے چہرۂ مبارک کے باغ سے سارا باغ پھول بنا ہوا ہے اور اس باغ کے بلبل روح الامین یعنی حضرت جبرئیل ہیں، لوح محفوظ میں آپ ہی کی شان نظر آتی ہے، اور دنیا کی سیاہی اور سپیدی آپ ہی کی وجہ سے ہے،

رسولِ توی حجتِ آشکار　　بہ حکمت درست و بہ حکم استوار

محمدؐ شہِ لاجوردی سریر　　کز وگشت ہستی عمارت پذیر

ز باغِ رخش ہست بُستاں گلے　　دراں باغ روح الامیں بلبلے

ہمہ لوح محفوظ در شانِ او　　سیاہ و سپید جہان زآنِ او

مثنوی ہشت بہشت میں کہتے ہیں کہ گنہگاروں کو قیامت کے روز کے آفتاب کے نیچے آپ ہی کے حکم سے لمبا سا یہ حاصل ہوگا، آپ اُمّی تھے لیکن تختۂ کن پر آپ ہی نے یہ حرف لکھا، آپ کا قلم اور آپ کی بات ہر طرح درست ہے، آپ کی ذاتِ مبارک لوگوں کی نجات کی کنجی ہے، دنیا کے لئے حیات بھی ہے، اور آب حیات بھی۔ اور آپ کا وصف بیان کرنا عقل سے باہر ہے آپ کی بارگاہ لا مکاں سے برتر ہے، جو مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نور نہ رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے سایہ سے دور رکھے،

عاصیاں را در آفتاب نشور　　ظل ممدود داد از منشور

امی و حرف سنج تختۂ کن　　قلمش راست کار و راست سخن

ذات او خلق را کلید نجات　　ہم حیات جہاں ہم آب حیات

وصفش از حد عقل و جاں برتر　　بارگاہش از لامکاں برتر

ہر کہ از مصطفیٰؐ نہ دارد نور　　سایۂ اش دور باد از ما دور

مثنوی نہ سپہر میں اپنی نہایت عقیدت میں کہتے ہیں کہ جب حضرت آدمؑ ابھی پیدا بھی نہیں کئے گئے تھے، تو آپ ہفت محراب کے قبلہ بنے ہوئے تھے، حضرت ابراہیم خلیلؑ کو آپ ہی کے وجود سے نور ملا، اسی لئے گل نار ان کے لئے گلنار بن گئی، حضرت سلیمانؑ دیو اور پری کے بادشاہ اس لئے بنے کہ آپ ہی سے اُن کو تاج اور انگشتری ملی، حضرت موسیٰؑ نے آپ سے پہلے اللہ تعالیٰ کی روشنی دیکھنی چاہی تھی تو اُن کو پہاڑ دکھلایا گیا، کہ یہی اُن کے لئے کافی ہوا، حضرت ادریسؑ آپ سے پہلے بہشت میں داخل ہوئے تو آپ کیلئے طوبیٰ کی نگہبانی کے لئے مقرر ہوئے، حضرت اسماعیلؑ آپ ہی کی وجہ سے پاک ہوئے، اسی لئے اُن کی گردن پر خنجر چلایا گیا، تو اُن کا خون خاک پر نہیں گرا، حضرت نوحؑ نے طوفان میں کشتی چلائی، تو آپ ہی کی وجہ سے اپنی قوم کو بچا سکے، آپ کو آفتاب اور ماہتاب نے اس طرح سجدہ کیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اس طرح کا سجدہ خواب میں نہیں دیکھا، آپ کی جاں بخش فصاحت سے دمِ عیسیٰؑ بھی حیرت میں رہ گیا، آپ کے معجزے بیان کئے جائیں تو آسمان میں لرزہ پیدا ہو جائے'

هنوز آدمؑ اندر گل و آب بود　　کہ او قبلۂ ہفت محراب بود
خلیلؑ از وجودش پر انوار گشت　　کہ بر وے گل نار گلنار گشت
سلیماںؑ کہ شد شاہ دیو و پری　　ازو یافتہ تاج او انگشتری
تقاضیش از و کردہ موسیٰؑ ہوس　　نمودند سنگش کہ ایں پیش و بس
چو ادریسؑ در خلد شد پیش ازو　　نگہداشت طوبیٰ بر خویش ازو
سماعیل زو مایہ داشت پاک　　ازاں دشنہ نہ فگند خونش خاک
بہ ملاحیش نوحؑ چوں در نشست　　ز بے آبی قوم خود باز رست

چناں سجدہ کردش مہ و آفتاب | کہ یوسفؑ ندیداں کرامت بہ خواب
چوں جاں بخش گشتہ بہ نطقِ فصیح | نماندہ ز حیرت دم اندر مسیح

چوں از معجزانش برانم سخن
فتد لرزہ در آسمانِ کہن

امیر خسرو نے اپنی نعتوں میں جو خیالات ظاہر کئے ہیں، ممکن ہے کہ اُن سے بعض محتاط علمائے ظاہر اور محدثین اتفاق نہ کریں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت و محبت میں ایسے خیالات بعض مفسروں کے یہاں بھی ملیں گے، صوفیائے کرام کے یہاں تو ایسے تخیلات عام طور سے پائے جاتے ہیں، خود حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مجموعۂ ملفوظات راحت المحبین میں ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ آفتاب و ماہتاب کو جو نور دیا گیا ہے، وہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ کے مقابلہ میں رائی کے دانہ کے برابر بھی نہیں ہے، کون و مکان میں جس قدر اشیا ہیں، ان سب پر نام پاک حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ثبت ہے، اور ان سب کو حکم ہے کہ زندگی بھر آپ کا نام مبارک لیتے رہیں، آسمان و زمین میں ایک بھی جگہ ایسی نہیں کہ جس جگہ آپ کا نام مبارک نہ لکھا ہو، آپ کا معجزہ تھا کہ آپ بیداری اور خواب میں یکساں دیکھتے اور سنتے تھے، آپ کی شان اس قدر بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی کہ آپ کو پیدا نہ کرتا تو آسمان اور زمین کو بھی پیدا نہ کرتا، فردائے قیامت میں حق تعالیٰ وہی کرے گا جو آپ کہیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا حبیب فرمایا ہے، اور محبت کا یہی اقتضاء ہے، جس روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مردہ زندہ کیا، ان کو حکم ہوا کہ نام مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مردہ پر دم کریں، پس حق تعالیٰ نے برکت سے نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مردہ کو زندہ کیا، حضرت داؤد علی نبینا و علیہ السلام نے

ایک روز حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ فرشتے آسمان پر کس امر میں مشغول رہتے ہیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ اے داؤد جس روز سے وہ پیدا ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا ہے کہ تم آٹھ پہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نامحدود بھیجتے رہو، ورنہ تمہارا نام جریدۂ ملائکہ سے خارج کر دیا جائے گا، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول کرنی منظور کی تو حکم دیا کہ اے داؤد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو میری درگاہ میں شفیع لاؤ کہ تمہاری توبہ قبول ہو، ان سب وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان و مافیہا سب بطفیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہوئے ہیں، اور آپ ان سب سے برتر ہیں۔

(راحت المحبین اردو ترجمہ ص ۴-۳۰۲)

امیر خسرو نے یہی ساری باتیں اپنے نعتیہ اشعار میں شاعرانہ انداز میں کہی ہیں، اوپر کے ملفوظات کو سامنے رکھ کر امیر خسرو کے کچھ اور اشعار کا مطالعہ ناظرین کریں،

مجنوں لیلیٰ میں ہے:-

سلطانِ ممالکِ رسالت — طغرائے صحیفۂ جلالت
مجموعہ کشائے پردۂ غیب — گنجور خزینہ ہائے لاریب
پروانہ رسانِ ظلمت و نور — وز نور وخاں نوشتہ منشور
گنجینۂ کیمیائے عالم — پیش از ہمہ پیشوائے عالم
نامش بہ سریرِ بادشاہی — توقیع سپیدی و سیاہی
جاروب زنانِ بارگاہش — از پرِ فرشتہ رُفتہ راہش
لشکرکش آسماں غلامش — تعویذ کلاہ کرو نامش
بستہ کمر آسماں بکارش — انجم ہمہ چاؤشانِ بارش

شیریں خسرو میں ہے،

محمد کاصل ہستی شد وجودش | جہاں گردے ز شادروان جودش
چراغ روشن از نور خدائی | جہاں را داده از ظلمت رہائی
کتاب انبیار گامد ز پیشی، | ہمہ بر نامۂ پاکش خویشی
ملائک خوانده شمع آسمانش | دخان و نور روشن از دہانش

ہشت بہشت میں ہے،

درۃ التاج کن فکاں نسبش | قرۃ العین انس و جاں لقبش
ہستی از وے علم بر آورده | او تفاخر بہ نیستی کرده،
عیسی از کیمیاے جانت پوست | بیگماں کیمیاے عیسی اوست

مثنوی نہ سپہر میں ہے،

سرو سرور جمع پیغمبراں | شمع ز انوار او اختراں
رسولے ز پیغمبراں جملہ فرد | کہ ایزد رسالت برو ختم کرد
عمل راں در واز ۂ کبریا | علم دار قلب صف انبیار

امیر خسرو نے جہاں اپنی نعتوں میں اپنے مرشد کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کی ہے، وہاں اساتذۂ فن کی تقلید میں بھی نعتیں کہی ہیں، مثال کے طور پر ہم یہاں پرانے کے اور نظامی گنجوی کے کچھ متوازی نعتیہ اشعار پیش کرتے ہیں،

نظامی: اے ختم پیمبران مرسل | حلواے پسین و ملح اول
خسرو: شاہ رسل و شفیع مرسل | خورشید پسین و نور اول
نظامی: اے حاکم نشور کفایت | فرمان ده جملہ ولایت

[illegible]

خسرو: ہم نور دہ چراغ بینش   ہم چشم و چراغ آفرینش

نظامی: خاک تو ادیم روے آدم   نور تو چراغ ہر دو عالم

خسرو: گنجینۂ کیمیاے عالم   پیش از ہمہ پیشواے عالم

نظامی: ستوں شد خردمند از پشت او   مہ انگشت کش گشت ز انگشت او

خسرو: حمایت نشیں چرخ در مشت او   مہ از دو اخداران انگشت او

در چرخ را ماہ قفل زرست   کلید موی انگشت پیغمبر است

ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے نواب حبیب الرحمن خاں شروانی نے مجنوں لیلی اور مولانا محمد سعید فاروقی نے آئینۂ سکندری کے مقدمہ میں امیر خسرو کے اشعار کو زیادہ بہتر، دلگداز، پرشکوہ اور لطیف قرار دیا ہے لیکن مقابلہ اور موازنہ سے قطع نظر یہ کہنے میں تامل نہیں کہ نظامی گنجوی نے جس جذبۂ پاک سے اپنی نعتیں کہی ہیں، اسی والہانہ جذبہ سے خسرو نے بھی اپنے نعتیہ اشعار کہے، اور جس طرح نظامی نے ہر نعت کے بعد معراج کا ذکر کیا ہے اسی طرح خسرو نے معراج محمدی لکھ کر اپنی عقیدت اور محبت کے نذرانے پیش کئے ہیں جن کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرشد ہی کی طرح عشق رسول میں فنا فی الرسول تھے، اس کا اندازہ ان نعتیہ اشعار سے بھی ہوگا جو گذشتہ اوراق میں ناظرین کی نظروں سے گذرے ہیں عشق الٰہی اور عشق رسول ہی کا دوسرا نام تصوف ہے امیر خسرو کو یہ دونوں چیزیں قدرت کی طرف سے عطا ہوئیں، ان کی جلا ان کے مرشد کی صحبت میں بھی ہوتی رہی، پھر اس کو اپنی قادر الکلامی سے اپنی شاعری میں منتقل کرتے رہے،   (باقی)

حکیم سنائی غزنوی پر بین الاقوامی سیمنار

منعقدہ کابل (افغانستان)

از ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

اکتوبر ۱۹۷۷ء میں حکیم سنائی غزنوی کا نہصد سالہ جشن منایا گیا، اس جشن کا سب سے قابلِ ذکر پہلو اس موقع کا ہفت روزہ سیمنار تھا، جو ۱۷ اکتوبر تا ۲۳ اکتوبر رہا، راقم حروف نے بھی اس میں ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی تھی، خیال تھا کہ اس سیمنار کی مفصل روداد شائع ہوگی، اس لئے اس پر الگ سے لکھنا ایک لحاظ سے بے سود تھا۔ لیکن چونکہ وہاں کی بساط ہی الٹ گئی، اب سیمنار کی روداد کی توقع عبث ہے، اسی خیال سے میں نے ضروری سمجھا کہ چند واقعات جو میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان کو یکجا کر دوں، شاید کسی کے کچھ کام آجائے۔

اپریل ۱۹۷۷ء میں سنائی کے سیمنار میں شرکت کا دعوت نامہ افغانستان کی وزارتِ اطلاعات وکلتور[1] کی طرف سے آیا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی، اس لئے کہ میں نے افغانستان کا سفر نہیں کیا تھا، حکیم سنائی پر کام کرنے کی وجہ سے غزنیں اور بلخ کے نام اتنے کثرت سے سنے تھے کہ ان کے دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، دعوت نامے کے جواب میں میں نے فوراً اپنی رضامندی کا خط بھیجا۔ ٹکٹ آنے میں کچھ دیر ہوئی تو میں نے ایک خط وزارت متعلقہ کے نام کابل بھیجا۔ مگر وہاں سے جلد جواب نہ آنے پر متردد تھا۔ اس درمیان انڈین کاؤنسل

---

[1] یعنی کلچر

خسرو: سلطان مالکِ رسالت	طغرائے صحیفۂ جلالت
نظامی: اے خاکِ تو توتیائے بینش	روشن بہ تو چشمِ آفرینش
خسرو: ہم نور دہ چراغِ بینش	ہم چشم و چراغِ آفرینش
نظامی: خاکِ تو ادیم روئے آدم	نور تو چراغِ ہر دو عالم
خسرو: گنجینۂ کیمیائے عالم	پیش از ہمہ ہیولئے عالم
نظامی: ستون شد خرد مند از پشت او	نہ انگشت کش گشت زانگشت او
خسرو: حمایت نشین چرخ در مشت او	مہ از داغداران انگشت او
در چرخ را ماہ قفل زرت	کلید موی انگشت پیغمبر است

ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے مجنوں لیلیٰ اور مولانا محمد سعید فاروقی نے آئینۂ سکندری کے مقدمہ میں امیر خسرو کے اشعار کو زیادہ بہتر، دلگداز، پرشکوہ اور لطیف قرار دیا ہے لیکن مقابلہ اور موازنہ سے قطع نظر یہ کہنے میں تامل نہیں کہ نظامی گنجوی نے جس جذبۂ پاک سے اپنی نعتیں کہی ہیں، اسی والہانہ جذبہ سے خسرو نے بھی اپنے نعتیہ اشعار کہے، اور جس طرح نظامی نے ہر نعت کے بعد معراج کا ذکر کیا ہے اسی طرح خسرو نے معراج محمدی لکھ کر اپنی عقیدت اور محبت کے نذرانے پیش کئے ہیں جن کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرشد ہی کی طرح عشق رسول میں فنا فی الرسول تھے، اس کا اندازہ ان نعتیہ اشعار سے بھی ہوگا، جو گذشتہ اوراق میں ناظرین کی نظروں سے گذری ہیں عشق الٰہی اور عشق رسول ہی کا دوسرا نام تصوف ہے امیر خسرو کو یہ دونوں چیزیں قدرت کی طرف سے عطا ہوئیں، ان کی جلا ان کے مرشد کی صحبت میں بھی ہوتی رہی، پھر اسی کو اپنی قادرالکلامی سے اپنی شاعری میں منتقل کرتے رہے، (باقی)

حکیم سنائی غزنوی پر بین الاقوامی سمینار

منعقدہ کابل (افغانستان)

از ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

اکتوبر ۱۹۷۷ء میں حکیم سنائی غزنوی کا نہصد سالہ جشن منایا گیا، اس جشن کا سب سے قابلِ ذکر پہلو اس موقع کا ہفت روزہ سمینار تھا، جو ۱۷ر اکتوبر تا ۲۳ر اکتوبر رہا، راقم حروف نے بھی اس میں ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی تھی، خیال تھا کہ اس سمینار کی مفصل روداد شائع ہوگی، اس لئے اس پر الگ سے لکھنا ایک لحاظ سے بے سود تھا۔ لیکن چونکہ وہاں کی بساط ہی الٹ گئی، اب سمینار کی روداد کی توقع عبث ہے، اسی خیال سے میں نے ضروری سمجھا کہ چند واقعات جو میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان کو یکجا کردوں، شاید کسی کے کچھ کام آجائے۔

اپریل ۱۹۷۷ء میں سنائی کے سمینار میں شرکت کا دعوت نامہ افغانستان کی وزارتِ اطلاعات وکلتور[لہ] کی طرف سے آیا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی، اس لئے کہ میں نے افغانستان کا سفر نہیں کیا تھا، حکیم سنائی پر کام کرنے کی وجہ سے، غزنین اور بلخ کے نام اتنے کثرت سے سنے تھے کہ ان کے دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، دعوت نامے کے جواب میں میں نے فوراً اپنی رضامندی کا خط بھیجا۔ ٹکٹ آنے میں کچھ دیر ہوئی تو میں نے ایک خط وزارت متعلقہ کے نام کابل بھیجا، مگر وہاں سے جلد جواب نہ آنے پر متردد تھا۔ اس درمیان انڈین کاؤنسل

لہ یعنی کلچر

فارکلچرل ریلیشن (ICCR) کا خط آیا کہ حکومت ہند آپ کو سنائی کے سیمنار کے سلسلے میں کابل بھیجنا چاہتی ہے، میں نے انھیں بھی اپنی رضامندی بھیج دی۔ اور مضمون کے عنوان سے مطلع کر دیا، چند ہی روز میں مضمون کا مطالبہ آیا، میرے پاس سنائی کے کچھ غیر مطبوعہ کلام پر ایک مفصل یادداشت موجود تھی، میں نے اسی پر چند روز میں ایک مضمون انگریزی میں لکھکر (ICCR) کے واسطے سے سفارت ہند کابل بھیج دیا، وہاں سے جواب آیا کہ مضمون فارسی میں ہوتا تو زیادہ بہتر تھا، مگر اب اتنا وقت نہ تھا کہ میں اسے فارسی میں منتقل کرتا، میں نے خیال کیا کہ کابل ہی میں یہ کام ہو جائے گا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہاں یہ کام ہوگیا۔

ICCR سے خط و کتابت کے درمیان حکومت کابل کی طرف سے ٹکٹ کی اطلاع آگئی، میں نے ICCR کو اس سے مطلع کیا تو وہاں کے متعلقین بہت خوش ہوئے، اور مجھے لکھا کہ میں حکومت کابل کے ٹکٹ سے استفادہ کروں البتہ ان لوگوں نے کلیرنس وغیرہ کی زحمت[1] سے مجھے بچا دیا۔

اسی درمیان کابل سے منتظمین سیمنار نے یہ اطلاع دی کہ دانشگاہ کابل میری کتاب "مکاتیب سنائی"[2] چھاپ رہی ہے، انھوں نے مزید یہ خواہش ظاہر کی کہ امید ہے مجھے اس باب میں کوئی اعتراض نہ ہوگا، میں نے کتاب کے دوبارہ چھاپنے کی فوراً اجازت دے دی اور ضمناً بعض دوسری مطلوبہ معلومات بھی فراہم کر دیں،

---

[1] اس سلسلے کی زحمت کا اندازہ وہ لوگ بخوبی لگا سکتے ہیں جن کو ہندوستان سے باہر جانے کا اتفاق ہوا ہے اس زحمت کے مقابلے میں بیرون ملک سفر کا لطف حساس طبائع کے لیے بہت کم ہوتا ہے۔ [2] یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۶۲ء میں چھپی تھی،

۱۶ اکتوبر کو افغان ایر سے کابل گیا، افغان ایر سے جانے پر اصرار کی وجہ یہ تھی کہ اسی تاریخ میں میری بیٹی ڈاکٹر ماریہ بلقیس مع اپنی دو بچیوں کے انگلستان جا رہی تھی، بہر حال یہ خواہش پوری ہوئی، کابل ایرپورٹ پر ماریہ سے ملنے ڈاکٹر قریشی اور ان کی بیوی بچے آئے ہوئے تھے اور مجھے لینے سفارت ہند کے ایک افسر مع ڈاکٹر تھڈانی[۱] کے تشریف لائے تھے، ان حضرات کی وجہ سے بڑی سہولت رہی اور تھوڑے ہی وقفے میں ایرپورٹ کی کارروائی ختم ہو گئی لیکن جہاز کے چھوٹنے تک ہم لوگ رکے رہے، اسلئے کہ میری بیٹی اور اس کے بچے اسی جہاز سے انگلستان جا رہے تھے، کوئی آدھا گھنٹہ ہم لوگ وہاں رکے رہے، پھر بیٹی کو رخصت کرکے شہر کی طرف چلے، تھوڑی دیر میں مجھے کابل کے سب سے بڑے ہوٹل یعنی کابل ہوٹل میں پہنچا دیا گیا۔ ہوٹل کے کاونٹر پر مجھے ایک سردار جی نظر آئے، ان سے پوچھا تو وہ افغانی سردار ٹھہرے، بہرحال وہ اردو بولتے تھے۔ دوسرے روز ہوٹل کے ایک اسسٹنٹ منیجر مسٹر کتوازی سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا وہ اس لحاظ سے میرے شاگرد ہیں، کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی، اور دری (فارسی کو تمام افغانی بغیر استثنا اسی نام سے یاد کرتے ہیں) ان کے پاس ایک مضمون کی حیثیت سے تھی،

بعد مغرب ایک غیر رسمی ملاقاتی جلسہ تھا، اس میں معزز اساتذہ، ارکان وزارتِ کلتور، منتظمین سمینار وغیرہ تشریف لائے، اتفاق کی بات یہ تھی کہ باہر سے آنے والوں میں ابھی صرف دو ہی ایک حضرات تشریف لا سکے تھے، جلسے میں پروفیسر عبدالحئی حبیبی سے ملاقات ہوئی، وہ بڑے تپاک سے ملے، انھوں نے سب حضرات سے تعارف کرایا، ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد مجھ سے پوچھا کہ آجکل کیا کام ہو رہا ہے، میں نے دیوان عمید لویکی[۲] کی

---

[۱] سفارت ہند میں فارسی کے ترجمان ہیں۔ [۲] عمید لویکی سلطان ناصرالدین محمود پسر سلطان شمس الدین التمش کے دور کا شاعر ہے، اس کا کلام کمیاب اور مجموعہ دیوان نایاب تھا جستہ جستہ نظمیں ملتی ہیں۔

ترتیب کا ذکر کیا، عمید لویکی کے دیوان کی بابت بڑی دلچسپی ظاہر کی، تو مجھے کچھ استعجاب سا ہوا، میں نے پوچھا کہ عمید لویکی سے آپ کی شناسائی کس قدر ہے، انھوں نے وہی باتیں دہرائیں، جو بدایونی کی منتخب التواریخ اور دوسری کتابوں میں درج ہیں، ان کو اس بات کی توثیق کی سخت ضرورت تھی کہ عمید کی نسبت کی صحیح قرأت کیا ہے، دراصل عمید، لویکی، لونکی، تونکی، تولکی، دیلمی وغیرہ متعدد نسبتوں سے منتخب کتابوں میں مذکور رہی لیکن سوائے لویکی کے ساری نسبتیں غلط ہیں، اس لئے کہ اولاً دیوان میں ہر جگہ نہایت واضح طور پر یہی صورت درج ہے، دوم حسبِ ذیل شعر سے نہ صرف اس کی صحیح قرأت بلکہ صحیح نوعیت کا بھی تعیین ہو جاتا ہے۔

نسب از عمر بذیرم حسب از تبار لویک بکدام سلک دیدی دو گہر چنیں منظم

گویا لویکی نسبت کسی مقام کی طرف نہیں، بلکہ کسی خاندان کی طرف ہے، میری اس توضیح پر حبیبی صاحب اور دوسرے حضرات کو بڑی خوشی ہوئی، استاد حبیبی صاحب نے پوچھا کہ آپ کو "لویک" کا حال معلوم ہے، میرے اس اظہار پر کہ میں نے لویک کا پتہ چلانے کے لیے سنام[1] کے لوگوں سے رابطہ قائم کیا تھا، مگر سب بے سود رہا، کہنے لگے کہ لویک کابل اور غزنیں کا حکمران خاندان تھا، اسی خاندان کے آخری فرمان روا کو سلطان ناصرالدین سبکتگین نے شکست دیکر غزنوی حکومت کی بنیاد ڈالی انھوں نے مزید یہ فرمایا کہ اس خاندان کا ذکر بغلان کے ایک کتبہ میں بشکل Lo×u (لویخ) آیا ہے، چنانچہ اس سلسلے کی ساری معلومات انھوں نے ایک کتابچہ بعنوان "لویکان غزنہ" اور تعلیقات طبقات ناصری میں جمع کر دی ہیں، دوسرے دن اس کتابچہ کا ایک نسخہ مجھے عنایت کیا، غرض

---

[1] پٹیالہ کے قریب پنجاب کا ایک شہر عمید کا تعلق اسی شہر سے تھا۔

میرا مسئلہ اس طرح حل ہوا، اور ان کو اس لحاظ سے خوشی ہوئی کہ لویک خاندان کے باقیات صالحات ہندوستان میں موجود تھے،

۱۰ اکتوبر کو ریڈیو کابل کے ہال میں سیمنار کا افتتاح ہوا، صدر مملکت جزل داؤد خان افتتاح کے فرائض انجام دینے والے تھے، مگر کسی وجہ سے وہ نہیں آسکے، تو ان کے بجائے وزیر اطلاعات وکلتور دکتور نوین نے افتتاح سیمنار کی رسم ادا کی، بیرونی مندوبین کی نمایندگی راقم کے سپرد ہوئی، چنانچہ ہندستان و افغانستان کے ثقافتی تعلقات پر ایک مختصر گفتگو راقم نے کی، اسی دن شام سے مقالہ خوانی کی مجلسیں شروع ہوئیں، مجلسوں کی صدارت بیرونی مندوبین نے کی، مقالہ پر کافی گرما گرم بحثیں ہوئیں، مقالات عام طور پر فارسی میں پڑھے جاتے، دو تین مقالے پشتو میں اور اتنے ہی انگریزی میں تھے، میرا مقالہ بھی انگریزی میں تھا، لیکن میں نے اس کو فارسی میں منتقل کرکے دوسرے روز پیش کیا تھا، غیر ملکی شرکاء میں میرے علاوہ حسب ذیل حضرات تھے،

پروفیسر نوری عثمانوف۔ (روس)	پروفیسر رابرٹ معین الدین طامسن (امریکا)
ڈاکٹر بو ادتاس (سویڈن)	پروفیسر کرسیٹوف بورگل (انگلستان)
پروفیسر مس شیل (جرمنی)	پروفیسر اسکارچیا (اٹلی)
ڈاکٹر زکی عبد الحسین الصراف (بغداد، عراق)	زلمی ہیوادمل (انگلستان)
پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (پاکستان)	ڈاکٹر عبد القادر قرہ خان (استنبول ترکی)
ڈاکٹر مظاہر مصفا (تہران)	ڈاکٹر غلام حسین یوسفی (مشہد، ایران)

ان کے علاوہ ایرانی سفارت کے کلچرل کاونسلر، اور کابل یونیورسٹی سے وابستہ دو ہندستانی استاد یعنی سید محمد رضوان حسین اور ڈاکٹر دی، سی، سری واستوا بھی مندوبین میں

شامل تھے، غیر ملکی شرکاء میں نوری عثمانوف سے میری کافی شناسائی اور باہمی خط و کتابت تھی، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، شاہنامہ کی تصحیح میں ان کی شارکت ہے، روس کے فارسی دانشمندوں میں انکا پایۂ علمی کافی بلند ہے، فی الحال ماسکو انسٹی ٹیوٹ ملل آسیائی سے وابستہ ہیں، انھوں نے سنائی کی لغطیات پر ایک مقالہ سمینار میں پیش کیا تھا، مگر اس کی نقل میرے پاس نہیں، ڈاکٹر بو اوتا س سویڈن کے انسٹیٹوٹ آف ایشین اسٹڈیز سے متعلق ہیں، وہ حکیم سنائی کے اس لحاظ سے متخصص ہیں کہ انھوں نے سنائی کی طرف منسوب مثنوی، طریق التحقیق کا عمیق مطالعہ کیا ہے، اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سنائی کی طرف اس کا انتساب غلط ہے، بظاہر یہ مثنوی ایک شاعر احمد بن حسن بن محمد نخجوانی کی معلوم ہوتی ہے، اس مثنوی کا ایک مثالی متن شایع کیا ہے، اور اس پر ایک تنقیدی مقدمہ لکھا ہے جو ۲۴۵ صفحوں پر مشتمل ہے، اور جس میں مثنوی کے اشعار کا ترجمہ بھی شامل ہے، ڈاکٹر بو اوتا س نے سنائی کی وفات پر ایک مقالہ بھی سمینار میں پیش کیا تھا، ان کے نزدیک سنائی کی وفات کی تاریخ ۵۲۹ ہجری جو کلیات کے سب سے قدیم نسخے کے مقدمے میں ہے، قرینِ قیاس ہے۔ رابرٹ معین الدین ٹامسن ادبیات فارسی کے آدمی نہیں، انگریزی ادب کے استاد اور انگریزی کے شاعر ہیں، حضرت معین الدین چشتیؒ سے متاثر ہوکر اجمیر میں مسلمان ہوگئے ہیں، اور اپنا نام عقیدۃً انھیں کے نام پر رکھا ہے، تصوف سے کافی لگاؤ ہے۔ ہندوستان اور افغانستان آتے جاتے رہتے ہیں، علاوہ ایک مضمون کے اپنے اقامتِ افغانستان کے احساسات کو انگریزی اشعار میں پیش کیا تھا، پاکستانی مندوب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام سے میں واقف تھا، لیکن ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی، نہایت شریف اور باوضع انسان تھے، کم آمیز اور خاموش تھے، مگر گفتگو کرتے تو گویا پھول جھڑتے تھے، شیروانی اور پاجامے میں ملبوس تھے، سمینار میں مضمون پیش کرنے کے علاوہ فارسی میں

ایک نظم پیش کی جو کافی پسند کی گئی ، سنا ہے ، وہ اللہ کو پیارے ہوگئے ، خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے ، ڈاکٹر مظاہر مصفا سنائی کے بڑے قدر دانوں میں ہیں ، چنانچہ انھوں نے بڑی عرق ریزی سے ان کا دیوان مرتب کیا جو کافی متداول ہے ، انھوں نے کوئی مقالہ تو نہیں پیش کیا لیکن فارسی شاعری کے ارتقا میں سنائی کے حصے پر ایک پُرمغز ، جامع اور مدلل تقریر کی ، افسوس یہ کہ یہ تقریر آخری جلسے میں ہوئی ، معلوم نہیں ضبط کی گئی یا نہیں ، کاش وہ شائع ہو جاتی ، پروفیسر غلام حسین یوسفی دانشگاہ مشہد کے محترم استاد اور فارسی کی دنیا میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ، وہ مقالہ تو پیش نہ کر سکے البتہ جلسہ کی مناسبت سے ایک دلچسپ نظم پیش کی جو کافی پسند کی گئی ، پروفیسر مس شیمل کسی تعارف کی محتاج نہیں ، تصوف ان کا خاص موضوع ہے ، انھوں نے سنائی ، رومی اور اقبال کے تعلق سے ایک مضمون پیش کیا ، یہ مضمون اسی موقع پر مجلہ ادب دانشگاہ کابل میں چھپا تھا ، ڈاکٹر عبد القادر قرہ خان استنبول یونیورسٹی میں استاد اور کافی خوش گفتار شخصیت کے مالک ہیں ، وہ دیندار ہیں ، چنانچہ جمعہ کو ہمارا پروگرام غزنیں کا تھا ، وہاں نماز جمعہ انھوں نے بڑے اہتمام سے ادا کی اور ادا کرائی ، دو ہندوستانی استاذ جو سمینار میں مدعو تھے ، ایک سید رضوان حسین ہیں ، یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد اور سنائی کے سمینار کے موقع پر کابل یونیورسٹی میں Vis iting پروفیسر تھے ، قیام کابل کے دوران میرے بڑے کرم فرما رہے ، انھوں نے سنائی کی غزلوں میں عشق کے عنوان سے ایک مقالہ انگریزی میں پیش کیا تھا ، دوسرے ہندوستانی پروفیسر ، ڈاکٹر سری واستوا تھے ، وہ الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ ہیں ، سمینار کے وقت وہ کابل یونیورسٹی میں (Visiting) پروفیسر تھے ، ان کا مقالہ انگریزی میں

حکیم سنائی کی تاریخی اہمیت پر تھا، ان کی بیوی میری ہم وطن تھیں، اس نسبت سے انھوں نے اور بھی خصوصیت برتی، کابل کے ایک ہفتہ کے قیام میں ہندوستانی سفارت کے کارمند ڈاکٹر قریشی صاحب نے بھی کافی محنت کی، دوسرے کارمند ڈاکٹر تھڈانی تھے جنھوں نے میری واپسی پر ریزرویشن وغیرہ کرایا تھا، ہندوستان کے سفیر محترم سے بھی ملاقات کی انھوں نے افغانستان کی سیاحت کا انتظام کرنے کا وعدہ کیا لیکن راقم ان کی کرم فرمائیوں سے استفادہ نہ کرسکا۔

افغانی دانشمندوں میں استاد عبدالحی حبیبی استاد مائل ہروی، استاد عبدالشکور رشاد، پروفیسر میر حسین شاہ سے دیرینہ شناسائی تھی، استاد حبیبی ایک جلیل القدر علمی شخصیت کے مالک اور فارسی ادب و تاریخ کے بڑے رمزشناس ہیں، انھوں نے متعدد کتابیں ایڈٹ کرکے شائع کی ہیں، ان میں طبقات ناصری، طبقات صوفیہ ہروی، فضائل بلخ، زین الاخبار گردیزی راقم کے پاس موجود ہیں، ان کے علاوہ وہ کئی رسالوں اور کتابوں کے مولف ہیں، جن میں تاریخ افغانستان درعصر گورگانی ہند، پشتو دلویکان غزنہ، زبان دو ہزار سال قبل افغانستان، نگاہی بہ سلامان وابسال جامی، افغانستان بعد از اسلام، تاریخ مختصر افغانستان یک تحقیق نوین دربارہ کابل شاہان، ہفت کتیبۂ قدیم، تاریخ خط و نوشتہ ہائی کہن افغانستان، ترجمہ چہار مقالہ بر فردوسی، ظہیرالدین محمد بابر شاہ، ہنر در عہد مغول ہندوستان وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان سے ایران، سمرقند، ہندوستان میں کئی بار ملاقات ہوچکی ہے، اردو زبان میں گفتگو کرتے ہیں، استاد مائل ہروی بڑے نقاد اور محقق ہیں، خاموش اور پرتاثیر شخصیت کے مالک ہیں، ان سے ایران اور ہندوستان میں دوچار بار ملاقات ہوچکی ہے، وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں،

معرفی روزنامہ ہا، جراید ومجلات افغانستان) امواج ہریوا (مجموعۂ اشعار) شرح
او زندگی امام فخر رازی، فہرست کتب مطبوعہ افغانستان امیر حسینی ہروی، آئینہ تجلی
ایان برناباد (تذکرۂ شاعران) تاریخ مختصر ملوک کرت، راہنمای تاریخ
نستان وغیرہ۔

استاد عبدالشکور رشاد سے ایران اور ہندوستان میں ملاقات ہو چکی ہے وہ پشتو
تاد ہیں، ہندوستان میں رہے ہیں، اور اردو خوب بولتے ہیں، کم گو ہیں لیکن بڑی
شخصیت کے مالک ہیں۔

پروفیسر سید حسین شاہ میرے دیرینہ کرم فرما ہیں، انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم
اسلامک کلچر میں کیا تھا، ڈاکٹر وحید مرزا مرحوم کے عزیز شاگردوں میں ہیں، لکھنؤ
و متعدد کانفرنسوں میں ان سے ملاقات ہوئی، علی گڑھ بھی تشریف لائے ہیں سنائی
ار کے موقع پر کابل یونیورسٹی میں پروفیسر اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین تھے، نیز
اور بار ثانیہ مکاتیب سنائی طبع کابل میں مقدمہ انھیں کے قلم کا ہے۔

ان دوستوں کے علاوہ تازہ ملاقاتیوں میں ڈاکٹر روان فرہادی خصوصیت سے قابل
یہی سمینار کے روح رواں تھے، ان سے پہلی ملاقات سمینار شروع ہونے سے پہلے
م میں ہوئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کے ملاقاتی ہیں فرمایا کہ صرف آپ کو ہماری
نے کرایہ دے کر بلایا ہے، اور اس خاص اکرام کی تہ میں ایک جذبۂ تشکر ہے
نے مکاتیب سنائی کو بغیر حق التالیف کے دوبارہ چھاپنے کی اجازت دی ہے"
نے مکاتیب سنائی کے دوسرے ایڈیشن یعنی طبع کابل پر مقدمہ لکھا ہے
رہادی بڑی صلاحیت کے مالک ہیں، ان سے علمی دنیا کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں،

ڈاکٹر امیر محمد اثیر غزنوی بیدلؔ کے بڑے مداحوں میں ہیں، انھوں نے سنائی کے والدین کے مزار کی تحقیق کی ہے، اور اسی پر ایک مقالہ سمینار میں پیش کیا ہے، اگرچہ وہ طبیب ہیں لیکن ادبیاتِ فارسی کا بڑا گہرا ذوق ہے، انھوں نے بیدلؔ عظیم آبادی کی طور معرفت کی شرح لکھی ہے، اس کی جلد اوّل جو خاصی ضخیم ہے پیش نظر ہے، شرح کا عام انداز شارحینِ قدیم جیسا ہے اس میں ہزاروں اشعار اپنے حافظے سے شامل کئے ہیں، بڑے سادہ، اور شریف انسان ہیں، غزنین کے رہنے والے ہیں، لہذا اس شہر کے بارے میں ان کی معلومات بہت زیادہ وسیع ہیں، ان کے بیٹے ادبیات کے طالب علم ہیں، مجھ سے کافی محبت سے ملے اور مثنویاتِ سنائی کا ایک قدیم مجموعہ جو غزنین میں چھپا تھا، عنایت کیا، حکیم سنائی کی تسخیر کا کیا ذکر کروں کہ میں نے ان کے مکاتیب کے جمع کرنے میں جو حقیر سی کوشش کی تھی، وہ اس قدر مشکور ہوئی کہ افغانستان کے دانشمندوں کے علاوہ طلبہ بھی اسی کتاب کی برکت سے میرے نام سے روشناس تھے، اکثر افغانی دانشمندوں نے "مکاتیب سنائی" کی فرمایش کی، شاید اسی ضرورت سے دانشگاہ کابل نے دوبارہ طبع کرایا۔

کابل یونیورسٹی کے اساتذہ میں استاد علی اصغر بشیر سنائی کے متخصص ہیں، انھیں کے زیر اہتمام کلیات اشعار حکیم سنائی مبنی بر نسخہ کابل چھپا ہے، اگرچہ یہ عکسی چھاپ ہے لیکن اس پر ایک مفصل مقدمہ ہے، جو مرتب کے ناقدانہ صلاحیت کا مظہر ہے استاد بشیر باصلاحیت محقق اور نقاد ہیں،

نوجوان استادوں میں آقائے سرور ہمایوں بڑے باصلاحیت، ذہین اور طبّاع ہیں، ان کی تازہ تالیف مقامات تاریخی غزنہ ان کی علمی و تحقیقی صلاحیت کی مظہر ہے،

سنائی کے سمینار کے موقع پر کافی کتابیں چھپی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ کلیات اشعار حکیم سنائی چاپ عکسی با مقدمہ و فہارس بکوشش علی اصغر بشیر کلیات کے جس نسخے کا یہ عکس ہے وہ سنائی کے کلام کے اسوقت تک کے تمام مکشوف نسخوں میں سب سے قدیم ہے، مرتب کے بقول چھٹی صدی ہجری کے وسط میں اسکی کتابت ہوئی ہوگی، اسکی اشاعت سے بعض اہم امور پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً اس کی رو سے سنائی کی وفات ۵۲۹ ہجری ہے، اس سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیقہ سنائی کا مقدمہ جو اب تک محمد بن علی الرفا کا سمجھا جاتا رہا ہے، خود حکیم کے قلم کا ہے، محمد بن علی الرفا نے جزوی تبدیلی سے اسے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے، بشیر صاحب کے محققانہ مقدمے سے بعض اہم امور سامنے آتے ہیں۔

۲۔ فہرست کتب چاپی دری، یہ ایک عمومی فہرست فارسی کی ۱۲۰۰ کتابوں کی ہے، جو تقریباً سو سال اخیر میں افغانستان میں چھپی ہیں، یہ فہرست مصنف یا مترجم کے نام کا لحاظ کرتے ہوئے حروف تہجی سے مرتب ہوئی ہے، مرتب حسین نایل ہیں،

۳۔ سیر العباد الی المعاد، سنائی کی اس مشہور مثنوی کا یہ نسخہ مایل ہروی کا مرتبہ ہے، اس میں متن کی تحقیق کے سا[تھ] ایک جامع مقدمہ ہے، جس میں سنائی کے افکار کا مقابلہ دوسرے مفکرین سے ہوا ہے، ایک اور مقدمہ ہے، دکتور بہاء الدین مجروح کے قلم کا ہے، آخر میں سیر العباد کی شرح بھی شامل ہے، سیر العباد کا یہ نسخہ اب تک کے سب چھاپوں سے ہر لحاظ سے بہتر ہے۔

۴۔ احوال و آثار حکیم سنائی غزنوی، آقائے خلیل اللہ خلیلی حکیم سنائی کے بڑے قدرداں و شناسا ہیں، انھیں کی کوشش سے کلیات کا نسخہ مکشوف ہوا، یہ رسالہ ۴۱ سال قبل

لکھا گیا، اب سنائی کی مجلس تجلیل کے موقع پر دوبارہ اضافہ کے بعد علی اصغر بشیر کی توجہ سے شائع ہوا۔

۵۔ غزنہ در دو قرن اخیر۔ تالیف عزیز الدین وکیلی خطاط ہفت قلم کی تصنیف ہے افغانستان میں انیسویں اور بیسویں صدی میں جو تاریخی واقعات رونما ہوئے، ان کا قابل قدر مجموعہ ہے۔

۶۔ وضع اجتماعی در دورۂ غزنویاں، دکتور محمد اکبر مددی کی یہ قابل قدر اور محققانہ تالیف ایک مقدمہ اور حسب ذیل چھ فصلوں پر مشتمل ہے،

"براسی وضع اجتماعی، منابع درآمد، تشریفات وخاصان درگاہ، تجلیل جشنہا داعیاد، دین و مذہب، فرہنگ و پدیدہ ہائے تمدن،

غزنویوں پر ان موضوعات پر کوئی کتاب نظر سے نہیں گذری ہے۔

۷۔ گزیدہ اشعار سنائی، یہ سنائی کے اشعار کا ایک اچھا انتخاب ہے، مرتب محمد حسین نہضت ہیں، قصاید و غزلیات و مقطعات وغیرہ کا کافی حصہ ہے، حدیقہ، سیر العباد، کارنامۂ بلخ اور تحریمۃ القلم کے علاوہ سنائی کی طرف منسوب مثنویوں کا بھی انتخاب شامل کیا گیا ہے۔

۸۔ مقامات تاریخی غزنہ، یہ نہایت اہم تحقیقی کتاب ہے، جس کے مولف افغانستان کے نوجوان اور پرجوش دانشمند سرور ہمایوں ہیں، غزنہ یا غزنی یا غزنین نام کا دوسرا تلفظ ہے، یہ شہر تاریخی یادگاروں سے بھرا پڑا ہے، ان یادگاروں کے پرکھنے اور جانچنے کا کام آخری درجہ تک نہیں پہنچا ہے، آقائے سرور ہمایوں کی کوشش قابل ستائش ہے،

۹۔ مکاتیب سنائی، مکاتیب کا دوسرا ایڈیشن اس بات کا اعتراف ہو کہ سنائی کے نثری کلام پر اب تک کسی قسم کا اضافہ نہیں ہو سکا ہے، جو مقالے اس سیمینار میں پڑھے گئے

اُن میں سے کسی میں سنائی کے شعری کلام کی بابت کوئی گفتگو شامل نہ تھی، اس سے مزید واضح ہے کہ مکاتیب کی اشاعت (۱۹۶۲) سے اب تک اس سلسلے میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی، کابل سے واپسی پر راقم نے مکاتیب پر نظر ثانی کا کام شروع کر دیا، خوشی کی بات ہے کہ سنائی کے دو مکتوب (جو مطبوعہ نسخے میں زیر شمارہ ۵، ۱۴ شامل ہیں) ایک ایسے خطی مجموعے سے ملے جس کی کتابت ۵۴۳ ہجری میں ہوئی تھی، یہ مجموعہ ذ دعارفانہ تصانیف - بستان العارفین اور منتخب رونق المجالس پر مشتمل ہے، اس کے کاتب کا نام یحییٰ بن عمر بن خطیب الجرمخورانی ہے، مجموعے کے خاتمے پر سنائی کے دونوں خطوط... شامل ہیں، ترقیمہ کے الفاظ یہ ہیں -

"منتخب فی اخیر ربیع الاول من سنہ ثلث واربعین وخمسمایہ کتبہ یحیی بن عمر بن خطیب الجرمخورانی وحسبنا اللہ ونعم الوکیل"

یہ ترقیمہ سنائی کے خطوط کے خاتمے پر آیا ہے، اس سے اس مجموعے مع خطوط کی تاریخ کتابت ربیع الاول ۵۴۳ ہجری متحقق ہے۔ (باقی)

شعر العجم حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، اس کی عہد بعہد کی ترقیوں، اور اُن کی خصوصیات، وغیرہ سے بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ ہر دور کے ممتاز شعراء مثلاً رودکی، فردوسی، حکیم سنائی، عمر خیام، انوری، نظامی گنجوی کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تنقید ہے، مؤلفہ مولانا شبلی نعمانی، قیمت :- ۱۵- "منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

ہمدرد اسلامیکس

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

یہ سہ ماہی انگریزی رسالہ ہمدرد نیشنل فونڈیشن کراچی سے شایع ہوتا ہے، اس کے مدیر جناب حکیم محمد سعید ہیں، جو اپنی علم نوازی اور علم پروری کی خوش مذاقی کی وجہ سے نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی شہرت حاصل کر رہے ہیں، وہ اس برصغیر کے ان مایہ ناز لوگوں میں ہیں، جو اپنی غیر معمولی صلاحیت اور ذہانت سے طرح طرح کے کارنامے انجام دے رہے ہیں، انھوں نے پاکستان میں یونانی طب کو جس طرح از سر نو زندہ کیا ہے اس سے ان کی کلاہ پر امتیاز کی کلغی برابر لگی رہے گی، وہ علمی کاموں میں بھی برابر دلچسپی لیتے رہتے ہیں، پاکستان کی بڑی سے بڑی علمی سرگرمیوں میں ان کا نمایاں حصہ رہتا ہے،

ان کی علم نوازی کی ایک روشن مثال ہمدرد اسلامیکس" کا اجرا بھی ہے، جو عمدہ طباعت اور کاغذ کے ساتھ ان کی ادارت میں نکل رہا ہے، اس کے دو شمارے جلد اول نمبر ۲ اور دوسرا جلد دوم نمبر ا میرے سامنے ہیں، ان میں علمی، تاریخی، سیاسی اور مذہبی مضامین کے تنوع کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، مضمون نگار نہ صرف پاکستان

کے ہیں بلکہ امریکہ، کینیڈا، انگلستان، جرمنی، اور ایران کے بھی ہیں، جس سے اس رسالہ میں بین الاقوامی رنگ پیدا ہو گیا ہے، جناب حکیم محمد سعید کی خوبی یہ ہے کہ جس کام کو شروع کرتے ہیں، اس میں نفاست، عمدگی، اور خوش سلیقگی کا اعلیٰ معیار پیدا کر دیتے ہیں امید کہ یہ رسالہ جس شان سے نکلا ہے، اسی طرح یہ برابر نکل کر علم و فن کی دولت میں اضافہ کرتا رہے گا۔

اس رسالہ کے ایک شمارہ میں جناب حمود الرحمٰن (سابق چیف جسٹس، سپریم کورٹ پاکستان) کا ایک اہم مضمون "ریاست کا اسلامی تخیل" کے عنوان سے ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد کی حکمرانی کے اصول کا تجزیہ بڑی بالغ نظری سے کیا گیا ہے، ایک حکومت اور ریاست کا جو اعلیٰ نمونہ ہو سکتا ہے، اس کی تشکیل اس عہد میں ضرور کی گئی، مگر اس کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں ان کا حوالہ فاضل مضمون نگار کے مقالہ میں نہیں، کیا اس لیے کہ ان کو علماء اور فقہا صحیح اسلامی طرز حکومت قرار نہیں دیتے ہیں،

ایک عامی مسلمان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں؟ کیا وہ اسلامی حکومتیں نہ تھیں، اگر وہ اسلامی حکومتیں نہ تھیں تو کیا مسلمانوں کی بھی حکومتیں نہ تھیں؟ کیا ان میں اسلامی قوانین، وغیرہ رائج نہیں رہے؟ اور اگر ان میں اسلامی قوانین کی بالادستی رہی تو پھر ان کو اسلامی حکومتیں کیوں نہ کہی جائیں؟

پھر ایک ادنیٰ مسلمان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین کا جو انتخاب ہوا تو کیا یہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت یا تعلیم کے مطابق تھا؟ اگر تھا تو چاروں خلفاء کے انتخاب کا طرز علیحدہ علیحدہ کیوں رہا؟ اسی تو

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کے سربراہ کے انتخاب کے سلسلہ میں کوئی واضح ہدایت نہیں دی، اسی کے ساتھ کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ آپ کے یہاں حکمرانی کی سادی بنیادی باتیں تو ملتی ہیں مگر حکومت کے طرز اور تشکیل کی کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی، آپ نے ہر شعبۂ زندگی کی جزوی باتوں کی واضح تعلیم دی ہے، مگر طرز حکومت اور اسکی تشکیل کو بالکل غیر واضح چھوڑ دیا ہے، اسی لئے گذشتہ چودہ سو سال سے اس کی کوئی ایسی متعین شکل مرتب نہیں ہوسکی ہے، جو ہر اسلامی ملک میں یکساں طور پر مروج ہو، اسکی وجہ کیا یہ قرار دی جاسکتی ہے کہ حکومت جغرافیائی حالات اور زمانہ کے تحت بدلتی رہتی ہے، اس لیے ایک ملک یا ایک زمانہ کا طرز حکومت دوسرے ملک اور دوسرے زمانہ کے لیے ضروری نہیں کہ مفید اور موزوں ہو، اسلام ایک عالمگیر اور دائمی مذہب ہے، جو ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے ہے، اس لئے طرز حکومت اور اس کی تشکیل کا غیر واضح رہنا ہی مناسب ہے، کہ جب جیسی ضرورت ہو، اسی کے مطابق حکومت بنائی جائے، البتہ حکومت کے لیے کچھ بنیادی باتیں ایسی ہیں، جو ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر ماحول کیلئے لازمی ہیں، ان کی وضاحت ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کردی ہے، جو ایسی اعلیٰ سیاسی تعلیمات ہیں، جن پر فخر کیا جاسکتا ہے، آپ کی تعلیم یہ ہے کہ حکومت کا سربراہ اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ حاکمیت پر ایمان رکھتا ہو، کتاب وسنت کے احکام کا پابند ہو، شوریٰ پر عامل ہو، اسلامی مساوات و اخوت کا قائل ہو، اپنی حکومت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی دی ہوئی امانت سمجھتا ہو، اور وہ اس سے باز پرس کریں تو وہ جوابدہ ہو، متقی ہو، عوام و خواص کا اس پر اعتماد ہو، عادل ہو، بیت المال کا مصرف جائز طریقہ پر لیتا ہو، مسرف نہ ہو، خراج وصول کرنے میں ظلم و تعدی نہ کرتا ہو،

جنگ کرتا ہو تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر کرتا ہو، جنگ میں بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے ساتھ زیادتی نہ کرتا ہو، ان کو خواہ مخواہ قتل نہ کرتا ہو، آبادی کی کھیتی بلکہ درختوں کو بلا ضرورت برباد نہ کرتا ہو۔ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت ضرور دیتا ہو، اگر وہ قبول نہ کریں تو ان پر کوئی زبردستی نہ کرتا ہو، جزیہ لے کر ان کی عزت، مال اور عبادت گاہوں کی پوری حفاظت کرتا ہو وغیرہ وغیرہ، یہ وہ بنیادی باتیں ہیں جن سے انحراف کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، مگر حکومت کا طرز کیسا ہو؟ اس کی تشکیل کیسی ہو؟ اس کی پوری وضاحت نہیں، اگر جمہوری ہو تو کس قسم کی جمہوریت ہو؟ جمہوریت انتخابی ہو تو انتخاب کی قسم کیا ہو؟ انتخاب میں رائے دہندہ کون سے لوگ ہوں؟ لوگوں کے ووٹ کی اہمیت زیادہ دی جائے یا لوگوں کی عام مرضی کا خیال رکھا جائے؟ چاروں خلفائے راشدین کے انتخاب کی جو علیحدہ علیحدہ نوعیت رہی، اس سے ان سوالات کے واضح جوابات نہیں ملتے۔ یہ انتخاب نامزدگی کے ذریعہ سے بھی ہوا، چھ آدمیوں کی مجلس کے ذریعہ سے بھی عمل میں آیا، اور مختلف فیہ بھی بن گیا، البتہ یہ ایک بات ضرور واضح ہے کہ صحابۂ کرام کی اکثریت کی ہم نوائی انتخاب کا فیصلہ کن جزبنی، یعنی جو سربراہ ہو وہ رائے عامہ کے لئے قابلِ قبول ہو۔

یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں حکومت میں خاندانی وراثت تسلیم نہیں کی گئی، مگر سربراہ حکومت کے جمہوری طرز انتخاب کی نوعیت تیس برس کے اندر بدلتی گئی تو پھر کیا یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ زمانہ کی رفتار اور حالات کی تبدیلی سے حکومت کی نوعیت کا بھی بدلنا ناگزیر ہے، جس کی مثال خود ہماری تاریخ میں ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد نہ صرف بنو امیہ اور بنو عباس بلکہ جہاں مسلمان

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کے سربراہ کے انتخاب کے سلسلہ میں کوئی واضح ہدایت نہیں دی، اسی کے ساتھ کیا یہ کتنا غلط ہوگا کہ آپ کے یہاں حکمرانی کی سادی بنیادی باتیں تعلیم تیں مگر حکومت کے طرز اور تشکیل کی کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی، آپ نے ہر شعبۂ زندگی کی جزوی باتوں کی واضح تعلیم دی ہے، اگر طرز حکومت اور اسکی تشکیل کو بالکل غیر واضح چھوڑ دیا ہے، اسی لئے گزشتہ چودہ سو سال سے اس کی کوئی ایسی متعین شکل مرتب نہیں ہو سکی ہے، جو ہر اسلامی ملک میں یکساں طور پر مروج ہو، اسکی وجہ کیا یہ قرار دی جا سکتی ہے کہ حکومت جغرافیائی حالات اور زمانہ کے تحت بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے ایک ملک یا ایک زمانہ کا طرز حکومت دوسرے ملک اور دوسرے زمانہ کے لیے ضروری نہیں کہ مفید اور موزوں ہو، اسلام ایک عالمگیر اور دائمی مذہب ہے، جو ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے ہے، اس لئے طرز حکومت اور اس کی تشکیل کا غیر واضح رہنا ہی مناسب ہے، کہ جب جیسی ضرورت ہو، اسی کے مطابق حکومت بنائی جائے، البتہ حکومت کے لیے کچھ بنیادی باتیں ایسی ہیں، جو ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر ماحول کیلئے لازمی ہیں، ان کی وضاحت ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی ہے، جو ایسی اعلیٰ سیاسی تعلیمات ہیں، جن پر فخر کیا جا سکتا ہے، آپ کی تعلیم یہ ہے کہ حکومت کا سربراہ اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ حاکمیت پر ایمان رکھتا ہو، کتاب و سنت کے احکام کا پابند ہو، شوریٰ پر عامل ہو، اسلامی مساوات و اخوت کا قائل ہو، اپنی حکومت کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے لوگوں کی دی ہوئی امانت سمجھتا ہو، اور وہ اس سے باز پرس کریں تو وہ جوابدہ ہو، متقی ہو، عوام و خواص کا اس پر اعتماد ہو، عادل ہو، بیت المال کا مصرف جائز طریقہ پر لیتا ہو، مسرف نہ ہو، خراج وصول کرنے میں ظلم و تعدی نہ کرتا ہو،

جنگ کرتا ہو تو اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کی خاطر کرتا ہو، جنگ میں بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے ساتھ زیادتی نہ کرتا ہو، ان کو خواہ مخواہ قتل نہ کرتا ہو، آبادی کی کھیتی بلکہ درختوں کو بلا ضرورت برباد نہ کرتا ہو۔ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت ضرور دیتا ہو، اگر وہ قبول نہ کریں تو ان پر کوئی زبردستی نہ کرتا ہو، جزیہ لے کر ان کی عزت، مال اور عبادت گاہوں کی پوری حفاظت کرتا ہو وغیرہ وغیرہ، یہ وہ بنیادی باتیں ہیں جن سے انحراف کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، مگر حکومت کا طرز کیسا ہو؟ اس کی تشکیل کیسی ہو؟ اس کی پوری وضاحت نہیں، اگر جمہوری ہو تو کس قسم کی جمہوریت ہو؟ جمہوریت انتخابی ہو تو انتخاب کی قسم کیا ہو؟ انتخاب میں رائے دہندہ کون سے لوگ ہوں؟ لوگوں کے ووٹ کی اہمیت زیادہ دی جائے یا لوگوں کی عام مرضی کا خیال رکھا جائے؟ چاروں خلفائے راشدین کے انتخاب کی جو علحدہ علحدہ نوعیت رہی، اس سے ان سوالات کے واضح جوابات نہیں ملتے، یہ انتخاب نامزدگی کے ذریعہ سے بھی ہوا، چھ آدمیوں کی مجلس کے ذریعہ سے بھی عمل میں آیا، اور مختلف فیہ بھی بن گیا، البتہ یہ ایک بات ضرور واضح ہے کہ صحابۂ کرام کی اکثریت کی ہم نوائی انتخاب کا فیصلہ کن جز بنی، یعنی جو سربراہ ہو وہ رائے عامہ کے لئے قابلِ قبول ہو،

یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں حکومت میں خاندانی وراثت تسلیم نہیں کی گئی، مگر سربراہ حکومت کے جمہوری طرز انتخاب کی نوعیت تیس برس کے اندر بدلتی گئی تو پھر کیا یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ زمانہ کی رفتار اور حالات کی تبدیلی سے حکومت کی نوعیت کا بھی بدلنا ناگزیر ہے، جس کی مثال خود ہماری تاریخ میں ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد نہ صرف بنو امیہ اور بنو عباس بلکہ جہاں مسلمان

پہونچے وہاں کی حکومتیں خاندانی وراثت کے ساتھ چلیں، ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی رہی کہ یہ اسلام کی سیاسی اسپرٹ کے خلاف ہیں، مگر وہ موثر ثابت نہیں ہوئی، حتی کہ علماء اور فقہا نے بھی ان کو مجبوراً گوارا کر لیا، اگر علماء اور جمہور مسلمان اپنی ناراضگی کے باوجود ان سے تعاون کرتے رہے، اور انھوں نے ان کے دور حکومت میں اپنے کو خوش، خوشحال اور مطمئن پایا تو ان کے تعاون اور ان کی خوشی سے یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے غیر شعوری طور پر ان سے بیعت کر لیا؟ یا اگر انکی حکومتیں خاندانی رہیں، لیکن اسلام کے قوانین کی بالادستی کو اپنی حکومت میں شعوری یا غیر شعوری طور پر برقرار رکھا تو کیا ان کی خاندانی حکومتوں کو خارج از اسلام محض اس لئے سمجھا جائے گا کہ وہ خلافت راشدہ کے طرز پر نہ تھیں؟ خاندانی حکومتوں کے سربراہ اپنی نجی زندگی میں خلفائے راشدین کا تتبع نہ کر سکے، لیکن وہ اپنی حکمرانی میں اسلامی شعار، اسلامی حمیت اور اسلامی غیرت کی نگہبانی اور پشتیبانی حتی الامکان کرتے رہے، جس سے اسلام کی شان اور آن بان میں اضافہ ہوتا رہا، تو بھی ان کی تاریخ کو اسلام کے دائرہ سے خارج ہی کر دینا پڑے گا؟

میری ذاتی خواہش تو یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد جتنی حکومتیں جہاں بھی قائم ہوئیں، وہ ان ہی کے نمونے کی ہوتیں، ان کے سربراہ اپنی نجی اور پبلک زندگی میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ہی کی اعلیٰ مثالیں پیش کرتے رہتے، ان کے فوجی سپہ سالار حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح اور حضرت خالدؓ بن ولید ہی بنے رہتے، انکے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت سعید بن عامرؓ ہی بن کر اپنے فرائض ادا کرتے رہتے۔

ہماری اپنی خواہش جیسی بھی ہو، یا ہمارے مذہبی اور سیاسی جذبات چاہے اعلیٰ کتنے ہی ہوں، مگر تاریخ کے فیصلے کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے، خلفاے راشدین کی حکومت اعلیٰ اور ارفع اس لئے رہی کہ اس دور کے لوگ بھی اعلیٰ اور ارفع تھے، اس لئے اعلیٰ اور ارفع حکومت چل پڑی، مگر اس کے بعد زمانہ اور حالات کے بدلنے سے ویسے لوگ نہیں رہے، تو حکومت کے طرز اور اس کی تشکیل کی نوعیت بھی بدل گئی، خاندانی حکومتیں قائم ہوگئیں، جو گو اسلامی اسپرٹ کے خلاف تھیں، مگر تاریخ کا یہی فیصلہ ہوا جس کے بعد کیا یہ کہنا نہ پڑیگا کہ سیاست میں زمانہ کی ضرورت اور وقت کے تقاضے کو سامنے رکھنا ضروری ہے، ایک راسخ مسلمان کی حیثیت سے جناب محمود الرحمٰن صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام میں بادشاہت اور ڈکٹیٹر شپ کی کوئی جگہ نہیں ہے، (جلد دوم، نمبر ا صفحہ ۵۵) دارالمصنفین بھی اسی مکتبِ فکر کا قائل ہے، مگر ایک عامی مسلمان یہ سوچتا ہے کہ نظری حیثیت سے اسلام میں بادشاہت کی جگہ نہ رہی ہو، مگر عملی حیثیت سے تو اسلام کی تاریخ میں بادشاہت کی جگہ نمایاں رہی، اگر خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کی جیسی خاندانی حکومتیں قائم ہوتی ہیں، وہ سب غیر اسلامی قرار دی جائیں تو پھر اسلام کی سیاسی تاریخ ہمارے پاس کیا رہ جاتی ہے؟ ان کو اسلام کے سیاسی جسم کا بدگوشت سمجھ کر کاٹا نہیں جا سکتا، نہ صرف عام مسلمان بلکہ علماء اور صلحا بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کے کارناموں پر فخر کرتے رہے ہیں

دنیا کے مسلمان یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ دور کے اسلامی ممالک میں کہیں خاندانی حکومتیں ہیں، کہیں جمہوریت ہے، اور کہیں فوجی ڈکٹیٹر شپ ہے، یہ سب اصطلاحاً اسلامی حکومتیں ہی سمجھی جاتی ہیں، ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں سے اپنی حکومت

شروع کی یعنی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں آج خاندانی حکومت ہی قائم ہے، جلالۃ الملک امیر فیصل مرحوم اسلام کی شمع کے پروانہ سمجھے جاتے تھے، ان کے خلاف یہ کہہ کر جنگ کرنے کی کوشش کی جاتی کہ وہ خاندانی حکومت کے ایک سربراہ بن کر اسلام کی سیاسی اسپرٹ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، تو کیا اس جنگ کی کوئی حمایت کرتا؟ خود پاکستان میں اس وقت فوجی ڈکٹیٹرشپ قائم ہے، وہاں کے علماء اور سیاسی مدبرین نیا انتخاب کرانے کے تو مصر ہیں، مگر جنرل ضیاء الحق کو غیر اسلامی طرز حکومت کا سربراہ قرار نہیں دیتے، بلکہ جنرل صاحب اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے جس طرح خواہاں اور کوشاں ہیں، اس بنا پر ان کے پرستار ان کو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ دینے کے لیے تیار ہیں، جو اسلام کی تاریخ کے عظیم المرتبت حکمرانوں کو دیا گیا ہے، پھر پاکستان میں اب تک برطانوی طرز کی پارلیمانی حکومت قائم ہوتی رہی، یا آئندہ جو ہوگی، یا عورتوں کو انتخابی مہم میں ووٹ دینے، یا ان کو دستور ساز مجلسوں کی رکنیت بلکہ ان کی صدارت کے لئے انتخاب لڑنے کا جو حق دیا گیا، یا ملک کے دستور بننے کے بعد کتاب وسنت سے زیادہ اس کی جو اہمیت دی گئی، یا سربراہ حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تجویزیں پیش کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے، یا مجلس شوریٰ یعنی قانون ساز مجلسوں کو بالائی اور زیریں حصوں میں تقسیم کرکے جو تفریق پیدا کی گئی ہے، یا صوبوں میں خودمختاری کی جو مہم چلائی جاتی ہے، یا عدلیہ میں غیر اسلامی قوانین کے ذریعہ سے مقدموں کے جو فیصلے ہوتے رہے یا صدر، وزیر اعظم، اور بیرونی ممالک کے سربراہوں کے استقبال میں جس تزک و احتشام سے قیصر و کسریٰ کی روایت کے مطابق دعوتیں ہوتی رہتی ہیں، الخ الخ کیا ان سب کی مثالیں خلافت راشدہ کے عہد میں ملتی ہیں، مگر پاکستان

کیا دوسرے اسلامی ممالک میں بھی یہ چیزیں گوارا کی جا رہی ہیں، اور آیندہ بھی کی جائیں گی، اور یہ کہا جاتا رہے گا کہ وقت کا تقاضا یہی ہے، پھر نہ صرف سعودی عرب بلکہ یمن، اردن، اور مراکش میں اب بھی بادشاہیت ہے، اس کو کیوں انگیز کیا جا رہا ہے، کیا اسی لئے تو وہاں کے ماحول اور حالات کے تقاضے کی بنا پر یہ ناگزیر ہیں، یورپ کی مثال بھی سامنے ہے، وہاں ہر قسم کے نظری اور فکری سیاسی تجربے کے بعد کوئی ایسا سیاسی نظام وضع نہ ہو سکا جو وہاں کے ہر ملک کے لئے یکساں ہو، کہیں بادشاہت ہے، تو کہیں پارلیمانی جمہوریت ہے، کہیں صدارتی نظام ہے، کہیں آمرانہ حکومت رہی، تو کہیں کمیونزم ہے ایک زمانہ میں بادشاہ کو خدا کا سایۂ ظل الٰہی اور بھگوان کا اوتار سمجھا جاتا رہا، مگر اب ایک بادشاہ ملک سے دربدر ہونے اور دوسرے ملکوں میں جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، اس جمہوری دور میں جمہوریت کو بڑی رحمت سمجھا جاتا ہے، مگر یہ بھی ناکام رہتی ہے تو فوجی ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جاتی ہے، جو کچھ دنوں کے لیے تو ضرور جمہوریت سے زیادہ باعث رحمت سمجھی جاتی ہے۔

اس تحریر کے لکھنے کا مقصد عام مسلمانوں کی ذہنی الجھنوں اور خلشوں کی ترجمانی کرنی ہے کہ وہ کس طرز حکومت کو اچھا اور کس کو رد کر دیں، وہ صدیوں تک بادشاہت کی دل آویزیوں اور رعنائیوں سے متاثر کیے گیے، اب وہ جمہوریت کے نغمے سے مسحور کئے جا رہے ہیں، وہ خود چاہتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے طرز کی حکومت ہر اسلامی ملک میں قائم ہو، مگر کہیں قائم نہ ہوئی اور نہ قائم ہونے کی امید ہے، پھر ایسے مسلمانوں کا ذہن مستقل طور پر سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔

ہمارے سیاسی مفکرین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مورخانہ، ناقدانہ اور

مفکرانہ انداز میں غور کریں کہ اسلامی تاریخ میں تیس برس کے بعد ہم کسی جگہ خلافت راشدہ کے طرز کی حکومت آخر کیوں قائم نہیں ہو سکی، اس کے عوامل کیا تھے، خاندانی حکومتیں کیوں چل پڑیں؟ ان سے اسلام کو کیا نقصان پہنچا؟ ان سے کیا اسلام کی سطوت میں اضافہ نہ ہوا؟ ان کا زوال بھی ہوتا رہا، جس سے اسلام کے ناموس پر بھی اثر پڑا، ان کے زوال کے وجوہ کی بھی چھان بین کی ضرورت ہے، اور اب جب کہ جمہوریت کا دور ہے، یہ غور کرنا ہے کہ خلافت راشدہ کے طرز کی جمہوریت قائم ہو سکتی ہے کہ نہیں یا یہ اتنی اعلیٰ اور ارفع ہے کہ اس طرز کی حکومت کا بروئے کار آنا موجودہ دور میں ممکن نہیں، اگر ممکن نہیں تو پھر کون سی جمہوریت اسلامی کہلا سکتی ہے، جن اسلامی ملکوں میں بادشاہت ہے وہاں یہ ختم کی جا سکتی ہے کہ نہیں، یا ایران اور افغانستان کے انقلاب کی طرح چھوڑ دی جائیں کہ وہ خود ہی انقلاب کی نذر ہو جائیں گی، لیکن ایسے انقلابات کے بعد کمیونزم بھی آجاتا ہے، بعض ایسے ملک بھی ہیں جو کہلاتے تو اسلامی ہیں، مگر وہاں کے ارباب حکومت سوشلزم اور کمیونزم کی طرف مائل ہیں، کیوں؟ کیا اس لئے کہ اسلام کا سیاسی اور اقتصادی نظام ان کی مشکلوں کا حل نہیں کر سکتا ہے؟ دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت کی اب بھی دلی خواہش ہے کہ اسلامی ممالک میں اسلامی قوانین، اسلامی روایات، اسلامی غیرت اور اسلامی حمیت کی بالادستی اور حاکمیت ہو، خواہ طرز حکومت کیسا ہی ہو، اسی لیے اسلامی اسپرٹ کے خلاف جب کبھی کہیں حکومت کی باگ ڈور فوج کا کوئی عہدیدار سنبھال لیتا ہے، اور وہ ڈکٹیٹر بن کر اسلام کی عزت و ناموس کا نقیب بن جاتا ہے، تو وہ اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، مگر

جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کا یہ نقیب اسلام کی بالادستی اور حاکمیت سے ماڈرنزم، سوشلزم، کمیونزم اور طرح طرح کے ازم کے زیر اثرات کا تریاق پیش نہیں کر رہا ہے، اور ان کی اقتصادی مشکلوں، سیاسی الجھنوں اور روزمرہ کی عملی زندگی کی پیچیدگیوں کو دور نہیں کر رہا ہے تو وہ بددل ہو کر اپنے ہی سے یہ سوال کرنے لگتے ہیں کہ کیا اسلام زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا؟ کیا یہ ہماری سیاسی، اقتصادی اور عملی زندگی کی پیچیدگیوں اور دشواریوں کو دور نہیں کر سکتا، کیا اسلام کا اعلیٰ سیاسی تخیل صرف کتابوں ہی میں لکھنے کی چیز رہ گئی ہے؟

ان سوالات کے تشفی بخش جوابات ہی میں سیاست کے اسلامی تخیل کی عملی کامیابی کا راز مضمر ہے، یہ جوابات اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ کے اوراق میں بھی مل جائیں گے، اس مدت میں ہر جگہ خاندانی حکومتیں ہی ضرور قائم ہوئیں ان کے بعض حکمرانوں کی سیاہ کاریوں اور خامیوں پر اگر ہم آنسو بہا سکتے ہیں، تو ان کے بعض فرمانرواؤں کی اولوالعزمیوں اور بیدار مغزیوں سے درس اور بصیرت بھی حاصل کر سکتے ہیں، ان میں سے بعض بادشاہوں کی بدعنوانیوں اور مطلق العنانیوں پر ہم ضرور لعنت بھیج سکتے ہیں، مگر ان میں سے کچھ ایسے بھی گزرے ہیں، جن کی اسلامی حمیت اور اسلامی غیرت کی مثالوں سے موجودہ دور کی اسلامی سیاست میں تابناکی، اور درخشانی پیدا کی جا سکتی ہے، ان سب حکومتوں کے عروج و زوال کے اسباب وعلل کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اسلامی سیاست کی پولیٹیکل سائنس مرتب کی جا سکتی ہے، اور اب سے پہلے کی جا چکی ہے، مگر ضرورت اس کی ہے کہ ان کو جدید رنگ میں پیش کر کے جدید ذہن کو مطمئن کیا جائے۔

کیا ہم رسالہ "ہمدرد اسلامیکس" سے اس کی توقع کریں کہ اس قسم کے مباحث پر زیادہ سے زیادہ مضامین شائع کر کے مسلمانوں کے الجھے ہوئے ذہن کو صاف کرنے کی کوشش کریگا، اس کے صفحات ان مباحث کے لئے زیادہ موزوں ہیں، کیونکہ اسکے مضمون نگاروں کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ ان مباحث کو بین الاقوامی رنگ بھی دے سکتا ہے۔

اس رسالہ کے ایک لایق مضمون نگار جناب اے۔ ایس۔ بزمی انصاری صاحب نے ایک کتاب کے ریویو کے سلسلہ میں مسلم سوسائٹی کے بعض موجودہ، معاشرتی مسائل" کے عنوان سے شاید بہت دکھ سے سیکولرزم، ماڈرنزم، بینک کے منافع، روایت پرستی، عفو، زکوٰۃ، مخلوط تعلیم اور آزادی نسواں پر بڑی اچھی بحث کی ہے، پھر ایک اور مضمون نگار رفیع الشہاب صاحب نے مسلمانوں میں طریق شادی اور جہیز کے سلسلہ میں کچھ سوالات اٹھائے ہیں، مگر چودہ سو سال کے بعد ابھی تک ان مسائل کو سلجھانے میں مسلمان الجھے ہوئے ہیں تو پھر کیسے امید کی جائے کہ اسلامی ممالک کے لوگ ایسے سیاسی نظام کی تشکیل کر سکیں گے، جو خلافت راشدہ کے نمونہ کا ہو۔

مگر زندہ قوم اپنی مایوسیوں پر قابو پالیتی ہے، اور فاتح اور کامران بن کر بھی ابھرتی ہے، اگر اسلامیکس ایسے مسائل پر جاندار اور باوقار مضامین شایع کرا کے اسلامی ممالک کے مسلمانوں کے ذہن کو بیدار کر دے تو یہ اس کی بڑی خدمت ہوگی۔

"م۔ ع"

مطبوعاتِ جدیدہ

امریکہ میں دو مہینے: مرتبہ مولانا محمد رابع حسنی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۰۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت:- ۱۵ روپیے، پتہ:- مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو دعوت وتبلیغ کے کام سے فطری مناسبت اور دلچسپی ہے اس غرض سے وہ ہندوستان کے مختلف گوشوں کے علاوہ اکثر اسلامی ملکوں اور یورپ کا سفر کر چکے ہیں، دو برس قبل شمالی امریکہ کے مسلم طلبہ کی انجمن ایم۔ایس۔اے۔کی دعوت پر اس کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لئے وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ وکناڈا تشریف لے گئے تھے، وہاں انھوں نے امریکہ کے بڑے بڑے شہروں، اہم صنعتی وتہذیبی اداروں، قدرتی مناظر اور بعض دیہاتوں کے علاوہ کالجوں یونیورسٹیوں، علمی، تعلیمی، مذہبی وثقافتی اداروں اور انجمنوں کی بھی سیر کی، مختلف مذاہب و ملل کے افراد علمی، تعلیمی، اور مذہبی اشخاص سے ملاقات کی اور تبادلۂ خیال کیا، موجودہ امریکی زندگی کے خط وخال اور اس کی تعمیر وترقی اور تہذیب ومعاشرت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا، اور تعلیمی علمی، دینی، اخلاقی، تمدنی، اور سیاسی حالات کا قریب سے جائزہ لیا، زیر نظر کتاب اُن کے مشاہدات وتاثرات اور سفر امریکہ کی روداد ہے جس کو اُن کے رفیق سفر اور بھانجے مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے اُن کے ایماء سے قلمبند کیا ہے، وہ سفر کے دوران اعداد وشمار اور روزمرہ کے واقعات کی یادداشتیں لکھتے جاتے تھے، بعد میں ان تحریروں اور امریکہ سے متعلق

دوسری کتابوں کی مدد سے یہ دلچسپ اور پُراز معلومات سفرنامہ مرتب کیا، جس کو خود مولانا نے بھی اشاعت سے قبل پڑھوا کر سُنا اور اس میں ضروری و مناسب ترمیم و اضافہ کیا، اس طرح اس کتاب میں ان دونوں صاحبوں کے احساسات و تاثرات شامل ہیں، علاوہ ازیں اس میں مولانا کی علمی، دعوتی گفتگو، اہم مسائل کے بارہ میں ان کا اظہار خیال، اور ان کی امریکی تقریروں کا خلاصہ بھی دیا گیا ہے، جو کتاب کی صورت میں اب علٰحدہ بھی چھپ گئی ہیں، مولانا کو عرصہ سے نزول الماء کی شکایت تھی، اس سفر میں انھوں نے آنکھ کا آپریشن کرایا، اس کی سرگذشت' اسپتال کی خصوصیات اور دوسری قابلِ ذکر باتیں بھی ذکر کر دی گئی ہیں، یہ سفر دعوتی تھا' اس لئے اس میں امریکہ میں دین کی اشاعت کے امکانات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اور وہاں کے مسلمانوں کے حالات و معاملات، اور اُن کی بعض تحریکوں اور مذہبی فرقوں کے عقائد و رسوم کے بارہ میں مفید معلومات بھی درج کی گئی ہیں، اس کے علاوہ میزبانوں، ملاقاتیوں اور استفادہ کرنے والوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اہم مقامات اور عمارتوں کی تصویریں بھی شامل ہیں اس کتاب سے موجودہ امریکہ کا تعارف ہو جاتا ہے، اور وہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویر سامنے آجاتی ہے، مصنف نے جہاں سائنس، ٹکنالوجی، علوم و فنون اور معیشت و تمدن میں امریکہ کی برتری و ترقی کا ذکر کرکے دکھایا ہے، کہ ع

افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

وہیں اس کے اخلاقی زوال، دینی پستی جرائم میں اضافہ، مادہ پرستی، خدا بیزاری، خود غرضی، مفاد پسندی، قومی عصبیت، اور نسلی برتری وغیرہ کی تفصیل بیان کرکے بتایا ہے؛

ع :- جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا

اس اعتبار سے یہ کتاب امریکہ کی خوبی و خامی دونوں کا مرقع ہے، اور اس کی مطالعہ سے

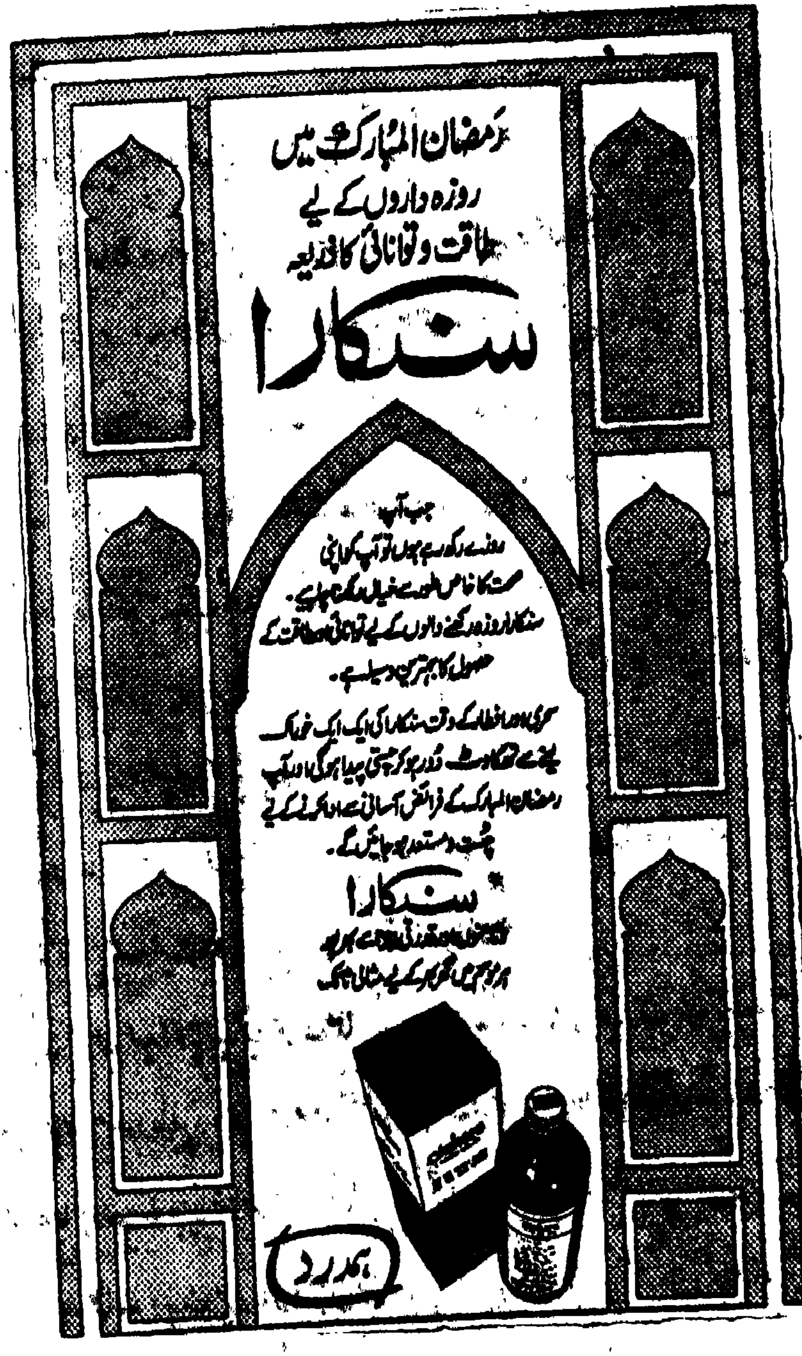
ان لوگوں کو بھی امریکہ کے بارے میں بہت کچھ واقفیت ہو سکتی ہے، جن کو اس کے سفر کا اتفاق نہیں ہوا ہے،

سیرت طیبہ از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۴۴ مجلد قیمت ۱۰ روپیے، پتہ:۔ مکتبہ علمیہ قاضی واڑہ میرٹھ،

اس کے پہلے اڈیشن پر معارف میں عرصہ ہوا تبصرہ ہو چکا ہے، یہ دوسرا اڈیشن ہے، اس میں آنحضرت ﷺ کی پیدائش سے وفات تک کے اہم واقعات ہیں، شروع میں بعثت نبوی سے پہلے کے عرب و عجم کے حالات پر ایک نظر بھی ڈالی گئی ہے، تاکہ شب ظلمت کے بعد صبح صادق کا صحیح اندازہ ہو سکے، کتاب کے مصنف محتاج تعارف نہیں ہیں، جدید و قدیم دونوں حلقے ان سے بخوبی واقف ہیں، کتاب میں صحیح و مستند واقعات دلنشین پیرائے میں لکھے گئے ہیں، امید ہے کہ یہ اڈیشن بھی پہلے کی طرح مقبول ہوگا،

شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خلاف پروپگنڈا } مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۳، مجلد، مع گرد پوش، قیمت ۵ روپیے، پتہ:۔ مکتبہ الفرقان لکھنؤ،

شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی سے علماء کے ایک طبقہ کو بدگمانی ہے، اسے دور کرنے کے لئے عرصہ ہوا مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی مفصل کتاب شائع ہوئی تھی، زیر نظر کتاب میں بھی اس کا رد ہے، شرک و بدعت کے حامیوں، بے دین عناصر، اور استعمار پسند انگریزوں نے شیخ کے خلاف بڑا پروپگنڈا کیا تھا، اس سے علمائے دیوبند میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا حسین احمد مدنی بھی متاثر ہو گئے تھے، مگر بعد میں اُن کا نقطۂ نظر بدل گیا تھا، مولانا محمد منظور نعمانی نے اس کتاب میں ان حضرات کا یہ موقف بھی تحریر کیا ہے اور شیخ کی صفائی بھی دی ہے، اگر اس کے ساتھ مشاہیر دیوبند کی اس قسم کی تحریریں بھی شیخ کے بارہ میں درج کر دی جاتیں تو کتاب کی افادیت اور بڑھ جاتی، "ض"


رمضان المبارک میں
روزہ داروں کے لیے
طاقت و توانائی کا ذریعہ
سنکارا
جب آپ
روزے رکھ رہے ہوں تو آپ کو اپنی
صحت کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیے۔
سنکارا روزہ رکھنے والوں کے لیے توانائی اور طاقت کے
حصول کا بہترین وسیلہ ہے۔
سحری اور افطار کے وقت سنکارا کی ایک ایک خوراک
پینے سے تھکاوٹ دور ہو کر چستی پیدا ہو گی اور آپ
رمضان المبارک کے فرائض آسانی سے ادا کرنے کے لیے
چست و مستعد ہو جائیں گے۔
سنکارا
ہمدرد

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

عہدِ رسالت سے لے کر اب تک ہر دور میں احادیثِ نبوی کی نقل و روایت کا سلسلہ برابر جاری رہا یہ احادیث عرب و حجاز ہی میں نہیں پوری دنیائے اسلام میں بکھری ہوئی تھیں، محدثین کرام کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ایسے زمانہ میں جبکہ آج کل کی طرح سفر کی سہولتیں میسر تھیں نہ اور نشر و اشاعت کے اتنے وسیع ذرائع و وسائل موجود تھے، دنیائے اسلام کا ایک ایک چپہ چھان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و ارشادات کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع کیا، اُن کے مجموعے مرتب کئے، سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے مقدس سلسلوں کے مکمل ہونے کے بعد حضرت سید صاحب علیہ الرحمۃ کو ان محدثین کرام کے حالات مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، امام بخاری پر ایک مضمون اور صاحب موطا امام مالک کی سوانح عمری وہ خود بھی لکھ چکے تھے، یہ کام ان کی وفات کے بعد یہاں کے رفیق مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد کیا گیا، جس کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، اور دو حصے اور شائع ہوں گے، ان میں سے ایک حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات پر مشتمل ہوگا اور یہ حصہ زیرِ ترتیب بھی ہے،

حصہ اول میں امام مالک اور ائمۂ صحاح کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحبِ تصنیف محدثین کرام مثلاً عبد الرزاق، امام عبید، امام احمد بن حنبل، امام طحاوی وغیرہ کے حالات و سوانح، اور فنِ حدیث سے متعلق ان کی شاندار خدمات کو مستند حوالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، حصہ دوم میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور صاحبِ تصنیف محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی حدیثی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے تیسرے حصہ میں آٹھویں صدی ہجری کے بقیہ محدثین سے تا زمانۂ حال کے محدثین کے حالات ہوں گے، مرتبہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی

قیمت حصہ اول: ۱۲-۵۰ قیمت حصہ دوم: ۳-۲۵ منیجر

ستمبر ۱۹۷۹ء

شوال ۹۹ھ

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

جلد ۱۲۴ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۹ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

آہ مولانا عبدالسلام قدوائی !

آنکھیں اشکبار ہیں، دل اندوہ وغم کا جوئبار ہے جب یہ قلم نگار ہو کر لکھ رہا ہے کہ مولانا عبدالسلام قدوائی جو دارالمصنفین کی علمی اور نجی مجلسوں کی رونق، عزت اور آبرو تھے، ہم سب کو چھوڑ کر یکایک آغوش رحمت الٰہی میں چلے گئے،

……

وہ ۱۹۷۵ء میں دارالمصنفین اُس وقت آئے جب جناب شاہ معین الدین احمد ندوی سابق ناظم دارالمصنفین کی رحلت سے یہاں کا پتہ پتہ، بوٹا بوٹا سوگوار اور بے رونق ہو رہا تھا، وہ یہاں آئے تو اپنے جلو میں علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی بے پناہ عظمت، اپنے اُستاد مولانا سید سلیمان ندویؒ کی غیر معمولی عقیدت، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی شخصیت سے اپنی مخلصانہ محبت اور خود اپنی ذات کی لینت، مروت اور ملاطفت کا لشکر ساتھ لائے، اور اس راقم سے ایسے گھل مل گئے کہ ہم دونوں کے درمیان شیر و شہد کی کوزہتی نظر آنے لگی، اُن کی آمد سے دارالمصنفین کی سرگرمیوں میں شادابی اُس کی امیدوں کے پھولوں میں رعنائی اور اس کی تمناؤں کے مرغزاروں میں دل فریبی پیدا ہونے لگی، مگر معلوم نہیں مصلحت خداوندی کیا تھی کہ دارالمصنفین کے

رفقاء، اُن کی علمی بصیرت، اور بزرگانہ الفت سے ہر طرح کا استفادہ کر رہے تھے، کہ وہ اچانک دائمی طور پر اُن سے جدا ہو گئے، وہ ۲۷ رمضان المبارک کو تراویح پڑھ کر اور تہجد اور فجر نماز ادا کر کے چار بجے صبح اعظم گڈھ سے اپنے وطن تھلینڈی ضلع رائے بریلی عید منانے روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کے دوسرے روز سحری کے وقت اٹھے، یکایک بیہوش ہوئے اور جمعہ کے روز گیارہ بجے دن کو اللہ کو پیارے ہو گئے، دوسرے دن عید کی نماز کے بعد اُن کی طالب علمی کے محبوب اور شفیق ترین ساتھی اور اسلامی ممالک کے فاضل اجل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اُن کے سات سو گوار بیٹوں اور ہزاروں آدمیوں کے ساتھ اُن کے جنازہ کی نماز پڑھائی اور وہیں گوناگوں خوبیوں کا یہ مجسمہ سپرد خاک کر دیا گیا،

.....

اُن کا سنہ پیدائش ۱۹۰۶ء تھا، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تحصیل علوم کے بعد مزید تعلیم کے لئے جامعہ ملیہ دہلی گئے، وہاں سے بمبئی کے اُس زمانہ کے مشہور اخبار خلافت کی مجلس ادارت میں شریک ہو گئے، پھر ۱۹۳۴ء میں ندوہ میں مدرس کی حیثیت سے بلائے گئے، لکھنؤ میں ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا، جہاں تعلیم یافتہ حضرات کو کلام مجید کا درس دیتے، اور آسان ریڈروں کے ذریعہ سے عربی سکھاتے، یہاں سے ایک جریدہ تعمیر بھی مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ شائع کرتے رہے، پھر جامعہ ملیہ میں دینیات کے استاد مقرر ہوئے، جہاں اکیس سال تک اس درس گاہ کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کرتے رہے، وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد ندوہ کے اعزازی معتمد تعلیم بنائے گئے، پھر جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے بعد مولانا ابوالحسن علی کی خواہش پر دارالمصنفین کی کشتی کے دیدبان بن کر آئے،

.....

ان تینوں اداروں سے اُن کو عشق رہا، ندوہ اُن کی لیلیٰ تھی، جامعہ ملیہ اُن کی عذرا تھی، دارالمصنفین اُن کے لئے شیریں بنی ہوئی تھی، یہاں فرہادین کر اس کے لئے جوئے شیر نکالنے کی فکر میں تھے کہ اسی فکر کا تیشہ لئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی،

٭٭٭

اُن کی شخصیت ایک عطر مجموعہ تھی، وہ ایک بہت اچھے انسان، بہت اچھے دوست بہت اچھے شاگرد، بہت اچھے استاد، بہت اچھے شوہر، بہت اچھے باپ اور بہت اچھے عالم تھے، اُن کا دل چیر کر دیکھا جاتا تو اُن کے سویدائے دل کے اندر حسین اور شامہ نواز گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دیتیں، وہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ مصری کی ڈلی چبا رہے ہیں، اور اپنے مخاطب کا من موہ رہے ہیں جس کے ساتھ رہتے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ وہ حبیب ہیں کہ محبوب، ندوہ میں اُن کے ہم درس رئیس احمد جعفری مرحوم تھے، جو اُردو کی بے شمار تصانیف کے مشہور مصنف ہوئے، اُن سے بچھڑے ہوئے خدا جانے کتنی مدت گزر چکی تھی، مگر شاید ہی کوئی روز ایسا گذرتا، جب وہ اُن کی یادوں کی برات نہ سجاتے، مولانا ناظم ندوی بھی ان کے ہم درس تھے، اب وہ کراچی میں ہیں، اُن کا ذکر آتا تو کہتے کہ اُن سے ایک بار ملاقات ہوجاتی تو پھر دنیا سے جانے کا افسوس نہ ہوتا، ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بھی ان کا ساتھ رہا، اُن کی ہر دلعزیزی کے جلووں، اُن کی محبوبانہ اداؤں، اور اُن کی علمی دلربائیوں کا تو وظیفہ پڑھتے رہتے،

٭٭٭

اُن کے تین محبوب استاد تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا حیدر حسن خاںؒ اور مولانا شبلی جیراجپوری مرحوم، ان تینوں کا ذکر خیر اس طرح کرتے، جیسے ابھی ابھی

اُن سے مل کر آئے ہیں، سید صاحبؒ کی گھریلو زندگی کے کچھ واقعات ایسے سناتے کہ اُن کی خبر مجھ کو بھی نہ تھی، حالانکہ مجھ کو اُن کے گھر کے اندر بھی ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، وہ سید صاحبؒ کی علمی جلالت کے بے حد قائل تھے، کہتے کہ اُن کے ایسا روشن دماغ اور دیدہ ور عالم عرصہ دراز تک پیدا نہ ہو سکے گا، وہ مولانا حیدر حسن خانؒ سے گرویدہ ہو کر اُن سے بیعت بھی ہو گئے تھے، اُن کی آن بان اور تدریسی شان کا ذکر مزے لے لے کرتے، معارف میں اُن پر جو مضمون لکھا تو لکھتے وقت اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دینے کی فکر میں رہے، انھوں نے مولانا شبلی جیراجپوری پر بھی معارف میں ایک مضمون لکھا تو اُن کے پاس خطوط آئے کہ مولانا مرحوم کی اصلی عظمت اس مضمون سے معلوم ہوئی،

.....o☆o.....

کلام مجید کا درس دینے اور عربی زبان سکھانے میں اُن کو خاص لذت ملتی تاریخی لطیفوں، علمی چٹکلوں، اور ادبی بذلہ سنجیوں کے ساتھ کلام پاک کے رموز و نکات مزے لے لے کر بیان کرتے، چالیس روز میں عربی سکھا دیتے، اُن کے عربی کے قاعدے ہندوستان اور پاکستان میں بہت مقبول ہیں، بچوں کی ذہنی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے، دارالمصنفین سے بچوں کے لئے اُن کی دو کتابیں ہماری بادشاہی اور ہندوستان کی کہانی شائع ہوئیں تو ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہوتی رہتی ہیں، وہ جہاں بھی رہتے، اپنے شاگردوں کو بہت عزیز رکھتے، اُن کی خاطر ارباب حل و عقد سے بھی اختلاف کرتے، چاہے وہ اُن کے عزیز دوست ہی کیوں نہ ہوتے،

.....o☆o.....

وہ ایک شفیق شوہر بھی تھے، اُن کے دوستوں کی بیویوں کو رشک ہوتا کہ اُن کے

شوہر بھی ان ہی کی طرح ہوتے، اُن کے بچے اُن کی شفقت و محبت کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں جس طرح پلے، کم بچے اپنے باپ کے زیر سایہ اس طرح پلے ہوں گے، اُن کے یہاں و ھتکار اور پھٹکار کی کوئی گنجائش نہ تھی، اُن کے پیار اور چمکار سے اُن کے گھر کی فضا خوشگوار بنی رہتی،

.....٥.....

اُن کی خطابت کی بھی عجیب دلربایانہ شان تھی، جمعہ کے روز منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تو معلوم ہوتا کہ

ع بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

وہ چٹکلے اور گھریلو قصے بیان کر کے اُن کو کلام پاک کی آیات، حدیث کی روایات اور اسلامی تاریخ کے واقعات سے اس طرح جوڑ دیتے کہ اُن سے نہ صرف اُن کی بالغ نظری اور روشن ضمیری کی فضا پیدا ہو جاتی، بلکہ سامعین بھی اپنی روح میں ایک طرح کی بالیدگی اور ذہن میں ایک قسم کی بیداری محسوس کرتے، دارالمصنفین اُن کے خطبہ کی وجہ سے بھی بیت الحکمت اور مذہبی تربیت گاہ بن گیا تھا،

اُن کا علمی مطالعہ بھی بہت وسیع تھا، جو کچھ پڑھا تھا مستحضر رہا، کلام پاک، تفسیر، حدیث، رجال، علم کلام، تصوف، تاریخ، ادب، سیاست، حتیٰ کہ ناول نگاری اور افسانہ نویسی پر جب کبھی گفتگو آجاتی تو کچھ نہ کچھ ایسے نکتے بیان کر جاتے کہ یکایک ذہن کے دریچے کھل جاتے، یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ راقم نے اُن کے بعض ایک دو جملوں پر معارف کے لئے لمبی لمبی تحریریں لکھیں، وہ علمی مشورے کچھ ایسے میٹھے اور پیارے انداز میں دیتے کہ موضوع کی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتیں، وہ علمی کاوشوں کے لئے جس طرح اکساتے، خفتہ علمی جذبات کو

جس طرح بیدار کرتے، پھر ان میں جس طرح جوت جگا دیتے، وہ نہ صرف میرے بلکہ دارالمصنفین کیلئے بڑی دولت رہی، وہ ان لوگوں میں سے تھے جن سے علمی بصیرت کا درس لیا جا سکتا تھا بشرطیکہ کسی میں یہ درس لینے کی صلاحیت ہو،

••••

وہ مسلمان اور عصری تقاضے، سورۂ بقرہ کی تفسیر، ہماری بادشاہی، ہندوستان کی کہانی، عربی کے دس سبق، قرآن مجید کی پہلی کتاب، (پارہ الم) اور قرآن مجید کی دوسری کتاب (سیقول) وغیرہ کے مصنف تھے، مگر میرے لئے وہ بہت سی اور یادیں بھی چھوڑ گئے ہیں، ان کا وہ درد بھی یاد آئے گا، جو وہ دارالمصنفین کے لئے اپنے پاک اور بلور کی طرح جھلکتے ہوئے دل میں رکھتے تھے، وہ لمحات بھی یاد آئیں گے، جب ہم دونوں دارالمصنفین کے سبزہ زار پر بیٹھ کر اس کے مستقبل کو سوچتے، وہ سامنے کھلے ہوئے گلاب کو دیکھ کر کہہ اٹھتے کہ اس دارہ کی علمی روایات میں گلاب ہی کی شادابی اور رنگینی رہی ہے، کیا وہ آیندہ بھی باقی رہے گی، پھر مایوسانہ لہجے میں کہتے کہ دارالمصنفین کے اسلاف نے خدمت اور ایثار کے جو نمونے پیش کئے ہیں، وہ اب نہیں ملیں گے، یہ پیسے کے پیچھے دوڑ لگانے کا دور ہے، مگر وہ اس مایوسی کو دور بھی کرنے کی کوشش کرتے، کبھی چاندنی راتوں میں ہم دونوں دارالمصنفین کے صحن میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے، تو وہ بشارت دیتے کہ ہم لوگوں کو پر امید رہنا چاہئے، اس علمی مرکز پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کی چاندنی انشاء اللہ برابر چھٹکی رہیگی

••••

وہ حوصلہ افزائی کرنا خوب جانتے تھے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی وفات سے میرا سینہ اندوہ وغم کا آتشدان بنا ہوا تھا، مگر انھوں نے اپنی مدھری باتوں

سے اس کو امیدوں کا گلزار بنا دیا تھا، کیا معلوم تھا کہ اس قدر جلد پھر یہ سوز غم کا تنور بن جائے گا، یہ اب ایک گنج شہیداں بن چکا ہے، اس میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور اب مولانا عبد السلام قدوائی مدفون ہیں، میری حیثیت اب ایک مجاور کی سی ہے جو اپنے سینے کے قبرستان میں اُن کی یادوں کا لوبان جلانے کے لئے رہ گیا ہے،

.....

چالیس سال پہلے دارالمصنفین آیا تو اس کو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی وجہ سے علم کا عشرت کدہ سمجھنے میں لذت محسوس کی، پھر مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے زمانہ میں بھی اس کو اپنے لئے علم کا گلکدہ سمجھتا رہا، مولانا عبد السلام قدوائی کی رفاقت سے سے بھی یہ میرے لئے علم کا خم کدہ بنتا جا رہا تھا، مگر اب زندگی کی اس منزل میں ہوں کہ کہیں مجھکو خود یہ نہ کہنا پڑے :-

ع ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

.....

مولانا عبد السلام قدوائی مرحوم کی نیکیاں اور خوبیاں اُن کے سفر آخرت کے لئے زادِ راہ ہیں، دعا ہے کہ ان ہی کی بدولت مغفرت کی کوثر و تسنیم سے ضرور سیراب ہوں آمین ثم آمین، اُن کی سیرت کی رعنائیوں، اُن کے کردار کی دل آویزیوں، اور اُن کی گوناگوں خوبیوں کو سلام اور لاکھوں سلام بھیجتا ہوں تو اُس وقت دارالمصنفین کی ہر سمت سے یہ صدا سنائی دیتی ہے

ع گلے برفت نیاید بصد بہار دگر!

.....

مقالات

مطالعہ ملفوظات خواجگان چشت کے مبادیات

(خواجگان چشت کے ملفوظات کی روشنی میں)

از
مولانا اخلاق حسین دہلوی بستی نظام الدین دہلی

(۲)

اساطیر الاولین | قرآن پاک میں جو قصے انبیاء سابقین کے منقول ہیں، انھیں اس عہد کے یہود و نصاریٰ اساطیر الاولین سے تعبیر کیا کرتے تھے، قرآن پاک میں ہے،

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیٰتُنَا	جب اُن کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی
قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ	جاتی ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سُن
لَقُلْنَا مِثْلَ ھٰذَا اِنْ ھٰذَا	لیا، ہم چاہیں تو ہم بھی ایسے قصے بیان
اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (انفال ۴)	کر دیں، یہ تو پہلوں کی کہانیاں ہیں

جتنا واقعات کو قرآن پاک میں دہرا دیا گیا ہے وہ مصدقہ ہیں، اُن کے بیان کرنے میں تو کلام ہی نہیں، مگر اُن کے علاوہ جو بھی ہیں، وہ اساطیر الاولین ہی ہیں، جو یہود و نصاریٰ کا علمی سرمایہ ہیں، اگر ان میں شرک و کفر کی آمیزش نہیں ہے تو اُن کے بیان میں بھی کچھ مضائقہ نہیں ہے

اور اُن کے ذکر و اذکار کی ممانعت بھی نہیں ہے، ایسے ہی قصص و حکایات سے بہت سی ضرب الامثال اور کہاوتیں وجود میں آئی ہیں، مثلاً ہر فرعونے را موسیٰ، طوفانِ نوح، لحنِ داؤدی، صبرِ ایوبؑ گریۂ یعقوب، خرِ عیسیٰ .... ان سے تلمیح، اور استعارہ وکنایہ کا کام لیا جاتا ہے، اور مختصر بیان میں بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے، مسلمانوں نے علمی مسائل میں کبھی تعصب و تنگ نظری سے کام نہیں لیا، وہ علم و حکمت کو اپنا ہی گم گشتہ سرمایہ تصور کرتے تھے، اس باب میں اُن کی وسیع چشمی ہر کہیں جلوہ گر ہے، لہٰذا حسب ضرورت اساطیر الاوّلین سے بھی خاطر خواہ کام لیا جاسکتا ہے، اس میں کچھ مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہو،

اسرائیلیات | انبیاء بنی اسرائیل علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کے بعض حالات و واقعات اور قصص قرآن پاک میں مذکور ہیں، ان کے علاوہ کچھ حالات و واقعات اور قصص علماء بنی اسرائیل کے علم میں تھے، ان میں بعض تو ایسے عالم تھے، جو باتوں کو چھپاتے تھے، بلکہ مقدس کتاب توریت میں تحریف کر دیا کرتے تھے، اُن کی باتوں پر اگرچہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا، لیکن انکار کے لئے بھی قوی دلیل نہ تھی، اُن کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لَا تصدّقوھُم وَ لَا تکذبوھم، — نہ تو اُن کی تصدیق کرو، اور نہ تکذیب کرو،

بعض توریت مقدس کی پیشین گوئیوں پر غور کرتے اور حق کی تائید کرتے تھے، ورقہ بن نوفل، اور عبداللہ بن سلامؓ ایسے ہی حق پرستوں میں سے تھے، ایسے علماء بنی اسرائیل کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے،

حدّثوا عن بنی اسرائیل وَلَا حرج، — بنی اسرائیل سے بیانات نقل کرو، اس میں حرج نہیں ہے،

لہذا بعض واقعات وحالات اور قصص جو مفسرین نے علمائے بنی اسرائیل سے نقل کئے ہیں اور جنھیں اسرائیلیات کہتے ہیں، ان سے استفادہ میں کچھ مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اُن کے اندر کوئی ایسی بات نہ ہو، جو انبیا علیہم السلام کی شان اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو، انہی کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لَا حَرَجَ فرمایا ہے لیکن جو روایات بنی اسرائیل سے متعلق نہیں، انھیں اسرائیلیات سے تعبیر کرنا صحیح نہیں، خرقہ وگلیم، کلاہ وطاقیہ کو اسرائیلیات میں شمار کرنا یا خرافات بتانا درست نہیں ہے، وہ دراصل علامات ہیں اصولِ سلوک کی پابندی کی، جیسا کہ عہدِ حاضر میں بیج کی نوعیت ہے، جو درویش خلاف ورزی کرتا، تو اس سے یہ علامات ضبط کر لی جاتی تھیں،

یوسفؑ زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کی تصدیق قرآن پاک سے ہوتی ہے، قرآن پاک میں اس قصے کو احسن القصص کے لقب سے ذکر کیا گیا ہے، جتنا کچھ قرآن پاک میں ہے، وہ جامع ومستند ہے، مگر اس قصے کی بعض روایات سے اہلِ کتاب کے علماء واقف تھے، اگرچہ ان کا وہ مقام نہیں جو قرآن پاک کے بیان کا ہے، تاہم اس میں شرک وکفر کی آمیزش بھی نہیں ہے، اس لئے حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج کے حکم میں داخل ہیں، بعض علمائے اسلام خصوصاً مفسرین نے ان روایات کو جس طرح سُنا نقل کر دیا ہے، صوفیائے کرام نے بھی ان روایات سے استفادہ کیا ہے،

سید علی ہجویریؒ حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ (المتوفی ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء) لکھتے ہیں:-

چوں یوسفؑ بایعقوبؑ رسید خداوند	جب حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ
دیدار وصال یوسف کرامت کرد،	کے پاس پہنچے، اور اللہ پاک نے انھیں
زلیخا را جوان کرد، با سلام راہ نمود	یوسفؑ سے ملایا، زلیخا کو جوان کیا اور

و زنی یوسفؑ داد، و یوسف قصدے	اسلام قبول کرنے کی توفیق دی، اور
وے کرد، زلیخا از وے گریخت۔	حضرت یوسفؑ کی زوجہ بنایا، یوسف
...... (کشف المحجوب ص ۲۶۲)	نے ان کا ارادہ کیا تو زلیخا نے آپ سے
	گریز کی ....."

مولانا جامیؒ نے مثنوی یوسف زلیخا کو اسی آب و رنگ سے رشکِ بہار بنایا ہے، فرماتے ہیں

(۱)

چوں فرماں یافت یوسفؑ از خداوند	کہ بندد با زلیخا عقد پیوند
بقانونِ خلیلؑ و دینِ یعقوبؑ	بہ آئینِ جمیل و صورتِ خوب
زلیخا را بعقدِ خود در آورد	بعقدِ خویش یکتا گوہرآورد
چو صد قش بود بیروں از نہایت	بآخر کرد در یوسفؑ سرایت

(۲)

شبے از جنگ یوسفؑ شد گریزاں	خلاصی جست از افتاں و خیزاں
چو زد دست از قفا در دامن او	ز دستش چاک شد پیراہن او
زلیخا گفت اگر من بر تنِ تو	دریدم بیش ازیں پیراہنِ تو
تو ہم پیراہنم اکنوں دریدی	بپاداشِ گناہِ من رسیدی

حضرت یوسفؑ اور حضرت زلیخا کے نکاح کا ذکرِ خیر ہمارے ادب و تصوف اور اسلامی روایات کی زینت ہے حضرت باباصاحبؒ کی زبانِ مبارک پر بھی آیا ہے آپ نے غلباتِ شوق میں ارشاد فرمایا،

"چوں حضرت یوسف علیہ السلام پیغامبر صلوٰۃ اللہ علیہ زلیخا را بخواست، و زلیخا

"در دینِ حضرتِ یعقوبؑ پیغام بر درآمد، بعد از آں زلیخا بخدائے تعالیٰ مشغول شد، چنانچہ می آرند آں روز کہ حضرت یوسف پیغامبر علیہ السلام دنبالۂ زلیخا کردے، وا و از پیشِ بگریختے و دست در زدے، آں گاہ حضرت یوسفؑ از زلیخا پرسید، گفت، روزے آں بود کہ دنبالِ ما می کردی، و من از پیشِ تو می گریختم، و یک روز اینست کہ دنبالِ تو می کنم و تو از من می گریزی، دریں امر حکمت چیست؟ بگو۔ زلیخا گفت اے یوسفؑ آں روز با خدائے تعالیٰ آشنائی نداشتم، و از پرستشِ او دور بودم، جز تو آشنائے دیگر نمی دانستم ضرورتاً بتو آویزش داشتم، اما ازیں زماں کہ حقِ تعالیٰ را بشناختم و در پرستشِ او مشغول شدم و از مجاہدہ بمشاہدۂ او تافتم و دوستی او در دلِ من جائے گرفت پس اے یوسفؑ تو صد ہزار بہتر از تو در نظرِ من نباشد چوں مرا با حق تعالیٰ الفت شد، اگر بعد ازیں با غیرِ او الفت گیرم مُدعی دروغ زن بودم، نہ صادق در محبت، (اسرار الاولیاء ص ۷)

اس مختصر سے بیان میں کئی جملے ایسے ہیں، جو بے ساختہ زبان سے نکل گئے ہیں جو بیان کی جان اور روحِ رواں ہیں، اور ایسے ہی بزرگ کی زبان سے نکل سکتے ہیں، جو توحید و حق شناسی کی نعمت سے مالا مال ہو، اور وہ یہ ہیں :-

"ازیں زماں کہ حقِ تعالیٰ را بشناختم۔ در پرستشِ او مشغول شدم۔ از مجاہدہ بمشاہدۂ او تافتم۔ چوں مرا با حق تعالیٰ الفت شد۔ اگر بعد ازیں با غیرِ او الفت گیرم، مدعی دروغ زن بودم۔

ہر کس و ناکس کی زبان سے یہ جملے نہیں نکل سکتے، ان میں ایسا کیف ہے کہ یہ صاحبِ ذوقِ سلیم کو آج بھی متوالا بنا دیتے ہیں، اُن کی کیفیت اُن کی صداقت کی روشن دلیل ہے، اور

لائقِ تسلیم ہے، مگر اس روایت کے متعلق اور اس جیسی دوسری روایات کے متعلق عہدِ حاضر کے ایک تنقید نگار کا بیان یہ ہے:۔

"بد احتیاطی اور کم علمی کی وجہ سے جا بجا ایسی باتیں بکثرت آگئی ہیں، جو اصولِ تصوف کے خلاف ہیں، بلکہ اکثر تعلیمات اسلامی کے منافی ہیں، اور جن کا انتساب کسی بھی درویش سے درست نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ انھیں حضرت بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ کی ذاتِ گرامی سے منسوب کیا جائے"

(منادی دہلی بابا فرید نمبر ص ۱۶۶ جلد ۴۹ شمارہ ۳-۴-۵-۶)

بعد ازاں اسرار الاولیاء سے حضرت بابا صاحبؒ کا مذکورۂ بالا بیان نقل کر کے یہ لکھا ہے:

"حضرت یوسفؑ کے زلیخا سے نکاح کرنے کی روایت نہ یہودی ماخذ میں ہے نہ علمائے اسلام اس کے قائل ہیں، جامع ملفوظات نے خدا جانے یہ خرافات کہاں سے نقل کی ہیں" (منادی دہلی، بابا فرید نمبر ص ۱۶۸، جلد ۴۹، شمارہ ۳، ۴، ۵، ۶)

یہودیوں کے علمی ذخائر میں اگر اب حضرت یوسفؑ کے حضرت زلیخا سے نکاح کرنے کی روایت نہیں ہے، تو قطع نظر اس سے کہ یہ کہنا کہ جو کہا گیا ہے بلا دلیل ہے، کیونکہ یہ تو ان کی دیرینہ عادت ہے، قرآن و حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، اسی عادت کی بدولت وہ توریت مقدس کو بھی محفوظ نہ رکھ سکے ہیں، لیکن جب قدیم و مستند علمائے حق نے دونوں کے نکاح کے متعلق معتبر و مسلمان یہودی علماء سے اس روایت کو نقل کیا ہے، تو یہ کہہ کر اسے مسترد کیسے کیا جا سکتا ہے، کہ روایت یہودی ماخذ میں نہیں ہے، اور اسے خرافات سے تعبیر کیسے کیا جا سکتا ہے؟

مولانا جامی وہ بزرگ عالم ہیں جن کی شرح جامی آج تک دینی مدارس کے

نصابِ تعلیم میں داخل ہے، حضرت داتا گنج بخشؒ اور مولانا جامی کی روایات کو خرافات سے
سے تعبیر کرنا اور یہ لکھنا

"بد احتیاطی اور کم عقلی .... اصولِ تصوف کے خلاف ......

اکثر تعلیماتِ اسلامی کے منافی ہیں"

بذاتِ خود کھلی خرافات ہو بقول جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب اسے فساد فی العلم، فساد فی التاریخ، فساد فی الروایات، فساد فی الرسوخ، فساد فی العقیدہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور چونکہ اس زہر افشانی سے عوام اور کم علم گمراہ ہوتے ہیں، اور عقیدتمندوں میں اشتعال پیدا ہوتی ہے، جو فتنہ و فساد کا سبب بھی ہو سکتی ہے، اس لئے فساد فی الارض سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے،

علمِ مجلسی سے آگاہی | ہر شائستہ قوم کے مہذب افراد علمِ مجلسی سے آگاہی رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جو واقعہ جن الفاظ میں کسی ایک مجلس میں بیان کیا جاتا ہے بعینہٖ ان الفاظ میں کسی دوسری مجلس میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اقتضائے حال کے مطابق واقعہ کی تفصیل میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے، اور ہوتی ہے، مقرر و متکلم کو یہ حق ہے کہ وہ واقعہ کے جس پہلو کو چاہے بیان کرے، اور جس کو نہ چاہے، بیان نہ کرے، پورا واقعہ بھی بیان کر سکتا ہے، اس کے متعلقات پر بھی روشنی ڈال سکتا ہے، اور اختصار سے بھی کام لے سکتا ہے،

تحریر میں کسی واقعہ کو عموماً جامعیت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، اور اختصار سے بھی بہرحال ایجاز و اطناب سے کام لینے کا اسے پورا پورا حق ہوتا ہے، مگر بیان کرنے اور لکھنے کی صورت میں الفاظ میں رد و بدل ہوتا اور ہو سکتا ہے، یہ بھی ہوتا ہے کہ جو واقعہ کسی نے قلم بند کر لیا ہے، اور مدتوں بعد اسے بیان کیا ہے، تو بیان میں تحریر سے زیادہ

توانائی آسکتی ہے، جس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، یہاں تین ایسے واقعات نقل کئے جاتے ہیں، جن کو بیان کرنے والے بھی ایک ہی بزرگ ہیں، اور لکھنے والے بھی ایک ہی اہل قلم ہیں، دونوں بیانوں کے درمیان فصل بھی کچھ زیادہ نہیں ہے،

(۱)

یک روز بعد از آن زحمت مرا | در آنچه شیخ الاسلام فریدالدین
وچند یاران را گفت که بروید در | قدس الله سره العزیز زحمت داشت
فلان حظیره بشب بیدار باشید | مرا با چند یار بزیارت شہیدان
وبرائے صحت من دعا کنید ہم چنان | که آنجا اند فرستاده بود چون
کردیم، من و چند یار دیگر در آن | ما بعد از زیارت بخدمت پیوستم
حظیره رفتیم، آن حظیره بام می داشت | فرمود که دعائے شما ہیچ اثر نه
بر آن بام رفتیم، و طعام برابر خود | کرد، مرا ہیچ جوابے فراہم نیامد
بردیم شب آنجا بودیم و دعا کردیم چون | یارے بود، که او را علی بہاری
روز شد، بخدمت شیخ آمدیم | گفتندے، او دورتر
و بایستادیم، و عرض داشت کردیم | استاده بود، گفت که ما ناقصانیم
که شب را بحکم فرمان بیدار بودیم | و ذات مبارک شیخ کامل، دعائے
و دعا کردیم، شیخ ساعتے تامل | ناقصان در حق کاملان چه گونه
فرمود ما بعد از آن گفت از دعائے | اثر کند، خواجه ذکره الله بالخیر فرمود
شما ہیچ اثر صحت پیدا نه شد خواجه | که این سخن بسمع شیخ نه رسید من عین
ذکره الله بالخیر فرمودند که من در | آن سخن مبارک رسانیدم، مرا

جواب متامل شدم بارے
بود کہ ادرا علی بہاری گفتندے
او از من پیشتر ایستادہ بود، او
ازاں جا گفت کہ ما قضائیم
و ذات مبارک شیخ کامل،
دعائے ناقصاں در حق کاملاں
کجا مستجاب شود، ہمانا کہ ایں
سخن بسمع شیخ نہ رسید، من ایں
سخن بسمع شیخ رسانیدم، بعد
ازاں روے سوے من کرد و
گفت من از خدا خواستہ ام
کہ ہرچہ تو از خدا خواہی بیابی
بعد ازاں عصاے خود بمن داد
..... (فوائد الفواد ص ۲۵ مجلس
بست ہفتم از ۲۷) ماہ ربیع الاول

فرمود، من از خدا خواستہ ام کہ
ہرچہ تو از خداے تعالیٰ بخواہی
بیابی، بعد ازاں آں روز عصا بمن
داد و مرا گفت کہ تو و بدرالدین اسحاق
علیہ الرحمۃ بر دید و ہمہ آں حظیرہ
مشغول شوید، من و او ہر دو رفتیم
و شب مشغول بودیم، چوں بخدمت
پیوستم فرمود کہ نیکو بود،
(فوائد الفواد ص ۹۵ مجلس ۵ پنجم
(رجب) ۷۰۸ھ)

دونوں بیانات سے کے درمیان صرف تین ماہ سات یوم کا فصل ہے، درمیان میں چھ مجالس ہیں جن کے بیانات تقریباً دس صفحات پر مشتمل ہیں، مگر بیان میں جو فرق ہے، وہ مقابلہ سے واضح ہے، پہلے بیان میں حیطرہ . بارم حیطرہ ہے، کھانا ساتھ لے جانے کا ذکر ہے، دوسرے میں صرف زیارت شہدا ہے، پھر پہلے بیان میں بعد ازاں عصاے خود بمن داد سے ایسا لگتا ہے،

کہ عصائے خود اسی وقت عطا فرمایا تھا، دوسرے بیان سے کہ آں روز عصا بمن داد، یہ معلوم ہوتا ہے کہ دن میں کسی وقت عطا فرمایا تھا، عصائے خود میں جو تخصیص ہے وہ بھی اس میں نہیں ہے، اگر اسی اختلاف سے یہ بیان افضل الفوائد میں ہوتا، تو اس پر سرقہ کا بھی الزام عائد ہوتا، اور اسلوب بیان کی خامی کا بھی،

(۲)

حکایت خواجہ شاہی موے تاب

کہ برادر مہتر او شیخ محمود موئے
تاب بود، فرمود، چوں خلق بدو
روے آوردو ہر جا کہ می رفت آنجا
جمعیتے می شد۔ و ایں خواجہ شاہی
موئے تاب مردے سیہ فام بود
ہمدراں عہد درویشے بود در
بدایوں اورا مسعود نجاشی گفتندے
چوں خواجہ شاہی را بہ آں غوغا
می دید، می گفت اے سیہ اگر ما
بہ گرم کردہ بسوختہ خواہی شد
خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ ہم
چناں شد کہ او گفتہ بود ہم دراں
(فوائد الفواد ص ۲، مجلس ۳،
دہم ماہ ذی قعدہ ۷۰۷ھ)

حکایت خواجہ شاہی درافتاد

کہ اورا در بدایوں رونقے پیدا شد
و ہمہ خلق رو بدو آوردند۔ و ہر جا کہ
می رفت آنجا جمعیتے می شد و آں
خواجہ شاہی مردے سیاہ فام
بود، ہمدراں عہد درویشے بود،
اورا محمود نجاشی گفتندے۔ وقتے
خواجہ شاہی را گفت اے سیہ!
گر ما بہ نیک گرم کردہ، سوختہ
خواہی شد۔ ہم چناں شد کہ او
گفت خواجہ ہم دراں جوانی برفت
(فوائد الفواد ص ۶، مجلس ۳
یازدہم ماہ ذی الحجہ ۷۰۷ھ)

دونوں بیانات کے درمیان صرف ایک ماہ کا فصل ہے، درمیان میں کوئی مجلس بھی نہیں ہے، اور درمیان میں صرف ایک صفحے کا بیان ہے، موئے تاب صرف پہلے بیان میں ہے، دوسرے میں نہیں ہے، درویشے اور درویش میں امتیاز واضح ہے پہلے بیان میں مسعود نجاشی ہے، اور دوسرے میں محمود نجاشی ہے، گرم کردہ اور نیک گرم کردہ میں بھی امتیاز ہے پہلے بیان میں، بہ آں غوغا می دید، می گفت ہے، اور دوسرے میں صرف گفت ہے، تواتر مفقود ہے، تنقید نگار بتائیں کہ وہ ان اختلافات کی کیا تاویل فرماتے ہیں کس کو جعلی اور کس کو اصلی بتاتے ہیں،

(۳)

حکایت فرمود کنیزکے داشت
نو بردہ و زال دمواسی است،
نزدیک بدایوں کہ آنرا کانبھر
گویند، مگر از اں مواسی بودہ
است، روزے ایں کنیزک
می گریست، مولانا علاء الدین
پرسید کہ چرا می گری، گفت پسرے
دارم، از او جدا شدم، مولانا
گفت اگر ترا بر سر حوض برم
کہ یک کروہے از شہر است و
و بر سر آں حوض راہ کانبھر

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود
آرے ہم چنیں بود کہ او کنیزک
زالے داشت نو بردہ در بداوں
سحر گاہے مولانا بیدار شد آں کنیز
آرد آس می کرد و می گریست
مولانا پرسید چرا می گرئی کنیزک
گفت پسرے در مواس کانبھر
گزاشتہ ام، از جدائی او
می گریم، مولانا گفت اگر من ترا
نزدیک نماز گاہ برم از آں جا
راہ خانہ خود بدانی، و گفت آرے

است، ازاں جا تو راہ خانہ خود بدانی
گفت بدانم، مولانا وقت سحرے
او را از خانہ بروں آورد، و بر سر آں
حوض برد، و بگذاشت، خواجہ
ذکرہ اللہ بالخیر، چوں بریں حرف
رسید چشم پر آب کرد، فرمود کہ
علمائے ظاہر ایں معنی را منکر
باشند، اما تواں دانست کہ او چہ کرد
(فوائد الفواد ص ۱۹۵ مجلس ۳۴
پانزدہم ماہ رمضان سنہ ۷۱۱ھ)

ازاں جا راہ خانہ خود بدانم
مولانا علاء الدین نانے چند بدو داد
و اورا بر سر راہ کانجر بردہ
گذاشت،
(فوائد الفواد ص ۲۰۲ مجلس ۵۳
یازدہم ماہ رمضان ۷۱۸ھ)

ان دونوں روایتوں کے درمیان فصل زیادہ ہے، درمیان میں بارہ فصلیں ہیں، جو ۳۵ صفحات پر مشتمل ہیں، بیان میں بھی ممیز فرق ہے، اگر یہی فرق کسی دوسرے مجموعۂ ملفوظات میں ہوتا، تو تنقید نگاروں کو سخت اعتراض ہوتا، پہلی روایت میں رونے کا تو ذکر ہے، مگر چلتے پھرتے ہوئے رونے کا ذکر نہیں ہے، پہلی روایت میں حوض کا ذکر ہے، جس کا فاصلہ شہر سے ایک کوس بتایا ہے، دوسری روایت میں نمازگاہ (عیدگاہ) کا ذکر ہے، مگر فاصلے کا ذکر نہیں ہے، دوسری روایت میں نانے چند بدو داد ہے، پہلی میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، پہلی روایت میں نتیجتاً جو کچھ فرمایا ہے، دوسری میں وہ نہیں ہے، ان اختلافات سے روایات میں بہم سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے، اگر ایسے ہی اختلافات کسی کتاب کے جعلی ہونے کے دلائل ہیں، تو تنقید نگار بتائیں کہ فوائد الفواد سب سے زیادہ جعلی کتاب کیوں نہیں ہے، جس میں ایک ہی واقعہ کو مختلف اسلوب میں بیان کیا گیا ہے، تنقید نگا

کا بیان ہے:۔

"حضرت امیر حسن دہلوی کے مرتب کردہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات فوائد الفواد (Fawa'dul Fowad) امیر خورد کرمانی کی تالیف سیر الاولیا، اور حمید قلندر کے جمع کئے ہوئے حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے ملفوظات خیر المجالس نہایت درجہ مستند ہیں"

(منادی دہلی ۱۹۷۶ء بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴، ۵، ۶ ص)

اگر اس قدر اختلاف کے باوجود فوائد الفواد نہایت درجہ مستند ہے، تو ایسے ہی اختلافات کی بنا پر دیگر ملفوظات جعلی کیسے ہوسکتے ہیں۔ وہ بھی نہایت درجہ مستند ہونے چاہئیں، حالانکہ اُن کے متن میں اختلاف نہیں ہے، اِس کے متن میں اختلاف ہے...... ....کسی دوسری کتاب کے بیان سے اختلاف ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے، اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ ـــ

"یہ کس طرح ممکن ہے کہ خود حضرت نظام الدینؒ اپنی مجلس میں ایک واقعہ بیان کریں اور اسی واقعہ کو اپنے قلم سے کتاب میں لکھیں، اور دونوں میں اتنا اختلاف ہو"

(منادی دہلی، بابا فرید نمبر ص ۱۴۹ جلد ۴۹، شمارہ ۴-۵-۶ بابت ۱۹۷۶ء)

یہ اختلاف اسی طرح ممکن ہے، جس طرح فوائد الفواد میں ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ امکان رکھتا ہے، جس طرح مختلف مجالس میں ایک ہی واقعہ کے بیان میں اختلاف ہے۔ اہلِ علم اس نکتے سے واقف ہیں کہ ایسے اختلافات ہوتے ہی ہیں، اگر نہ ہوں تو حیرت کی بات ہے، جو فنِ انشا پردازی اور فنِ تقریر سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ تحریر و تقریر

میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے، کوئی مقرر لفظاً بہ لفظاً وہ بیان ہی نہیں کر سکتا، جو تحریر میں ہوتا ہے، اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ ملفوظات میں جو اختلاف ہے وہ ملفوظ نگار کی بد احتیاطی، کم عقلی، اصولِ تصوف اور اسلامی شریعت سے عدم واقفیت کا نتیجہ نہیں ہے، لطیفہ یہ ہے کہ تنقید نگار نے جن دو بیانوں کے درمیان فرق کرنا ممکن تصور کیا ہے، اُن کے درمیان چالیس سال سے زیادہ کا فصل ہے، لکھنے والے بھی مختلف ہیں اور بیان کرنے والے بھی مختلف ہیں، مگر فوائد الفواد میں یہ صورت نہیں ہے، نہ بیانات کی مدت میں اتنا فصل ہے نہ بیان کرنے والے مختلف ہیں، اور نہ لکھنے والے مختلف ہیں پھر کیا وجہ ہو سکتی ہو کہ ایک کتاب اسی دلیل سے جعلی قرار پائے، اور دوسری مستند مانی جائے،

اعزازی کلمات کلمات و الفاظ کے بعض جگ ایسے ہیں، جو اعزازی طور پر بزرگوں اور قابلِ احترام اشخاص کے ناموں کے ساتھ بولے اور لکھے جاتے ہیں، مثلاً رحمۃ اللہ علیہ علیہ الرحمۃ، رضی اللہ عنہ، اناار اللہ برہانہ، ذکرُاللہ بالخیر، قدس اللہ سرہ العزیز وغیرہ یہ عربی مرکبات ہیں، یہ ان بزرگوں کے ناموں کے ساتھ بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں، جو بقیدِ حیات ہیں، اور اُن کے لئے بھی جو وفات پا چکے ہیں، انھیں "اصطلاح اموات" جیسے غیر معروف مرکب سے نامزد کرنا، اور یہ سمجھنا اور لکھنا کہ یہ صرف اُن ہی اشخاص کے لئے مخصوص ہیں جو فوت ہو چکے ہیں، اور عالم فانی سے رحلت فرما چکے ہیں، صحیح نہیں ہو، اور اصطلاحات کی کسی کتاب سے یہ ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے، کہ ان کلمات و مرکبات پر اصطلاح اموات کا اطلاق ہوتا ہے،

اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ علماء فن کے کسی گروہ نے کسی لفظ کو اس کے اصلی و

لغوی معنی کے علاوہ کسی اور معنی کے لئے مخصوص کر لیا ہے، جیسے منطق و فلسفہ، صرف و نحو، حدیث وفقہ کی اصطلاحات ہیں، اسی طرح پیشہ وروں کی اصطلاحیں بھی ہیں، جو ان فنون کی کتابوں میں مدوّن ہیں، اصطلاحات پر مخصوص کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، جو لوگ ان جگوں کو اصطلاح اموات سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا ثبوت فراہم کرنا ان کی ذمہ داری ہے، جو بزرگ رحلت پا چکے ہیں، ان کے ناموں کے ساتھ ان جگوں کا استعمال عام ہے، اس کے برعکس ان اشخاص کے لئے بھی ان جگوں کا استعمال ملتا ہے، جو بقید حیات ہوتے ہیں، آج نہ سہی مگر کل تک یہی تھا،

(۱) سید علی ہجویری حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ (المتوفی ۴۶۵ھ) نے جا بجا اپنے لئے ان جگوں کو لکھا ہے،:-

"من کہ علی بن عثمان جلابی ام رضی اللہ عنہ (کشف المحجوب ص ۲-۲۶۲-۳۲۳)

(۲) اجودھن (پاکپٹن) کے قاضی ابوالفضل عبداللہ حضرت باباصاحبؒ کے بڑے مخالف تھے، وہ سماع کے خلاف فتویٰ حاصل کرنے کے لئے ملتان گئے، جہاں مشہور مشہور علما تھے، انھوں نے علمائے ملتان سے کہا کہ یہ کہاں جائز ہے کہ کوئی شخص مسجد میں سماع سنے، اور رقص کرے، انھوں نے دریافت کیا، ایسا کون شخص ہے تو انھوں نے کہا:

"شیخ فریدالدین قدس سرہٗ العزیز (است)" (فوائد الفواد ص ۹۶)

یہ واقعہ حضرت باباصاحب کی حیات کا ہے کہ آپ کے مبارک نام کے ساتھ قدس سرہٗ العزیز بولا گیا ہے،

(۳) حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ ایک بار حضرت باباصاحبؒ نے مجھے اور کئی دوستوں کو شہداء کے مزارات پر دعا کے لئے بھیجا تھا، جب ہم واپس آئے اور حاضر خدمت ہوئے تو

... ترجمہ بدید، وہمدرداں نظیرہ

مشغول شو ... فوائد الفواد ص ۵۹)

یہ بیان ہر اعتبار سے معتبر ہے، کہ یہ حضرت بابا صاحب کا بیان ہے، پھر اس کا اعادہ فرمایا ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ کے تنقید نگاروں کے لئے سب سے زیادہ اہم اسلئے ہے کہ فوائد الفواد میں ہے جو اُن کے کہنے کے مطابق نہایت درجہ مستند ہے، جس کے بعد مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی،

(باقی)

بزمِ صوفیہ

بکثرت اضافوں کے ساتھ بزم صوفیہ کا تیسرا ضخیم اڈیشن جس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصنیف اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابوالحسن ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء، شیخ بو علی قلندر پانی پتی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، سید اشرف جہانگیر سمنانی (کچھوچھہ) سید گیسو دراز (گجرات) وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات وتعلیمات وارشادات کی تفصیل، اُن کے ملفوظات کے مجموعوں اور تصنیفات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے، اس میں حضرت شیخ عبدالحق توشہ ردولویؒ کے حالات وتعلیمات کا اضافہ مولانا شاہ معین الدین ندوی ردولوی کے قلم سے ہے جن کا تعلق خود ماں کی طرف سے شیخ موصوف کے خانوادۂ رشد وہدایت سے تھا، یہ بزرگ مذکورۂ بالا بزرگانِ سلوک ومعرفت کی طرح صاحب کرامات وملفوظات ہیں اور اُن کا مزار آج تک ردولی میں مرجع خلائق ہے۔ مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، قیمت ۱۰.۵۰ "مجلد"

امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۳)

امیر خسرو صنائع و بدائع کے استعمال میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اپنی غزلوں، مثنویوں اور قصیدوں میں اس فن پر اپنی غیر معمولی قدرت کا اظہار کرتے رہے، یہ فن ان کے یہاں موم کی حیثیت رکھتا، اپنی خواہش کے مطابق جس طرح چاہتے اس کو موڑ کر کوئی نہ کوئی صنعت پیدا کر دیتے، اپنی نعتوں میں بھی یہ فن دکھا کر اپنے کمالات سے متاثر کیا ہے، حاجی علی احمد خاں صاحب نے شیریں خسرو کو ایڈٹ کرتے وقت اپنے مقدمہ میں ان کے ان کمالات کا احاطہ بڑی محنت سے کیا ہے۔ انھوں نے تنسیق الصفات، تقابل، ایہام، ذو قافیتین، تجنیس ناقص، تجنیس خطی، تجنیس زائد یہ اول، رد العجز علی الصدر، رد الابتدا علی الصدر، رد العجز علی العروض، مراعات النظیر، حسن تعلیل اور مذہب کلامی کا استعمال جس طرح کیا ہے، ان کی مثالیں ان کے اشعار کی نشاندہی کر کے ان کے ان کمالات سے امیر خسرو کے پرستاروں کو محظوظ کیا ہے، ان ہی میں سے ہم بھی یہاں پر دو تین مثالیں پیش کرتے ہیں۔

رد العجز علی الصدر ۔ شاعر جس لفظ کو آخر بیت میں ذکر کرے، اسی کو اول بیت میں لائے ۔

آپ نے فرمایا" دعائے شما ہیچ اثر نہ کرد" القصہ پھر مجھے اور مولانا بدر الدین اسحاق کو بھیجا، حضرت محبوب الٰہی کے مبارک لفظ ہیں ،۔

" مرا گفت کہ تو و بدر الدین اسحاق علیہ الرحمۃ بروید، و ہمدر واں حظیرہ مشغول شوید، (فوائد الفواد ص ۵۹)

یہ بیان ہر اعتبار سے معتبر ہے، کہ یہ حضرت بابا صاحب کا بیان ہے، پھر اس کا اعادہ فرمایا ہے حضرت محبوب الٰہی نے تنقید نگاروں کے لئے سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے کہ فوائد الفواد میں ہے جو اُن کے کہنے کے مطابق نہایت درجہ مستند ہے، جس کے بعد مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی، (باقی)

بزمِ صوفیہ

بکثرت اضافوں کے ساتھ بزم صوفیہ کا تیسرا ضخیم اڈیشن جس میں تیموری عہد سے پہلے صاحبِ تصنیف اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابو الحسن ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی قاضی حمید الدین ناگوری، خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء، شیخ بو علی قلندر پانی پتی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، سید اشرف جہانگیر سمنانی (کچھوچھہ) سید گیسو دراز (گجرات)، وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات وتعلیمات وارشادات کی تفصیل، اُن کے ملفوظات کے مجموعوں اور تصنیفات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے، اس میں حضرت شیخ عبدالحق توشہ رودولوی کے حالات وتعلیمات کا اضافہ مولانا شاہ معین الدین ندوی رودولوی کے قلم سے ہے جن کا تعلق خود ماں کی طرف سے شیخ موصوف کے خانوادۂ رشد وہدایت سے تھا، یہ بزرگ مذکورۂ بالا بزرگانِ سلوک ومعرفت کی طرح صاحب کرامات وملفوظات ہیں اور اُن کا مزار آج تک رودولی میں مرجع خلائق ہے، (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن) قیمت ۱۰-۵

" منیجر"

امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری

از
سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۳)

امیر خسرو صنائع و بدائع کے استعمال میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اپنی غزلوں، مثنویوں اور قصیدوں میں اس فن پر اپنی غیر معمولی قدرت کا اظہار کرتے رہے، یہ فن ان کے یہاں موم کی حیثیت رکھتا، اپنی خواہش کے مطابق جس طرح چاہتے اس کو موڑ کر کوئی نہ کوئی صنعت پیدا کر دیتے، اپنی نعتوں میں بھی یہ فن دکھا کر اپنے کمالات سے متاثر کیا ہے، حاجی علی احمد خاں صاحب نے شیریں خسرو کو ایڈٹ کرتے وقت اپنے مقدمہ میں ان کے ان کمالات کا احاطہ بڑی محنت سے کیا ہے۔ انھوں نے تنسیق الصفات، تقابل، ایہام، ذوقافیتین، تجنیس ناقص، تجنیس خطی، تجنیس زائد یہ اول، رد العجز علی الصدر، رد الابتدا علی الصدر، رد العجز علی العروض، مراعات النظیر، حسن تعلیل اور مذہب کلامی کا استعمال جس طرح کیا ہے، ان کی مثالیں ان کے اشعار کی نشاندہی کر کے ان کے ان کمالات سے امیر خسرو کے پرستاروں کو محظوظ کیا ہے، ان ہی میں سے ہم بھی یہاں پر دو تین مثالیں پیش کرتے ہیں۔

رد العجز علی الصدر ۔ شاعر جس لفظ کو آخر بیت میں ذکر کرے، اسی کو اول بیت میں لائے ۔

رقم کو باز نہ شناسد قلم را | چہ داند باز نقاش رقم را

ردالابتداعلی الصدر۔ جو لفظ مصرع دوم کی ابتدا میں ہو وہی مصرع اول کے شروع میں لایا جائے،

ولایت داری از توقیع درگاہ | ولایت نامۂ اولی مع اللہ

ردالعجز علی العروض۔ جو لفظ مصرع دوم کے آخر میں ہو وہی مصرع اولی کے آخر میں لایا جائے:

ہمیں او را بگویم سایہ یار است | دگر ہر کس کہ بینی سایہ دار است

امیر خسرو کی ایک مشہور نعتیہ غزل یہ ہے جو برابر محفل سماع میں گائی جاتی ہے،

نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم | بہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم
پری پیکر نگاری، سرو قدی، لالہ رخساری | سراپا آفت دل بود شب جائیکہ من بودم
رقیباں گوش بر آواز او در ناز من ترساں | سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم
خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو | محمد شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

جس محفل میں یہ نعت گائی جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور محمدی سے ساری فضا منور ہوگئی ہے، ہر کس وناکس پر وجد وحال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، کچھ لوگ اسکو امیر خسرو کی نعت نہیں قرار دیتے کیونکہ یہ ان کے کسی دیوان میں نہیں، مگر جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ یہ کس خسرو کی نعتیہ غزل ہے، اُس وقت تک امیر خسرو کے نام سے جو یہ پُر کیف اور وجد آفریں نعت سینہ بہ سینہ اور سفینہ بہ سفینہ منسوب ہوتی آرہی ہے، اس سے ان کو محروم بھی نہیں کیا جا سکتا، اس میں جو سوز ہے، گداز ہے، کیفیت ہے، روحانیت ہے، سراپا عجز ونیاز ہے، مستی ہے اور سرشاری ہے وہ انکے سوا کسی اور خسرو

کی شاعری میں نہیں پائی گئی ہے،

حمد و نعت کے بعد امیر خسرو التزاماً اپنے شیخ کی منقبت لکھتے ہیں، مطلع الانوار میں اپنے پیر کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ اپنے رسول کی روش اختیار کیے رہے، ان کی سیرت میں سنت پیمبری ظاہر ہوتی رہی۔

راہ روے کو بطریق صفا رفتہ قدم بر قدم مصطفیٰ
سیرت میمونش ہدیں پروری نسخۂ دیباچۂ پیغمبری

وہ غیب کی بھی خبر رکھتے اور آسمانی جلوے بھی ان کے سامنے ہوتے،

چشم یقینش بہ تماشائے غیب در نظر او ہمہ صحرائے غیب
عصمتیانِ حرم آسماں جلوہ کناں در نظرش ہر زماں

پھر اپنے مرشد کے تصوف کی شرح اس طرح کی ہے کہ وہ اپنے فروعی اور اصولی عقیدوں میں قال اللہ اور قال الرسول کے تابع رہے، اور پھر بڑے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کی طریقت عین شریعت کے مطابق تھی اور اگر طریقت عین شریعت کے مطابق نہیں تو یہ شر ہے۔

سکہ کارش بفروع و اصول تابع قال اللہ و قال الرسول
عین شریعت بہ طریقش درست شرع اگر عین بناشد شر ست

وہ زیادہ تر اسی پر زور دیتے رہے کہ ان کے پیر نبی کے بازوئے راست اور میراثِ نبی کے کامل الصفات بنے رہے، یعنی شریعت کی خلاف ورزی ان کے یہاں کسی حال میں نہیں، شیرین خسرو میں جو شیخ کی منقبت لکھی تو اس میں کہتے ہیں

نظام الحق نبی را بازوئے راست کہ چرخ از رفعتش عطف مصلاست

تو دیوانِ ازل داعمل خطابش زمیراثِ ہما کامل نصابش

ان کے فیوض اور برکات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مقبولوں اور مدبروں کے لیے پناہ بنے ہوئے ہیں، جو دل رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے ہوں ان کے راز بنے ہوئے ہیں، ان کے مرید اپنے طمانچے سے شیطان کی گردن توڑ سکتے ہیں،

پناہ مقبلان و مدبران ہم سر صاحب دلان وبے دلان ہم

مریداسنے کہ پیشش دست بستہ بہ سیلی گردنِ شیطان شکستہ

ان کی خلوت کے جلوے کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ یہ خلد کی راہ دکھاتی ہے یہاں اللہ تعالیٰ کے جلوے دکھائی دیتے ہیں

بہ کنجِ خلوتش کز خلد راہے است عروسان رضا را جلوہ گاہے است

اپنی مثنوی مجنون لیلےٰ کی منقبت میں کہتے ہیں کہ وہ قطبِ زمن، پناہ ایمان، سر جملہ کبریاں، نظام دین محمد، حجرۂ فقر میں بادشاہ، عالم دل کے جہان پناہ، شاہنشہ بے سریر و بے تاج، پردۂ غیب کے محرم راز، راز سپہر کے کیسہ پرداز، پاک بینوں سے بیناتر اور شب نشینوں سے بیدار تر ہیں، یعنی ایک عارف باللہ میں جتنی خوبیاں ہو سکتی ہیں ان کو وہ اپنے پیر میں نظر آتی ہیں۔

قطب زمن و پناہ ایمان سر جملہ جملۂ کبریان

در شرع نظام دین احمد یعنی کہ نظام دین محمد

در حجرۂ فقر بادشاہے در عالم دل جہان پناہے

شاہنشہ بے سریر و بے تاج شاہانش بہ خاک پائے محتاج

در پردۂ غیب محرم راز وز راز سپہر کیسہ پرداز

بینا تر جملہ پاک بیناں بیدار ترینِ شب نشیناں

اور پھر آئینۂ سکندری کی منقبت میں ان ہی باتوں کو دوسرے انداز میں کہتے ہیں، دینِ حق کو ان کی وجہ سے پناہ ملی اور وہ پیشوا بنے رہے۔

پناہ جہاں دین حق را نظام وہ قدس را پیشوائے تمام

ان کی شب بیداری کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں

ہمہ شب ز شب خیزی بے ریا کمند افگنِ کنگرہ کبریا

ان کی سجدہ ریزی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں

زبس سجدہ کردن بمحراب دیں شدہ حاجب خاص روح الامیں

جب ان کی نمازوں کا ذکر کرتے ہیں تو یا تو اس میں شاعرانہ غلو یا مرشد سے ان کی غیر معمولی عقیدت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

نمازوے از معراج برتری نمودار معراج پیغمبری

ان کی ولایت کی وسعت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں

زمین و فلک در ولایت حدش ولی گوشۂ بوریا مسندش

ان کو بیماری دل کا غیر معمولی طبیب بھی بتاتے ہیں

بہ بیماری دل طبیب ست فرد کز و کردہ درماں بیازار درد

ان کی زبان اور دل کی توصیف میں کہتے ہیں

زبانش ز لوح سما راندہ حرف دلش عشق را گنجدانی شگرف

ان کی نظر کیمیا اثر کو اس طرح دکھاتے ہیں

ز نظارۂ وے آں آفتاب ہمہ پاک چشماں دو دیدہ پُر آب

ان کی بردباری کی تعریف یہ کہہ کر کی ہے کہ ان سے زیادہ کوئی اور بردبار نہ ہو سکا

بردبار خلق از چہ بسیار تر
کسے نیست از وی بسے یار تر

آخر میں یہ کہہ اٹھتے ہیں

چراغے بہ ظلمات آخر زماں

مثنوی نہ سپہر میں اپنے مرشد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اسرار قدسی جاننے میں فرد ہیں، شیطان سے پناہ چاہنے والوں کو انکے یہاں امان ملتی ہے، ان کا کشف معجزات سے تو کم لیکن کرامت سے بلند تر ہے، ان کے نور سے جو شمع روشن ہوتی ہے تو اس کے بعد عارفوں کے دل کا چراغ جل کر رہ جاتا ہے۔

در اسرار قدسی فرید زماں
ز شیطان پناہندہ را ذو الاماں

نمودار کشفش بہ صدق و ثبات
فزوں از کرامت کم از معجزات

ز شمع کہ نور وی افروختہ
چراغ دل عارفاں سوختہ

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ امیر خسرو کو اپنے مرشد سے کیسی محبت و عقیدت تھی، جو عین چشتیہ سلسلہ کی روایات کے مطابق تھی، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے مرشد حضرت عثمان ہرونیؒ کی خدمت غلاموں کی طرح کی، سفر میں مرشد کا بستر اور دوسری ضروری چیزیں اپنے سر پر رکھ کر چلتے، (تفصیل کے لیے دیکھو بزم صوفیہ ص ۵ طبع سوم) حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دہلی میں قیام کیا تو یہاں اپنے مرشد سے جدائی کی وجہ سے اپنے کو مہجور پایا اور ان سے ملنے کے لیے ان کے دل میں آتش شوق بھڑکتی رہی (ایضاً ص ۴۹) حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ پیر کو مرید اپنا حاکم سمجھے (فوائد الفواد لاہور اڈیشن ص ۲۴۹) امیر خسرو تو اپنے پیر کو حاکم اور سب کچھ سمجھنے کے ساتھ اپنا معشوق بھی سمجھتے اور بقول

مولانا شبلی ان کے عشق میں ان کا جمال دیکھ کر جیتے رہے اور ان سے اپنی محبت اور شیفتگی کے اظہار میں اپنی شاعری میں تغزل کا رنگ پیدا کر دیتے، حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا کی آنکھیں شب بیداری میں شغل باطن سے سرخ ہو جاتیں تو امیر خسرو نے ان خمار آلود آنکھوں کو دیکھکر ایک موقع پر ان کو مخاطب کر کے مست ہو کر فرمایا کہ رات تو جاگتا رہا، کس کے پہلو میں رات گذاری کہ تیری مست آنکھوں میں ابتک خمار باقی ہے۔

توشبانہ می نمائی بہ برکہ بودی امشب کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

پھر ایک پوری غزل بھی اپنے مرشد کی شان میں لکھی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ اے پیر تیرے پاؤں کی خاک نور سعادت ہے، تو بہ کی تیری قینچی کلمۂ شہادت کے مانند ہے تیری ہستی وہ نظام ہے کہ تیرے نون نے محراب کو عبادت کے لیے سیدھا کر رکھا ہے جس نے تیری روشنی دیکھی اور اس کو بیداری حاصل نہیں ہوئی تو وہ ایک ایسا کتا ہے جس کی عادت صبح تک سونے کی ہوتی ہے تو وہ صبح کی شمع ہے کہ تجھ سے عشق کا شعلہ اٹھتا ہے تو اس کا شرارہ ہدایت کا چراغ بن جاتا ہے، بڑے بڑے عالم جن کو انبیاء سے معرفت حاصل ہوتی ہے وہ تیرے آگے استفادہ کے لیے آجاتے ہیں، تیرا ہر مرید اپنے رکوع کی وجہ سے ہلال بنا ہوا ہے، ہر رات وہ ہلال کی طرح بڑھتا نظر آتا ہے، ایک مرید کہہ سکتا ہے کہ تیرا جو مرید ہے وہ ایک ایسا آدمی ہے کہ اس کی آنکھ سے کوئی فتنہ بھی پیدا ہوا تو وہ بھی سعادت کا باعث ہے، اور جب چھوٹے بوڑھے تجھ سے وصل کی امید رکھتے ہیں تو خسرو تجھ سے وصل کے بغیر حرف ارادت بنا ہوا ہے ؎

اے پیر خاک پائے تو نور سعادت است مقراض توبۂ تو چولائے شہادت است

ہستی تو آں نظام کہ نون خطاب تو محراب راست کردہ برائے عبادت است

دید آنکہ طلعت تو دیدار شیں نبود — ہست آں سگے کہ خفتن صبحش بہ عادت ست
تو شمع جمع شعلہ شوقے کہ از تو خواست — زاں بہر یکے شرار چراغ ہدایت است
ملامہ اے کہ معرفت انبیا لیش ہست — او را بہ پیش تو محل استفادت ست
ہر یک مرید تو چو ہلالے است از رکوع — ہر شب ہلال وار زاں در زیادت ست
تواں مرید گفت مرید ترا کہ اوست — آں مردمے کہ فتنہ عین سعادت ست
بید کز تو وصل گردد چوں فرد دبیر — خسرو کہ بے وصال چو حرف ارادت ست

خسرو اپنے مرشد کے ساتھ حسین راتیں کیف آفریں باتوں کے ساتھ گزارتے، بات با قدم بوسی اور دست بوسی کی لذت اٹھاتے، ان کو جام معرفت کا ساقی سمجھ کر ان سے راب معرفت پیتے تو اس کا خمار ان پر باقی رہتا، مست ہو جاتے تو اس مستی کا داغ انکے پر باقی رہ جاتا، ایسی عیش و نشاط بھری رات کو سوچ کر کے ان کا دل نگار بن جاتا، انکی ست بوسی اور قدم بوسی کی یاد ان کے لیے جانگسل رہتی اور وہ جو کچھ اپنے مرشد سے سنتے سکے بعد کسی اور کی نصیحت یا بات سننا پسند نہ کرتے، کیا ان کی ایک غزل کے یہ اشعار ہی کیفیات کی توغمازی نہیں کرتے؟

ں آں شبے کہ سرم زیر پائے یار بماند — دو دیدہ در رہ آں سرو گل عذار بماند
راب ہا کہ کشیدم بہ روئے ساقی خویش — برفت از سر و درد سر و خمار بماند
اش سیر نہ دیدم کہ زود گشتم مست؟ — مرا درون دل ایں داغ یادگار بماند
شت آں شب و آں عیش و آں نشاط لیک — بہ یادگار دریں سینہ فگار بماند
اد پاک یکے بوسہ یادگار دہم — کہ جاں ہمی رود و دست پا نگار بماند
یث اہل نصیحت نگنجدم در دل — کہ درو رد نہ سخن ہائے آں نگار بماند

امیر خسرو نے جابجا اپنے قصیدوں میں تصوف اور صوفی پر بھی اظہار خیال کیا ہے،
وہ تصوف کی راہ میں علم کو ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ علم ہی سے عمل بھی بلند ہوتا ہے، نہایۃ
الکمال کے قصیدہ "راہ رہائی" میں کہتے ہیں کہ

بہ علم کوش ولا اول آنگہے بہ عمل — کہ از برائے عمل علم شد بلند محل

علم کی فضیلت اس طرح بھی بیان کرتے ہیں کہ

بہ لفظ و فضل غلو کن از نبی و ولی — سخن شناسی کم باشدت بہ علم خلل

لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ علم کی تحصیل ایمان کی پختگی کے لیے ہو نہ کہ علم کامل ہونے کیلئے ہو

خلاصہ ایست کہ علم برائے ایماں خواں — نہ بہر آنکہ بخوانند کاملانت اکمل

کہتے ہیں کہ اگر صوفی بے علم و دانش ہے تو اس کی نماز کی کیفیت ویسی ہی ہے جیسے
کوئی ایک مشعل کو تیل اور فتیلہ کے بغیر جلانے کی کوشش کرے۔

نماز صوفیِ بے دانش آنچناں باشد — کہ بے فتیلہ و روغن فروزش مشعل

وہ پیر جو علم سے خالی ہو کر ظاہرداری اختیار کرتے ہیں ان کے ذریعہ سے معرفت
حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔ کتاب کی ظاہری لکیروں کو عقلمند حروف کا درجہ نہیں دیتے ہیں۔

مجوے معرفت از زنگ پوشِ بے معنی — کہ ہوشمند نجوید حروف در جدول

کہتے ہیں کہ وہ پیر جو پُر تکلف روزی کا خواہاں ہوتا ہے اس پر عقل ہنستی رہتی ہے

خرد دگر بہ یہ پیر پُر تکلف رزق — گہر بخندد بر زال و رملی و حلل

تصوف اگر گاؤں اور دولت کے لیے ہو تو یہ غارتگری ہے،

وگر تصوف تو بہر دِہ وادارلت — ز بہر غارت دیغاش بگسلند مُستقل

فقر کی راہ میں تسلیم و مسکنت ہونا چاہیے

بچش حلاوت تسلیم و مسکنت در فقر　　چنانکہ گر رسدت زہر و کشتی چو عسل

پھر اپنے قصیدوں میں عقل و عشق کی بحث بھی چھیڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عشق کی منزل سخت ضرور ہے لیکن اسی کے ذریعہ سے معرفت حاصل ہوتی ہے،

عشق سخت است و لے معرفت آموز دلست　　سرمۂ سنگ است و لے نور افزائے بصراست

اس کا درجہ بلند کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

بلکہ عشق آنست کہ پوشیدہ کند پائے بلند　　سوئے طاکے کہ بر آں سوی نعیم و سقراست

یہ عشق ان کے عشقِ الٰہی، عشقِ رسول اور عشقِ مرشد میں اس طرح ظاہر ہوتا رہا کہ وہ مجسم سوز عشق بن گئے، جس پر ان کے مرشد کو بھی ناز رہا، اس عشق کا درس انھوں نے اپنے مرشد سے بھی حاصل کیا، خواجگان چشت کے یہاں اس عشق کی بڑی رنگارنگی ہے،

عشق کے تخیل کی وضاحت حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے پہلے ان اشعار کے ذریعہ کی ہے،

سرِ لیست مرا در وں جاں در عشقت　　گر سر رود لے دوست نگویم با کس

سرِ لیست عاشقاں را در طاقتِ نہانی　　پوشیدہ دار خود را تا آنجا مجمل نمانی

پھر کہتے ہیں کہ اس عشق کا عنصر صرف آگ ہے، جس کے شعلہ سے تمام عالم جل کر خاک سیاہ ہو سکتا ہے، اس عشق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ عشق اپنی دوئی کو کھو دیتا ہے، وہ عاشق بن کر اپنے معشوق کی طلب میں مجاہدہ کرتا ہے جس سے اس کو مکاشفہ ہوتا ہے، مکاشفہ کے بعد مشاہدہ یعنی معشوق کا دیدار ہوتا ہے۔ اس مشاہدہ سے اس کا عشق اور بھی تیز ہو جاتا ہے، رفتہ رفتہ حجابات اٹھتے جاتے ہیں اور عاشق ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ صرف عالمِ تحیر میں رہتا ہے۔ اس راہ میں محبت کے سات سو مقامات ہیں، پہلا یہ ہے کہ معشوق کی طرف سے جو بلا بھی نازل ہو اس کو صبر و سکون سے عاشق برداشت کرے،

محبت کی کوئی غایت نہیں، عاشق اپنے تمام اعضا کے ساتھ محبت معشوق میں مستغرق رہتا ہے، اور اپنی آنکھوں سے صرف معشوق کو دیکھتا ہے، اپنے کانوں سے صرف معشوق کی باتیں سنتا ہے، اپنے ہاتھ پاؤں کو صرف معشوق کے لیے حرکت دیتا ہے، اپنی زبان سے صرف معشوق کا ذکر کرتا ہے، اور اس راہ میں وہی صادق ہے جو ہر لمحہ معشوق کے ذکر یعنی ذکر الٰہی میں مشغول رہتا ہے، ذکر یعنی عبادت الٰہی سے عشق کی تکمیل ہوتی ہے، عبادت الٰہی میں ظاہر اور باطن کا یکساں ہونا ضروری ہے، عبادت سے اسرار الٰہی معلوم ہوتے ہیں، مگر انکا ظاہر کرنا عشق کے منافی ہے (اسرار الاولیا ملفوظات حضرت فریدالدین گنج شکر ص ۴، ۶، ۸، ۴۹، ۵۱۔ بزم صوفیہ مرتبہ خاکسار ص ۱۸۰، ۱۷۹)

حضرت بوعلی قلندر پانی پتی کا تعلق بھی چشتیہ سلسلہ سے رہا، وہ بھی عشق کی بے پناہ قوت کے قائل تھے، ان سے ایک مثنوی عشقیہ منسوب ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:

عشق کو بے بال و پر طیراں کند
عشق کو در لامکاں جولاں کند

عشق کو تا چشم دل بینا کند
عشق کو تا سینہ پر سودا کند

عشق کو تا تاجِ سلطانی نہد
عشق کو ملکِ سلیمانی دہد

عشق کو تا عقل را زائل کند
عشق کو تا عقل را حاصل کند

عشق کو تا جام مدہوشی دہد
عشق باید تا فراموشی دہد

عشق دہ تا بے خبر سازد مرا
بادہ کو بے پا و سر سازد مرا

عشق باید تا دہد جامِ شراب
عشق سازد ساغرے آفتاب

وہ اپنے ایک مکتوب میں عشق، عاشق اور معشوق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عنایت شروع ہو جائے تو تم میں جذبہ پیدا ہونے لگے

اور تم کو تم سے دور کیا جائے تو گویا تم میں عشق کا آغاز اور تم پر حسن کا جلوہ ظاہر ہو گیا اور جب تم پر حسن کا مشاہدہ ہو جائے تو معشوق کو پہچانو اور عاشق بن کر معشوق ہو جاؤ اور جب عاشق بن کر معشوق ہو جاؤ گے تو اسی طرح کام کرو، معشوق کی سنت اور عاشق کے فریضہ کو قائم رکھو، اس وقت معشوق کو عاشق کے ذریعہ سے پہچان لوگے، اے برادر! معشوق کو تمہاری جیسی صورت میں پیدا کر کے تمہارے درمیان بھیجا گیا ہے تاکہ براہ راست تم کو دعوت دے .... عاشق نے اپنے عشق سے تمہارے وجود کا ملک بنایا تاکہ اپنے حسن و جمال کو تمہارے آئینہ میں دیکھے اور تم کو محرم اسرار جانے۔ الانسان سری (انسان میرا بھید ہے) تمہاری شان میں آیا ہے، عاشق ہو جاؤ کہ حسن کو ہمیشہ دیکھو اور دنیا و عقبیٰ کو پہچانو، عقبیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک ہے اور دنیا شیطان کی ملکیت ہے، دونوں میں معلوم کرو کہ تمہارے لیے کس کو پیدا کیا ہے (مزید تفصیل کے لیے دیکھو بزم صوفیہ، تیسرا ایڈیشن، ص ۲۹۰-۲۹۵)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ پر بھی عشق ہی کی حکمرانی رہی، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ رات کافی گذر جاتی تو وہ اپنے حجرہ کا دروازہ بند کر لیتے، پھر تنہائی میں کیا ہوتا یہ کسی کو خبر نہ ہوتی، صرف اتنا پتہ چلتا کہ وہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے، تمام رات ان پر غیر معمولی کیف و مستی اور بیخودی و وارفتگی طاری رہتی جس کا اظہار حسب ذیل اشعار سے ہوتا ہے جو کبھی کبھی دن کے وقت ان کی زبان مبارک سے سنے جاتے،

عشقے ز تو دارم اے شمع چہ گل دل داند من دانم و من دانم و دل
بارے بہ تماشائے من و شمع بیا کز من بکشے تا ز در وازہ دوے

قطعہ

تنہا منم و شب و چراغے مونس شدہ تا پگاہ روزم
گاہش ز آہ سرد بکشم گاہ از تف سینہ بر فروزم

ان کے اس قسم کے جذبات کی انتہا حسب ذیل اشعار سے معلوم ہوتی ہے، جو ان کی رباعی سے گئے۔

آں روز مباد کہ تو بیزار شوم یا با دیگرے دریں جہاں یار شوم

گر بر سر کوئے تو مرا دار کنند من رقصاں کناں بر سر آں دار شوم

وہ بھی اپنے مرشد کی طرح اس کے قائل تھے کہ درویش اہل عشق ہوتے ہیں اور علماء اہل عقل۔ فرماتے ہیں کہ جب تک اللہ جل شانہ کی محبت قلب کے غلاف میں ہوتی ہے، گناہ کا صادر ہونا ممکن ہے، لیکن محبت جب قلب کے گرد و نواح میں آجاتی ہے، تو پھر گناہ صادر نہیں ہوتا، (افضل الفوائد، قلمی نسخہ دار المصنفین) پہلے ذکر آیا ہے کہ حضرت خواجہ نے سوز عشق پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ سینہ کی آہ سے دریا بھی خشک بیابان ہو سکتا ہے، جس کو خسرو کے شاعرانہ انداز میں اس طرح بیان کیا گیا ہے

دریا ز آہ سینہ من خشک شد چنانکہ ہرگز بچشم خویش نہ بیند کسے لے

(باقی)

خیام

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ اور فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیات خیام پر مفصل مباحث اور آخر میں خیام کے چند عربی و فارسی رسالوں اور اسکے رباعیات کے ایک قلمی نسخہ مخطوطہ ۱۱ ۹ ھ موجود کتب خانہ الاصلاح دسنہ کی نقل شامل ہے۔ خیام کے مباحث پر سب سے مفصل مکمل اور محققانہ اور پُر از معلومات کتاب۔ اس میں خیام کو پہلی مرتبہ ایک فلسفی، حکیم، طبیب، منجم اور ہیئت داں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے،

مولفہ مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ ضخامت ۵۲۰ صفحے۔ طبع عکسی معارف پریس، اعظم گڈھ (یو۔پی)

قیمت: ۳۰ روپیے

حکیم سنائی غزنوی پر بین الاقوامی سمینار

(منعقدہ کابل (افغانستان)

از ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

گذشتہ قسط میں ذکر آیا تھا کہ سنائی کے دو مکتوب ایک ایسے خطی مجموعہ سے ملے جس کی کتابت ۵۴۳ھ میں ہوئی تھی، اور یہ مجموعہ دو عارفانہ تصانیف بستان العارفین اور منتخب رونق المجالس پر مشتمل ہے، اول الذکر خطی مجموعہ برلن کے سرکاری کتاب خانے میں تھا، ۱۹۴۵ء میں ٹوبنگن یونیورسٹی کے کتاب خانے میں منتقل ہوا، زیر شمارہ 99 MS Orient Fol اور فہرست میں ج ۵، پر اس کا ذکر موجود ہے، اس میں ۲۷۶ ورق یعنی ۵۵۲ صفحے ہیں، اور سنائی کے خطوط ورق ۲۷۲ سطر چہارم سے شروع ہو کر ۲۷۵ پر ختم ہو جاتے ہیں، ابھی بستان العارفین اور منتخب رونق المجالس کا جو ذکر آیا ہے ان کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ یہ دونوں کتابیں ڈاکٹر احمد رجائی کی تصحیح و تحشیہ کے بعد دانشگاہ تہران کی طرف سے (انتشارات تہران ۱۳۴۷) ایک ہی ساتھ چھپ گئی ہیں، مگر سنائی کے خطوط مطبوعہ نسخہ میں شامل نہیں، استاد ایرج افشار (دانش گاہ ایران) کے توسط سے سنائی کے خطوط کا عکس راقم حروف کو حاصل ہو گیا ہے، اگرچہ بنیادی طور پر مکاتیب سنائی میں ان خطوط سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہ دونوں خط مطبوعہ نسخے میں موجود ہیں، لیکن ان کی اہمیت کئی اور اعتبار سے ہے۔

(۱) یہ دونوں خط سنائی کے کلام کے سب سے قدیم مکتوبے ہیں، کلیاتِ سنائی کا نسخہ کابل تیاشا قرنِ ششم کے اواسط کا قرار دیا گیا ہے، سنائی کے خطوط کا یہ نسخہ بحالت موجودہ نسخہ کلیات سنائی سے اقدم سمجھنا چاہئے۔

(۲) سنائی کے یہ دونوں خط ابوالقاسم درگزینی وزیر سنجر کے نام ہیں اور دونوں میں سنائی نے وزیر کے پاس جانے سے اعراض کیا ہے، اس لئے ان کو ایک ہی ساتھ آنا چاہئے، مکاتیبِ سنائی میں ان دونوں کے درمیان فاصلہ ہو گیا ہے یہ صحیح نہیں۔

(۳) مجموعے کے اس نسخہ سے سنائی کی تاریخ وفات پر روشنی پڑتی ہے، اس میں خطوط کے شروع میں "سنائی رحمۃ اللہ علیہ" کا فقرہ ملتا ہے اور آخر میں سنہ کتابت ۵۴۳ چونکہ رحمۃ اللہ علیہ دعائیہ کلمہ ہے جو صرف متوفی اشخاص کے لیئے استعمال ہوتا ہے اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ سنائی کی وفات اواخر ربیع الاول ۵۴۳ سے پہلے ہو چکی تھی، استاد عبدالحئی حبیبی اور چند دوسرے محققین کے نزدیک سنائی کی وفات ۵۴۵ ہجری میں ہوئی، استاد حبیبی نے اسی سمینار میں سنائی کی وفات کی تحقیق پر ایک تفصیلی مقالہ پیش کیا ہے جس میں انھوں نے اس بات پر بڑے دلائل پیش کئے ہیں کہ حکیم کی وفات کی تاریخ ۵۴۵ ہجری ہے، لیکن یہ سارے دلائل بڑی حد تک قیاسی ہیں، اس کے مقابلہ میں خطی مجموعے میں مندرج تاریخ یعنی ربیع الاول ۵۴۳ ہجری زیادہ قابلِ قبول ہے اس لئے اس مجموعے کا کاتب سنائی سے متاثر تھا، ورنہ دو عارفانہ تالیف کے ایک مجموعے میں ان کا شمول بے معنی تھا، اور اس کاتب کے نزدیک سنائی ۵۴۳ھ میں فوت ہو چکے تھے، اتنی قدیم شہادت یقیناً کافی وقیع ہے، اور بحالت موجودہ اسی کو تسلیم

کرنا چاہیئے۔

سنائی کے قدیم نسخۂ کلیات اشعار میں حکیم کی وفات ۵۲۹ ہجری بتائی گئی اور بعض محققین کے نزدیک یہی تاریخ صحیح ہے، اسی قیاس کی ایک گونہ تائید نودریافت خطی مجموعے سے بھی ہوتی ہے،

(۴) مکاتیب سنائی میں متعدد مقامات پر متن مشکوک ہے، حالیہ مطالعے میں بعض اور متون ملے، ان کے باہمی مقابلے سے بعض شکوک رفع ہو گئے ہیں، نیز کچھ نئے مواد کی روشنی میں بعض توضیحی امور کی تصدیق دتوثیق ہو گئی ہے، اور چند عربی اشعار دفقرات کے ماخذ کا بھی پتہ چل گیا ہے، غرض ان امور کی روشنی میں مکاتیب سنائی کا تیسرا ایڈیشن تیار ہے انشاءاللہ طباعت کے معقول ذرایع کے حصول کے بعد اس کی اشاعت کا انتظام ہوجائے گا۔

اسی موقع پر چند اور کتابیں تقسیم ہوئیں، جن میں سے بعض ہمارے نقطۂ نظر سے کافی قابلِ توجہ ہیں، مثلاً محمود شیرانی کی مشہور کتاب "فردوسی پر چار مقالے" استاد عبدالحی حبیبی کے قلم سے فارسی میں ترجمہ ہو گئی ہے، یہ کتاب فردوسی پر کام کرنے والوں کے لیے بنیادی ماخذ کا کام دیتی ہے، اور باوجود اس کے کہ فردوسی پر سیکڑوں مقالے اور رسالے لکھے گیے لیکن جن موضوعات پر شیرانی نے قلم اٹھایا ہے، اس پر اب تک کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوا، اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر استاد سعید نفیسی اس کے ترجمے کا منصوبہ ۱۹۵۰ سے قبل بنا چکے تھے، مگر یہ کام پورا نہ ہوسکا، خوشی کی بات ہے کہ نفیسی کی یہ دیرینہ آرزو استاد حبیبی جیسے محقق ومورخ کے ذریعے پوری ہوئی، مترجم کا مقدمہ بھی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے،

اس کتاب کا ترجمہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے محقق کی تحقیقی صلاحیت کا اعتراف ہے۔

آثار اردو اقبال کے نام سے عبدالہادی داوی نے ۱۳۵۵ میں (جلد اول) شائع کی ہے، اس میں ایک طویل مقدمہ ہے، جس میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی پر تبصرہ ہے، اس میں ان کی تین کتابوں یعنی اقبال نامہ جلد اول و دوم، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کا تعارف ہے اگرچہ یہ تعارف فارسی دانوں کے لئے مفید ہے، لیکن ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ان کا اردو کلام فارسی میں منتقل ہوا، جس سے ان سے استفادہ عام ہو۔

آج سے تقریباً ۴۴ سال قبل افغانستان کے جید علما کی ایک ہیئت کے تحت نظر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے ترجمہ و تفسیر قرآن اور مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کے موضح القرآن کا ترجمہ فارسی میں عمل میں آیا، جو چھ جلدوں میں طبع ہوا، اور ہر ایک مجلد کی تین ہزار جلدیں چھپیں، کچھ دنوں میں مطبوعہ نسخہ نایاب ہوگیا۔ اور کتاب کی مانگ بڑھی تو ۱۳۴۵ شمسی میں دوبارہ چھ جلدوں میں یہ تفسیر چھپی، اور اس بار اس کی بائیس ہزار دو سو جلدیں تیار ہوئیں اس سے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اس تفسیر کی اشاعت اس بات کی دلیل ہے کہ ہندوستانی علما کی تحریرات کتنی بلند پایہ ہیں۔

ا۔ میں سیمنار میں پیش کئے گئے مضامین کی فہرست درج کرتا ہوں، اور جیسا عرض ہوچکا ہے کہ اکثر مقالے فارسی میں تھے اور بحث و گفتگو صرف فارسی میں ہوتی تھی۔

۱۔ غزلہائے عرفانی سنائی و اثرات آں در دیوانِ شمس تبریزی — دکتور قیام الدین راعی (افغانستان)

۲۔ ذکر چند نکتہ دستوری و لغوی در حدیقہ، — پروفیسر محمد آصف نکہت (افغانستان)

۳. حکیم سنائی و رمز لفظ عارفانه	پروفیسر رابرٹ معین الدین ٹامسن (امریکہ)
۴. بعضے اشعار ناشناختہ شدۂ سنائی	پروفیسر نذیر احمد (ہندوستان)
۵. تحقیق بر تاریخ وفات سنائی	استاد عبدالحئی حبیبی (افغانستان)
۶. تاریخ وفات سنائی	ڈاکٹر بو اوتاس (سویڈن)
۷. آرامگاہ پدر و مادر و فرزندانِ سنائی	دکتور امیر محمد اثیر (افغانستان)
۸. تجلی برخی اشعار سنائی در آثار مولانا روم	پروفیسر مائل ہروی (")
۹. عشق در غزلہاے سنائی	پروفیسر سید محمد رضوان حسین (ہندوستان)
۱۰. انعکاس عصر و محیط در شعر سنائی	پروفیسر عبداللہ خدمتگار (افغانستان)
۱۱. مزار خواجہ اسماعیل شنیزی (ممدوح سنائی)	آقاے احسان اللہ ارین زی (")
۱۲. علم نفس و علم نجوم در سیر العباد	پروفیسر کرسٹوف بورگل (انگلستان)
۱۳. خطاب بہ باد در آغاز سیر العباد	دکتور اسکارچیا (اٹلی)
۱۴. از سنائی تا مولانا روم تا اقبال	پروفیسر مس شیمل (جرمنی)
۱۵. نظری پیرامون تحریمۃ القلم سنائی	استاد غلام فاروق نیلاب رحیمی (افغانستان)
۱۶. بحثے دربارۂ تاثیر حکیم سنائی بر ادبیاتِ کلاسیک ترک،	دکتور عبدالقادر قرہ خاں (استنبول۔ ترکی)
۱۷. معنی عقل از نگاہ حکیم سنائی	استاد احمد صدیق حیا (افغانستان)
۱۸. مفاہیم تربیتی در آثار سنائی	دکتور محمد حسین راضی (افغانستان)
۱۹. جنبہاے توصیفی در اشعار سنائی	استاد عبدالقیوم (افغانستان)
۲۰. تاثیر دو بیت حدیقہ در مجلس سماع حضرت نظام الدین اولیاؒ	استاد محمد صالح پرونتا (")

۲۱. هستی شناسی از ابن سینا تا سنائی و حکمای امروز	استاد عبدالله سمندر غوریانی (افغانستان)
۲۲. سوابق خودی علامه اقبال در کلام سنائی	استاد محمد دین ژواک (")
۲۳. ارادت و علاقه من بحکیم سنائی۔	استاد محمد ابراهیم خلیل (")
۲۴. نکاتے چند درباره شاعر و حکیم سنائی	دکتور زکی عبدالحسین الصراف (عراق بغداد)
۲۵. ضرورت بازیافتن متن اصلی دیوان حکیم سنائی	استاد غلام غوث عالمی (افغانستان)
۲۶. ادب پشتو و حکیم سنائی	زلمی هیوادمل (؟)
۲۷. حکیم سنائی بنیادگذار طنز در شعر دری (فارسی)	استاد جلال نورانی (افغانستان)
۲۸. ارتباط سنائی با رجال معاصر وے	دکتور محمد افضل بنوال (افغانستان)
۲۹. پشتو و حکیم سنائی	دکتور حبیب الله رفیع (")
۳۰. عشق از نگاه حکیم سنائی و مولانا روم	استاد محمد حسین یمین (")
۳۱. سیر تصوف در افغانستان (معرفی کتاب)	دکتور عبدالحکیم طبیبی (")
۳۲. سنائی و اقبال	پروفیسر صوفی غلام مصطفی تبسم (پاکستان)
۳۳. شریعت از نگاه سنائی	مولانا گلاب بشار (")
۳۴. (Hakim Sanai and Historical Mili.n two dimensional - Study.	Dr. V.C. Sriwastawa Indian prof. at Kabul University

مقالات کے عنوانات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان میں کافی تنوع تھا۔

لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ سنائی کی زندگی کا کوئی ایسا خاص ماخذ سامنے نہیں آیا جس سے بعض اختلاف آرا مسئلے پر تشفی بخش روشنی پڑتی، نسخۂ کابل کی اشاعت اس حد تک سود مند ہوئی کہ اس کے مقدمے میں وفات کی تاریخ ۵۲۹ ہجری واضح درج ہے، دوسری خاص بات یہ معلوم ہوئی کہ حدیقۂ سنائی کا مقدمہ خود سنائی ہی کے قلم کا ہے، جو بعض جزوی تبدیلی سے کسی مجہول شخص محمد بن علی الرفاء نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے۔

سنائی کے کلام کا تعین بڑا متنازع فیہ مسئلہ بنا ہوا ہے، بعض مثنویاں ان کی طرف غلط منسوب ہیں، صرف چار مثنویاں یعنی حدیقہ، سیر العباد، کارنامۂ بلخ اور تحریمۃ القلم یقینی طور پر سنائی کی ہیں، بقیہ مشکوک اور غلط ہیں، لیکن اس موضوع پر کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی، تذکروں میں ستۂ سنائی کا ذکر تکرار سے آتا ہے، یہ بات خصوصیت سے بحث طلب ہے کہ ستہ میں کون کون مثنویاں شامل ہیں اور ان کے شمول کی بنیاد کیا ہے، سنائی کا دیوان بھی رطب و یابس سے پاک نہیں، یہ اہم موضوع شرکائے مجلس کے لئے مخصوص موضوع گفتگو نہ بن سکا۔

سنائی کے نثری کلام میں ان کے مکاتیب ہیں جو ۱۷ سال قبل شائع ہو چکے ہیں، اس سلسلے میں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

سنائی کے فکر و فن پر ایسا کوئی مقالہ پیش نہیں ہوا جس سے اندازہ ہوتا کہ ان کی شاعرانہ عظمت کے راز کیا ہیں، اس موضوع کی وسعت ضخیم کتاب کی متقاضی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس پر مطلق توجہ نہیں ہوئی۔

سنائی کی اخلاقی اور عارفانہ شاعری سے صرف فارسی شعراء ہی متاثر نہیں ہوئے

بلکہ اجتماع کا ہر طبقہ ان سے مستفید ہوا ہے، راقم کا خیال ہے کہ اخلاقی شاعری کے اعتبار سے فارسی کا کوئی شاعر ان کا ہم پلہ نہیں، ان کے فن کا کمال سمجھئے کہ انھوں نے قصیدہ جیسی صنف کو اس خاص کام کے لئے مخصوص کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود معاصرین میں ان کے اپنے قصائد کافی مقبول ہوئے، راقم نے حال ہی میں اسی موضوع پر ایک طویل بحث مجلہ علوم اسلامی علی گڑھ میں کی ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ کشف الاسرار میں جو سنائی کی زندگی میں مرتب ہو چکی تھی، قصیدے کے کئی سو اخلاقی اور عارفانہ اشعار سے استدلال ہوا ہے، مقصد یہ ہے کہ سنائی کی شاعری کا یہ رخ نہایت توجہ طلب ہے، مگر سیمینار میں اس پر قرار واقعی توجہ نہیں دی گئی۔

سیمینار کے دوران ۲۱ر اکتوبر بروز جمعہ ہم لوگوں کو غزنین کی سیاحت کرائی گئی، غزنین کابل سے مغرب میں کار سے دوڑھائی گھنٹہ کی مسافت پر ہے، یہ شہر جو کئی سو سال تک غزنویوں کا دارالخلافہ رہا، اور اپنی شان وشوکت کے لئے شہرۂ آفاق تھا، اب ایک قصبے کی صورت میں باقی ہے اور ایک ولایت کا صدر مقام ہے، یہاں کی شاندار عمارتوں کا نام ونشان تک باقی نہیں، اور باقی رہتا کیونکر، اس لئے کہ سب سے پہلے علاء الدین غوری نے بہرام شاہ غزنوی کے زمانہ میں ۵۴۷ھ میں اس کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا، اور اسی کی وجہ سے وہ تاریخ میں علاء الدین جہاں سوز کے نام سے مشہور ہے، پھر منگول کے حملے میں اس کی بچی کھچی عظمت کا نام ونشان جاتا رہا۔ بہرحال عمارتیں تو باقی نہیں، البتہ کہیں کہیں کچھ نشان باقی رہ گئے ہیں، مثلاً دو منارے ہیں، ان میں سے ایک سے علاء الدولہ مسعود بن ابراہیم (۴۹۲، ۵۰۸) اور دوسرا بہرام شاہ بن مسعود غزنوی (۵۰۹ - ۵۴۷) کا ہے، دونوں کی دیواروں کے

کتبات خط کوفی میں ہے، مسعود شاہ کے محل کی دیوار پر فارسی ابیات کوفی خط میں ہیں، جو کوفی خط میں فارسی کے قدیم ترین نمونے قرار دئے جا سکتے ہیں، یہ کتبے اطلی باستان شناسوں کی توجہ سے کشف ہوئے اور ۱۹۶۱ء میں چھپ چکے ہیں۔

غزنین میں قدیم عمارتیں تو نہیں ملتیں لیکن قدیم محرابیں اور قدیم قبریں کثرت سے موجود ہیں، اور ایسی قبروں کی بھی کمی نہیں جو کتبات کی حامل ہیں، البتہ بادشاہوں کی قبریں زیادہ باقی نہیں رہی ہیں، صرف ناصر الدین سبکتگین اور سلطان محمود کی قبریں باقی ہیں، ان دونوں قبروں پر کتبات کوفی خط میں پائے جاتے ہیں، سلطان محمود کی قبر پر کافی کتبے ہیں، یہ سب کے سب چھپ چکے ہیں، استاد عبدالحی حبیبی نے اپنے رسالہ تاریخ خط و نوشتہ ہائے کہن میں ان سے کافی استفادہ کیا ہے، سینکڑوں مشایخ اور دوسرے ممتاز شہریوں کی قبروں سے غزنین بھرا پڑا ہے، اس سلسلے کے بعض مطالعے بھی سامنے آچکے ہیں، راقم حروف کے پیش نظر ایک کتابچہ ریاض الالواح تالیف شیخ محمد رضا ہے جو ۱۹۶۷ء میں کابل میں چھپا تھا، دوسرا کتابچہ بنام مقامات تاریخی غزنہ سرور ہمایوں کا ہے، اور سنائی کے کینفارکے موقع پر شائع ہوا، ان مزارات میں جو ہمارے لحاظ سے قابل ذکر ہیں وہ یہ ہیں؛

۱۔ مزار حکیم سنائیؒ، شہر غزنین کے جنوب غرب میں ایک قبرستان میں ان کا روضہ ہے، جس میں متعدد قبریں ہیں، حکیم کی قبر پر کئی کتبات ہیں، لیکن قدیم کتبے تاریخ سے عاری ہیں۔

۲۔ حکیم سنائیؒ کے مزار کے پاس رمضان بن یوسف کی قبر ہے، جس کی لوحِ سنگ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۵۰۹ھ میں یعنی حکیم سنائیؒ سے قبل فوت ہوئے، یہ قبر سلطان روم کے نام سے مشہور ہے، یہ کتبہ بہت قدیم ہے۔

۳۔ مزار پسر حکیم سنائیؒ، یہ قبر حکیم کی قبر سے تقریباً ڈیڑھ سو گز مشرق میں اس راہ پر واقع ہے

جو حضرت شمس العارفین کے مزار کو جاتی ہے، اس پر جلی خط میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، کل نفس ذائقۃ الموت وسع ہے، اور لوحِ سنگ کے دوسری طرف "الشیخ الجلیل مظفر الحسان العزیز ابن السنائی" موجود ہے، اس کتبے کی تحریر سنائی کے کتبے کے مشابہ ہے، سنائی کے لڑکے کا نام مظفر الحسان العزیز معلوم ہوتا ہے، اس مزار کی تحقیق دکتور امیر محمد اثیر نے کی ہے، البتہ اس کتبے کا ذکر ریاض الالواح میں ہوا ہے۔

۴۔ لوح سنگ ابو محمد ابو بکر بلخی، یہ لوح مزار سنائی کے پہلو میں ہے، جس پر یہ تحریر ہے:

ہذا المنبر للشیخ العزیز الشہید الزاہد ابی محمد ابی بکر البلخی رحمۃ اللہ علیہ۔ خدائے عز و جل بر آں بندہ رحمت کناد کہ عم حکیم را بدعا یاد آرد۔

مولف ریاض الالواح نے لکھا ہے کہ خواجہ ابو بکر بلخی وہی ہیں جو خواجۂ بلغار کے نام سے مشہور ہیں، جن کا مزار دامن کوہ میں ہے، ریاض کے الفاظ یہ ہیں:

ازیں عبارت چناں مفہوم می گردد کہ ایں سنگ یکے از احجار منبر بودہ کہ عم حکیم سنائی از برائے خواجہ ابو بکر بلخی ساختہ، و مدفن خواجہ ابو بکر در نزدیک روضۂ سلطان بدامنِ کوہ واقع است، واکنوں بزیارت خواجہ بلغار شہرت دارد، (ص ۶۸)

دارا شکوہ نے غزنین میں خواجہ بلغار کے مزار کی زیارت کی تھی، اور اس کو بڑا پر فیض قرار دیا ہے، نیز سفینۃ الاولیاء سے واضح ہے کہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں کسی امیر جلال الدین محمود کی کوشش سے اس جگہ ایک بقعہ کی تعمیر ۹۶۴ھ میں ہوئی اور تاریخ تعمیر اس قطعے سے معلوم ہوتی ہے:

ایں منزلِ دلکشائے گردوں فسحت کز موز وصفا آمدہ رشکِ جنت

بر لوحِ زمانہ از پے تاریخش بنوشتہ فلک منزلِ کیواں رفعت

دارا شکوہ نے عمارت کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اتنا لکھا ہے کہ "مزار ایشاں لوح ندارد، لکن در پہلوئے قبر مبارک سنگے سفید منصوب است و در آں سنگ ایں عبارت منقوش است۔" یہ عبارت وہی ہے جس میں اس بقعۂ خیر کی تعمیر کا ذکر ہے کہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے ایک امیر جلال الدین محمود کے توسط سے ۹۶۴ھ میں یہ وجود میں آیا، مولف ریاض الالواح بھی قبر کا ذکر کرتے ہیں، اس وقت بقعہ موجود نہ تھا۔

۵۔ قبر فرخی شاعر، دکتور امیر محمد اثیر کی روایت یہ ہے کہ حکیم سنائیؒ کے حوالی میں پانچویں قبر فرخی شاعر کی ہے، لیکن اس پر کوئی لوحِ سنگ وغیرہ نہیں ہے، دکتور مذکور غزنین کے باشندے ہیں اور انھوں نے لوگوں کی زبانی یہی روایت سنی ہے۔

۶۔ محراب بقعۂ سلطان مسعود بن ابراہیم (م: ۵۰۹) کوفی میں یہ عبارت منقش ہے،
والنصر السلطان الاعظم ابا سعید مسعود خلد اللہ ملکہ مع آیۃ الکرسی۔

۷۔ محراب سلطان مودود بن سلطان مسعود (م) کوفی خط میں یہ تحریر ہے:
امر الامیر السید الملک المویدشہاب الدولہ وقطب الملۃ وفخر الامۃ ابو الفتح مودود بن مسعود اطال اللہ عمرہٗ، حررہ ہٰذہ من شہور سنۃ ستۃ وثلٰثین واربعمائۃ (۴۳۶)

۸۔ محراب مسجد شہاب الدین غوری، اس پر یہ عبارت کندہ ہے:
بنا ہٰذا المسجد المبارک فی دولۃ السلطان الاعظم المعظم معز الدنیا والدین ابو المظفر محمد بن سام خلیفۃ اللہ امیر المومنین المنتصف من شہر اللہ المبارک سنۃ اربع وتسعون وخمسمائیۃ،
(۵۹۴ھ)

۹۔ قبر شیخ سلیمان بن احمد الصنعانی سنہ ۵۰۶ھ

۱۰۔ قبر محمد بن بدر الدین صدر القضاۃ زین الملۃ والدین صنعانی۔

۱۱۔ قبر شیخ ابو الفضل محمد بن سلیمان بن احمد صغانی۔

۱۲۔ قبر عبد الرحمٰن الصغانی سنۃ تسع واربعین وسبع مأیۃ۔

۱۳۔ مرقد قضی القضاۃ ناصر المذہب النعمانیۃ جلال الملۃ والدین عبد الرحمٰن بن ملک القضاۃ جمال الدولۃ والدین سلیمان بن احمد الصغانی۔

۱۴۔ روضۃ شیخ قضی القضاۃ ابی نصر احمد بن محمد بن سلیمان۔ سنائی کے ممدوح تھے، انھوں نے حدیقہ میں ان کی تعریف کی ہے:

علم او ہمچو آب شوینده   نام او ہمچو باد پوینده

(اشعار کلیات ص ۱۲۲)

۱۵۔ قبر شجاع الدین عمر بن محمد بن احمد صغانی۔

۱۶۔ قبر سید ابو جعفر محمد بن علی الخاص تاریخ شہر اللہ المبارک رمضان سنۃ ثلاث وخمس مأیۃ۔

۱۷۔ قبر سہل بن محمد الباغیان الغزنوی، کان وفاتہ من شہر ربیع الآخر سنۃ سبع واربعین واربعمأیۃ۔

۱۸۔ قبر الشیخ الجلیل سید ابو الفضل محمد بن علی طوسی ۹ رمضان سنۃ سبعین واربعمأیۃ۔

۱۹۔ قبر شیخ عثمان مشہور بہ ارباہا۔ شیخ مذکور ابو الحسن علی ہجویری جلابی صاحب کشف المحجوب کے پدر بزرگوار تھے، ہجویر اور جلاب غزنین کے دو محلے تھے۔

۲۰۔ قبر الشیخ الاجل محمد سرزی، ان کی وفات لوحِ قبر کے اعتبار سے جمعہ ۲۷ رجمادی الآخر ۵۹۷ھ میں ہوئی۔

۲۱۔ شیخ احمد بن محمد حدادی، یہ علماء و فقہاء کا مشہور خاندان تھا، غالبًا اسی

خاندان کے دو قاضی یوسف بن احمد حدادی اور ابو المعالی احمد بن یوسف بن حدادی شافعی غزنوی سنائیؒ کے اہم ممدوح تھے، حکیم نے ابو المعالی احمد کی مدح حدیقہ اور قصائد میں کی ہے، اور ایک طویل خط ان کے نام لکھا جو ان کے تمام مکتوبات میں سب سے زیادہ عالمانہ ہے، ہمایوں سردر نے ان دونوں مشایخ کی قبر قریہ شالیز میں بتائی ہے لیکن بقول مؤلف ریاض الالواح حکیم سنائیؒ کے روضہ کے جنوب شرق میں امام احمد حدادی کی قبر ہے، مگر اس قبر پر دو لوح ہیں، ایک کا کتبہ یہ ہے: ابی بکر محمد بن شیخ الامام احمد بن محمد الحدادی رضی اللہ عنہما۔ دوسرا کتبہ یہ ہے: کل نفس ذائقۃ الموت، والینا ترجعون، اللّٰھم اغفر وارحم محمود العامر بن حدّاد بن احمد بن محمد۔

ابو نصر احمد بن محمد حدادی کی قبر کے قریب پتھر کے کچھ ٹکڑے ہیں، ان میں کچھ تحریر ہے، جس کے آخر میں یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں:

مجلسًا لذکر راحۃ القلوب الامام الزاہد ابی نصر احمد بن محمد حدادی رحمۃ اللہ رضی اللہ عنہما۔

۲۲۔ قبر سید حسن غزنوی، شہر غزنین کے شرق میں شہر سے متصل اس شاعر شہیر کی قبر بتائی جاتی ہے، مگر یہ قبر کتبے سے عاری ہے۔

۲۳۔ قبر بیرونی، محمود غزنوی کے دربار کے زبردست ریاضی داں اور منجم ابوریحان بیرونی کی قبر شہر سے مشرق ایک احاطے میں ایک پرانے قبرستان میں بتائی جاتی ہے، اس کے ایک کتبہ ہے جو بحالت موجودہ پڑھنے میں نہیں آتا، لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ اس پر بیرونی کا نام درج ہے، اس قبر کی زیارت ہم لوگوں نے کی تھی۔

۲۴۔ آرام گاہ اسماعیل شنبزی، جن کی مدح میں سنائیؒ کا ایک قطعہ دیوان میں ہے

اور حسن کے نام سنائی کا ایک خط ہے، غزنین سے کچھ دور شنیز نام کے گاؤں میں موجود ہے، قبر پر ایک لوحِ سنگ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۰۷۲ھ میں یہ قبر تعمیر ہوئی ہے کتبے میں سنائی کے قطعہ کا پہلا شعر درج ہے:

علم و عمل خواجہ اسماعیل شنیزی   ماراز بچیزی برسانید بچیزی

محمود غزنوی کے مزار سے چند فرلانگ پر شاہراہ کے دوسری طرف ایک ٹیلے پر گوتم بدھ کا مٹی کا عظیم مجسمہ دیکھنے میں آیا، اس کے قریب ہی استوپا بھی کشف ہوا ہے، اس مجسمے سے کچھ پہلے ٹیلے ہی پر ایک مجسمہ ہے جس میں ایک آدمی بھینسے کو ذبح کر رہا ہے۔

بہرحال غزنین عجیب تاریخی مقام ہے، اور اگرچہ پرانی عمارتیں باقی نہیں رہ گئی ہیں، لیکن اس کی عظمت کے ٹوٹے پھوٹے نشان ہزاروں کی تعداد میں کتبات کی شکل میں موجود ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک ان کی بازیافت کی صحیح کوشش نہیں ہوئی، دراصل ان تاریخی نشانات کے تنقیدی مطالعہ کے بغیر غزنین کی تمدنی و سیاسی تاریخ نامکمل رہے گی۔

ہم چند گھنٹے غزنین میں رہے، حالانکہ وہاں کے تاریخی امور کی جانچ پڑتال کے لئے مہینے ناکافی ہیں، بہرحال اس مختصر سی سیاحت سے غزنوی سلاطین کے جاہ و جلال کا ایک ادھورا سا نقشہ سامنے آیا، ساتھ ہی عبرت کا زبردست احساس دل پر ہوا، شام کو ہم لوگ واپس کابل آگئے، اور دوسرے روز سے سمینار کی باقیماندہ کارروائی شروع ہوئی۔

سمینار کے خاتمے پر میری درخواست پر میرے لئے بلخ کی سیاحت کا انتظام

کیا گیا، بلخ کابل سے شمال میں کار سے تقریباً سات آٹھ گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے؛ میں ۲۴ر اکتوبر کو صبح وزارتِ اطلاعات و کلتور کے ایک نمایندہ کے ساتھ کابل سے روانہ ہوا، شروع کے چار پانچ گھنٹے موسم کافی خوشگوار تھا، پہاڑ کی بلندیوں اور وادی کی گہرائیوں سے ہوتے ہوئے چلے جا رہے تھے، جگہ جگہ پھلوں کے باغات اور روئی کے پودوں سے بھرے دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت عجب خوشنما منظر پیش کر رہے تھے، کہیں کہیں دہقان کے کھلیان بھی نظر آجاتے، پہاڑ کے دامن میں جب کوئی مختصر سی آبادی نظر آتی تو اس سے انسان اپنے کو ایک دوسرے عالم میں محسوس کرنے لگتا، غرض چلے جا رہے تھے کہ یکایک موسم بدلا، ہلکی ہلکی برف پڑنی شروع ہوئی، تھوڑی ہی دیر میں برف بڑی شدت سے پڑنے لگی، ساری وادی اور پہاڑ برف کی سفید چادر میں ملبوس نظر آنے لگے، سڑک پر بھی کافی برف جمی ہوئی تھی، میرا کار ڈرائیور کافی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ چلتا جا رہا تھا، آگے چل کر برف کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ ہم دو ڈھائی بجے کے قریب سمنگان پہونچے، یہ ایک چھوٹا سا تاریخی شہر ہے، یہیں کے بادشاہ کی بیٹی تہمینہ سے رستم نے شادی کی تھی، یہی شاہزادی سہراب کی ماں تھی۔ یہاں شاہراہ ہی پر شہر سے باہر ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے جس میں ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ غذا خراب تھی، میں نے بہت ہی تھوڑا کھایا تھا، لیکن میرا ہاضمہ بگڑ گیا، بعد نماز ظہر ہم وہاں سے آگے بڑھے، تھوڑی دیر بعد خلم کا تاریخی شہر آیا، بڑا پُر فضا مقام ہے، یہاں کے باغات نہایت سرسبز ہیں، یہاں ہم نہ رُکے، اور رود خلم پر جو رود آمو سے ملتی ہے؛ ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے بڑھے، ساڑھے چار بجے کے بعد ہم مزار شریف پہونچے، یہی اس خطے کا سب سے بڑا شہر ہے؛

ہرکی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں پہ حضرت علیؓ کا روضہ بنایا گیا ہے اور عام اعتقاد یہی ہے
جناب یہیں مدفون ہیں، روضہ نہایت خوبصورت بنا ہے، بلخ یہاں سے پون گھنٹے
سافت ہے، ہم لوگ وہاں پہونچ سکتے تھے، لیکن ہوٹل وغیرہ وہاں نہیں ہیں، قیام کی
ت مزار شریف ہی میں ہے، چنانچہ شب کو یہیں قیام کرنے کا خیال ہوا، ہم لوگ کابل سے
ی میں چلے تھے، یہاں کی وزارت اطلاعات وکلتور کے دفتر میں ہماری آمد کی اطلاع
نے کی وجہ سے اچھے ہوٹل میں جگہ نہ ملی، مجبوراً مجھے ایک معمولی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا،
نہایت سرد تھی، اس ہوٹل میں سردی سے بچنے کا معقول انتظام بھی نہ تھا، شام کو
باہر نکلا تھا تو دیکھا مزار کے ارد گرد بہت خوبصورت بازار ہے جو غیر ملکی سامان سے
پٹا ہے، کپڑے کے ایک جواں سال دوکاندار کے استفسار پر جب میں نے حضرت علیؓ
مزار شریف میں مدفون ہونے کو غیر محقق بتایا تو اس کو تعجب ہوا، بہرحال اسی بہانے
شہر کی روز افزوں ترقی ہوئی اور آج یہ افغانستان کا سب سے زیادہ متبرک مقام خیال
جاتا ہے، میں نے عصر اور مغرب کی نمازیں روضہ کی مسجد میں ادا کیں، سردی کی زیادتی
وجہ سے عشاء کی نماز میں شامل نہ ہو سکا، صبح ہم لوگ وزارت کلتور کے ایک نمایندے
مزار شریف کے ساتھ بلخ روانہ ہوئے، اس نمایندے کا نام میں بھول گیا ہوں،
ذہین اور تیز جوان تھا، جو اخبار "مزار شریف" سے بھی متعلق تھا، اس نے مزار شریف
کے درمیان جو گاؤں تھے سب کا نام لکھ کر دیا تھا مگر وہ کاغذ کہیں گم ہو گیا، بہرحال
ی پون گھنٹہ میں ہم لوگ بلخ پہونچ گئے، اب یہ شہر بالکل اجڑ چکا ہے محض ایک
ٹا سا قصبہ رہ گیا ہے، مگر یہ خطہ ولایت بلخ کہلاتا ہے، والی بھی بلخ میں رہتا ہے بلخ کی
ت کا اندازہ صفی الدین واعظ بلخی کی کتاب "فضائل بلخ" سے جو ۶۱۰ھ میں مرتب ہوئی

لگایا جا سکتا ہے، اس کتاب میں دو جگہ لکھا ہے کہ اس شہر میں ۱۸۴۰ مساجد، ۴۰۰ کالج (مدارس آبادان) نو سو بڑے مدرسے (دبیرستان معتبر) پندرہ سو مفتی، پانچ سو ادیب، پانچ سو حمام، چار سو گنبد یخدان، تین سو حوض عمومی ہوتے، آج وہاں کی پرانی یادگاروں میں صرف تین چار چیزیں باقی رہ گئی ہیں، مثلاً:

(۱) مزار عکاشہ، یہ شہر سے تقریباً دو کلومیٹر مشرق میں اجڑے ہوئے قلعے سے جنوب میں تقریباً سو گز پر ہوگا، مزار پر کتبات موجود ہیں۔

(۲) مسجد گنبد، غزنوی دور کی اس یادگار مسجد کا کچھ حصہ شہر سے جنوب میں پایا جاتا ہے۔

(۳) گنبد خواجہ پارسا جو ۸۶۷ھ میں تعمیر ہوا تھا، اسی کے حوالی قبر میں بعض اہم شخصیات دفن ہیں جن کی فی الحال کوئی تفصیل میرے پاس نہیں۔

(۴) قلعہ، شہر سے تقریباً ۱½ کلومیٹر مشرق میں اجڑی ہوئی حالت میں موجود ہے، اس کے اوپر ہم لوگ گئے تو شمال سے ایسی سرد اور تیز ہوا چل رہی تھی کہ ہر آن گر پڑنے کا اندیشہ تھا۔

قلعہ سے کچھ قبل چند درختوں کے جھنڈ میں ایک قبر ہے جو کسی قصاب کی بتائی جاتی ہے یہاں میلہ لگتا ہے، یہ مقام دانتوں کے درد میں بڑا پُر تاثیر بتایا جاتا ہے، جس کے درد ہوتا ہے وہ ایک کیل درخت میں گاڑ دیتا ہے، یہی مراد مانگنے کا طریقہ ہے، وہاں کے درخت جڑ سے تنے کے اوپر تک کیلوں سے اتنے پُر ہیں کہ ان کو کیلوں ہی کا درخت کہنا چاہئے۔

بلخ میں کوئی چیز دیکھنے کی نہیں، ایک طویل و عریض مسطح میدان ہے جو میلوں میں پھیلا ہے، زمین نہایت سرسبز ہے، خاص کاشت روئی کی ہوتی ہے، اکتوبر میں روئی کے

درخت پھولے ہوئے تھے، یہاں پر ایک سوتی مل ہے جو موٹے کپڑے بناتی ہے، روئی کے اور بھی کارخانے ہیں۔

دوپہر تک ہم مزار شریف واپس آ گئے، یہاں ایک کتب خانہ قلمی کتابوں کا ہے جو یہاں کے میوزیم کا ایک حصہ ہے، کتاب خانے میں بعض خطی کتابیں میری دلچسپی کی تھیں، ان کی مختصر سی یادداشت بھی تیار کر لی تھی، مگر وہ دوسرے کاغذات میں مل گئی، اور اس وقت تک مجھے مل نہیں سکی ہے۔

ظہر کی نماز کے بعد ہم لوگ کابل روانہ ہوئے، مزار شریف کا نمایندہ ساتھ نہ تھا، البتہ کابل کا نمایندہ ساتھ ہی واپس ہو رہا تھا، ہر افغانی کی طرح اس کو مزار شریف سے بڑا لگاؤ تھا، واپسی میں مجھ سے کہا کہ میری پیدائش مزار شریف میں ہوئی ہے، اس لئے مجھے اس سے بہت زیادہ تعلق خاطر ہے، ہم لوگ رات میں ۹ بجے کے بعد کابل پہونچے اور سیدھے کابل ہوٹل گئے، کاؤنٹر پر معلوم ہوا کہ صبح میری جگہ ہوائی جہاز میں مخصوص ہو چکی ہے، چنانچہ وہی کارمند وزارت بہت صبح آ گئے، سامان درست کرنے میں میری مدد کی اور کار سے ایرپورٹ پہونچا دیا، ایرپورٹ پر ڈاکٹر شمیم صاحب اور ڈاکٹر تھڈانی صاحب میری "خدا حافظی" کے لئے تشریف لائے، غرض ان حضرات سے رخصت ہو کر افغان ایر سے دہلی آیا اور شام کی گاڑی سے اسی روز یعنی ۲۶ر اکتوبر کو علی گڑھ پہونچ گیا، واپسی پر سیمینار سے متعلق ایک مختصر گزارش ICCR کو پیش کر دی، کچھ دن گزرنے پر سفارت ہند کی طرف سے ICCR ہی کے توسط سے ایک بڑا پلندہ

کانفرنس سے متعلق کاغذات کا ملا، کچھ عرصے بعد مکاتیب سنائی طبع کابل کی سو جلدیں سفارت ہند کے توسط سے ملیں، یہ جلدیں دانش گاہ کابل نے عنایت کی تھیں، میں انڈین کاؤنسل اور سفارت ہند کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔

بزم تیموریہ جلد اوّل

بزم تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، ان کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امرار شعرار و فضلار کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا، اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے، تاکہ تمام مغل سلاطین اور ان کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق اور ان کے عہد کے اور ان کے دربار سے متوسل علمار و فضلار و شعرار کا تذکرہ اور ان کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابل مطالعہ جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیر ترتیب ہے۔

قیمت ۱۲ روپیہ

مرتبہ

سیّد صباح الدین عبد الرحمٰن

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم
کی
وفات حسرت آیات پر تعزیتی خطوط

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم ۱۲ اگست ۱۹۷۹ء مطابق ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ اعظم گڈھ سے اپنے وطن تشریف لے گئے، وہاں پہونچتے ہی حسب ذیل خط لکھا جو اُن کی زندگی کا آخری خط راقم کے نام تھا، اس کا چربہ درج ہے، "ص - ع"

باسمہ　　تھولنڈی ضلع رائے بریلی

۲۲ اگست ۷۹ء

محب مکرم - السلام علیکم

کل دو بجے یہاں پہونچا سفر کے اثر سے پیر پر ورم حد سے زیادہ ہوگیا اور بواسیر سے خون بہت نکلا، دو بجے دن سے صبح چار بجے تک ۱۴ گھنٹے مسلسل خون آتا رہا چار بجے صبح سے بند ہے اس کی وجہ سے نقاہت بہت بڑھ گئی ہے، پانوں کے سرخ دانے بدستور ہیں منہ بالکل اچھا ہوگیا تھا مگر کل ایک سیاہ چھالا اور ہوگیا آج کمی ہے،

صحت کی اس حالت میں رائے بریلی جانا غیر یقینی ہے علی میاں کو اس صورت حال کی اطلاع دے دی ہے،

عید بعد لکھنؤ جاؤں گا تو رجسٹریشن وغیرہ کے بارہ میں کارروائی کروں گا۔
افتخار سے کتابت کے سلسلہ میں بھی گفتگو کروں گا،

خیام اور نقوش سلیمانی دونوں کے فوٹو کے سلسلہ میں بذریعہ خط ارکان
سے منظوری مصارف کی لے لیجئے،

جب میں صبح پانچ بجے اعظم گڑھ کے بس اسٹینڈ پہونچا تو بس اسٹارٹ ہورہی
تھی لطا ہر صاحب اور حاجی صاحب بس سے شاہ گنج جا رہے تھے انھوں نے کنڈکٹر سے کہکر ذرا
بس کو رکوایا تو جلدی جلدی ہم لوگ سوار ہو گئے اس میں رکشا کا کرایہ دینا بھول
گیا، مالی کو دو روپے دیئے تھے غالباً وہی رکشا والوں کو دے دیئے ہوں گے
طاہر صاحب کے ہاتھ تین روپے بھیج دیئے ہیں کہ مالی کو دے دیں گے آج وہ اعظم گڑھ
آنے والے تھے۔

صدر جمہوریہ کے اعلان سے بڑی ہلچل ہے
احتشام صاحب اور رفقاء وغیرہ سے میرا حال بیان کر دیجئے فقط

عبدالسلام قدوائی

اُن کی وفات کی خبر سُن کر ہندوستان کے ہر گوشہ سے جو تعزیتی خطوط آئے اُن میں سے
کچھ درج ذیل ہیں:- "ص - ع"

باسمہ تعالیٰ

ندوۃ العلماء
۲۹ اگست ۱۹۷۰ء

برادر محترم و مکرم زید مجدہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا مکتوب ملا، میں کن لفظوں میں آپ سے تعزیت کروں کہ خود ہی تعزیت کا

مستحق ہوں، دارالعلوم اور دارالمصنفین دونوں بلکہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کا پورا حلقہ، عقیدت متاثر و قابلِ تعزیت ہے، ملاقات ہوگی تو زبانی باتیں ہونگی آپنے ارکان کو لکھنؤ میں جمع ہونے کا تار دیا ہے ضرورت تو اس کی بہت ہے لیکن یہ خیال رہے کہ ۶ ستمبر سے ۱۴ ستمبر تک میں لکھنؤ سے باہر رہوں گا، ۱۴ ستمبر کے بعد اگر یہ اجتماع ہو تو بہتر ہے، مولوی نعیم صدیقی صاحب سے میں نے زبانی کہا تھا لیکن شاید پوری بات ان کو یاد نہ رہی ہو، احتیاطاً لکھ رہا ہوں، اور کیا عرض کروں،

تن ہمہ داغ داغ شد　　　پنبہ کجا کجا نہم

والسّلام

دعاگو　ابوالحسن علی ندوی

(۲)

حبیب منزل ۔ میرس روڈ علی گڈھ

۲۹ اگست ۷۹ء

جناب سید صاحب مکرم　　　السّلام علیکم

مولوی عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کے انتقال پر ملال کی خبر پرسوں اچانک سُنی، آج الجمعیۃ روزنامہ میں دیکھا کہ ۲۴ اگست یوم جمعہ مطابق ۳۰ رمضان مبارک بوقت سہ پہر اپنے وطن قصبہ تھولنڈی ضلع راے بریلی میں انتقال ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، بہت افسوس ہے، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ مولوی صاحب میں بہت سی خوبیاں تھیں، عالم سمجھدار، با اخلاق، منکسر مزاج، متواضع بزرگ تھے، آپ کو مولوی صاحب کے اعظم گڈھ آجانے سے تقویت تھی، آپ کے پاکستان کے طویل قیام کے دوران میں دارالمصنفین

کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے رہے، کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ جگہ خالی ہوگئی، جانشین ملنا آسان نہیں،

خاکسار

عبید الرحمٰن

(۳)

بھوپال

۲۶ اگست ۷۹ء

(بذریعہ تار) مولانا عبد السلام قدوائی کی وفات سے نہایت مغموم اور رنجیدہ ہوں،

محمد عمران خاں

(۴)

ندوۃ المصنفین دہلی

یکم ستمبر

محبی و مکرمی جناب سید صاحب دام مجدہم

السلام علیکم

مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کی اچانک رحلت کی خبر سُن کر قلب پر چوٹ لگی، پہلے سے ان کی علالت کی خبر نہیں تھی، اور شاید علیل رہے بھی نہیں، افسوس دار المصنفین ایک فاضل، مخلص اور بے لوث عالم دین اور بہت اچھے انشا پرداز سے محروم ہوگیا مرحوم غیر معمولی خصوصیات اور کمالات کے امین تھے، پیکر اخلاق و انکسار، مجسم تواضع، ذہنی اعتبار سے نہایت متوازن، اپنے مسلک میں مضبوط، اور دوسرے مسلکوں کے لئے کشادہ دل، یہ ہمارے اندازوں کی غلطی تھی اور یہ سمجھ رہے تھے کہ مرحوم ابھی بہت دنوں تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے، از راہِ کرم تعزیت قبول فرمائیں،

"عتیق الرحمٰن عثمانی"

(۵)

دفتر جماعت اسلامی ہند - دہلی،

۶-۱۰-۶۹ برادرِ مکرم!

السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُه،:-

برادرم مولانا عبدالسلام قدوائی صاحب کی وفات کی خبر مجھکو عید کے دن ملی، دل کو بڑا صدمہ ہوا، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، اور جملہ متعلقین اور احباب کو صبر جمیل کی توفیق دے،

مرحوم سے اُس دن آپ کے ساتھ ملاقات ہوئی تو ماشاءاللہ صحت مند تھے، اُن کا خلوص و محبت سے ملنا ابھی تک یاد ہے، کسے معلوم تھا کہ اتنی جلد وہ ہم سے جدا ہو جائیں گے، اور اُس دن کی ان سے ہماری آخری ملاقات ہوگی،

ایک دن تو ہر ایک کو جانا ہے، آج وہ تو کل ہماری باری ہے، وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو کامیابی کے ساتھ مراحلِ حیات طے کرکے اپنی ابدی جائے قرار کے لئے روانہ ہو گئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو مرحوم سے حوضِ کوثر پر اُس دن ملا دے جس دن ہر مومن بندہ اپنے بچھڑے ہوؤں کو پالے گا، اور پھر جدائی کا کوئی سوال نہ ہوگا،

والسلام محمد یوسف

(۶)

محترمی -! سلام مسنون

آج اخبار سنگم پٹنہ میں جناب مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی (علیہ الرحمۃ) کے انتقال کی خبر ملی، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن، دارالعلوم ندوہ کے لئے یہ تیسرا زبردست

حادثہ ہے، اور دارالمصنفین کے لئے بھی،

میں آپ کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے، اور اُن کے گھر کے لوگوں کو، اور ان کے احباب و مخلصین کو صبر و سکون عطا کرے، آمین!

ہماری رائے ہے کہ آپ لوگ مولانا عبد اللہ عباس ندوی سلمہٗ کو بلوالیں، یہ ماشاء اللہ جوان اور بلند ہمت آدمی ہیں، عربی زبان کے ماہر اور باہمہ صفت عالم ہیں، ندوہ کا کام بھی اچھا کریں گے اور دارالمصنفین کی خدمت بھی بہتر طریقہ سے انجام دیں گے،

امسال ہمارا ارادہ حج و زیارت کا ہے، ابھی جہاز کی تعیین نہیں ہوئی ہے، اسلئے روانگی کا پروگرام ابھی نہیں بنا ہے، دعا کیجئے کہ صحت و عافیت کے ساتھ حج کے ارکان پوری ہو جائیں، حج و زیارت سے واپسی کراچی ہو کر ہوگی،

محمد امان اللہ قادری پھلواروی

۳۰/۸/۷۹ء

(۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پھلواری شریف
۷ر شوال ۱۳۹۹ھ
۳۱ر اگست ۱۹۷۹ء

گرامی قدر، محب مکرم سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ:۔

پرسوں پٹنہ کے اخبار سے اچانک اطلاع ملی کہ جناب مولانا عبد السلام قدوائی اللہ کو پیارے ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ خبر ذرا دیر سے ملی، مگر بڑی صبر آزما اور دلدوز ثابت ہوئی، عزیزی مولوی نصر احمد سلمہ ۳ رمضان مبارک کو اعظم گڈھ سے پھلواری آئے تو ان سے آپ دونوں کی خیریت اور حالت میں نے خاص طور سے دریافت کی، اور اُن کے بتانے پر اطمینان

ہو گیا، پھر ان کو دارالمصنفین کے کسی خط سے خبر ملی کہ مولانا رمضان کے آخری عشرہ میں مکان گئے، اب یہ رحلت کی اطلاع صاعقہ بن کر آئی تفصیل کا کچھ علم نہ ہو سکا کہ علالت کیا ہوئی !

بہرحال مشیتِ الٰہی یہی تھی اور رمضان مبارک کی رحمت و مغفرت اور رستگاری جہنم سے نوازنے کے لئے اُن کو رمضانِ مبارک کے آخری دن جمعہ کے روز بلا لیا گیا، اور وہ رحمت و مغفرت کی چادروں میں ڈھانک لے گئے، سچ ہے اور کہنے والے نے بالکل سچ کہا ہے،

رحمتِ حق بہانہ می جوید رحمتِ حق بہا نمی جوید

مولانا بڑی مرنجاں مرنج طبیعت کے آدمی تھے، اور خاموشی کے ساتھ بہت مستحکم اور ٹھوس کام کرتے تھے، میری ملاقات اُن سے اُس وقت سے تھی جب وہ دہلی جامعہ ملیہ اور تعلیماتِ اسلام وغیرہ میں تھے، اور بڑی بے تکلفانہ گفتگو مجھ سے فرماتے تھے، اور جب بھی ندوہ یا دارالمصنفین میں ملاقات ہوتی تو بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، اور محبت و شفقت سے باتیں کرتے، شاہ معین الدین صاحب مرحوم اور میرے یہاں کے شاہ عزالدین صاحب اور مولانا قدوائی یک ہی دور کے ندوی تھے، افسوس کہ ان میں سے کوئی نہ رہا،

ع:۔ افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

یہ حادثہ بڑا قومی و علمی حادثہ ہے اور دارالمصنفین کے لئے نہایت شدید و سنگین سانحہ۔

شاہ صاحب مرحوم کے بعد آپ کی تنہائی دور ہونے کا سامان مولانا کے وجود سے ہو گیا تھا، مگر چند سال کے بعد آپ کے لئے پھر وہی منزل آگئی، یہ سوچ کر بہت دکھ ہوتا ہے، کاش آپ کو کوئی اور معاون مل جائے وما ذٰلک علی اللہ بعزیز،

والسلام

عون احمد

(۸)

یکم ستمبر ۱۹۷۹ء

چاند پٹی برادر مکرم السّلام علیکم

میں رمضان بعد ہی سے آپ کے یہاں آنے کا ارادہ کر رہا تھا، اور قدرتاً اس خیال سے خوشی ہو رہی تھی کہ اس موقع پر مولانا عبدالسّلام صاحب سے بھی ملاقات ہوگی، اور اُن سے ہم کلام ہونے کی مسرت حاصل ہوگی، لیکن کل شام دعوت سے یہ معلوم کرکے کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن،

ابھی جلد ہی رمضان سے قبل اُن سے ملاقات ہوئی تھی، یہ کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر جلد رخصت ہونے والے ہیں، اس موقع پر اُن کی خوبیاں شدت سے یاد آرہی ہیں، مولانا کے اہلِ خانہ غالباً دارالمصنفین ہی میں ہوں گے، بڑی عنایت ہوگی، میری طرف سے تعزیت فرمادیں،

افسوس ہے کہ ہمارے لائق افراد یکے بعد دیگرے اٹھتے جارہے ہیں، اور بظاہر اُن کی جگہ لینے والے نظر نہیں آرہے ہیں، اللہ تعالیٰ اُمتِ مسلمہ پر رحم فرمائے،

ندوہ کے لئے تو خاص طور سے ایک سنگین حادثہ ہے، ابھی دو زخم تازہ ہی تھے کہ تیسرے حادثہ سے بھی اسے دوچار ہونا پڑا، یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کیا بیماری تھی، اور کب وطن تشریف لے گئے تھے، طبیعت آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہے لیکن آنے میں محض اس بنا پر پس وپیش ہو رہا ہے کہ معلوم نہیں آپ اعظم گڈھ میں ہیں یا تعزیت کے لئے رائے بریلی چلے گئے ہیں،

والسّلام

ابواللیث

(۹)

۲۸ / ۸ / ۷۹ء

جامعہ ملیہ، نئی دہلی،

محترمی! السلام علیکم

لیجئے ہمارے اور آپ کے مولانا بھی آپ کو تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے"
انا للہ و انا الیہ راجعون، اور آپ کے لئے نئی آزمائشیں آ کھڑی ہوئیں، یہ آپ کا ذاتی غم تو ہے ہی دار المصنفین کے لئے بھی ایک بڑا حادثہ ہے، اور چونکہ آپ اور دار المصنفین ایک دوسرے سے الگ نہیں، اس لئے یہ دُہرا اور کاری زخم ہے جو آپ کو لگا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت اور قوت دیں کہ آپ اس غم کو مردانہ وار جھیل لے جائیں۔

آپ میں اور مولانا میں اب ایسا تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا کہ ہم لوگ آپ دونوں کی سلامتی صحت کی دعا مانگا کرتے تھے کہ آپ دونوں کے سہارے دار المصنفین کے کام بخیر و خوبی انجام پاتے رہیں گے اور اس کا علمی و تہذیبی معیار باقی رہے گا، اب آپ پھر ایک بار تنہا رہ گئے، کاش کوئی مرد کار غیب سے پھر آ جائے اور کسی حد تک یہ خلا پُر ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے اور آپ کی صحت بھی ساتھ دے، ورنہ کیا ہوگا؟ اس تصور ہی سے طبیعت متفکر ہو جاتی ہے۔

مولانا علی میاں صاحب کے لئے بھی ایک بڑا حادثہ ہے، محمد الحسنی مرحوم اور اسحٰق جلیس مرحوم کا غم ہی کیا کم تھا کہ تیسرا چرکا ان کو لگا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کا سایہ ہم لوگوں پر قائم رہے۔

دار المصنفین کے دوسرے تمام رفقاء اور کارکنوں سے سلام کہیئے اور میری طرف سے

تعزیت بھی کر دیجئے، اہل جامعہ بھی مولانا مرحوم کی وفات سے بہت متاثر ہیں، آپ واقف ہیں کہ انھیں جامعہ اور اہل جامعہ سے کتنا گہرا تعلق تھا۔

خدا کرے آپ کی طبیعت ٹھیک ہو، پچھلے دنوں تو آپ بھی علیل تھے، اب کیسے ہیں؟ تمام پرسانِ حال کو سلام عرض ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی

(۱۰)

بسم اللہ

دہلی ۲۸ / اگست ۱۹۷۰ء

مکرمی صباح الدین صاحب! السلام علیکم

میں پریس کمیشن کے کام کے سلسلے میں رمضان المبارک کی ۳۰ کو یہاں آیا، اور اسی دن شام کو جامعہ نگر گیا، افطار کے وقت وہیں یہ افسوس ناک خبر ملی کہ آپکے رفیق مولانا عبدالسلام صاحب پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ دوسرے دن صبح نماز عید کیلئے جامعہ کی مسجد میں گیا تو وہاں معلوم ہوا کہ رمضان کی آخری تاریخ کو ان کا اپنے گاؤں میں انتقال ہوگیا' اناللہ وانا الیہ راجعون، امام صاحب نے نماز عید سے قبل یہ خبر نمازیوں کو سنائی اور مولانا کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔

مرحوم عبدالسلام قدوائی صاحب سے مجھے مدتوں نیاز حاصل رہا، ان پر ندوہ اور جامعہ دونوں کی چھاپ تھی، صحیح معنوں میں عالم باعمل تھے اور اس دور میں جن علماء کو ہم واقعی روشن خیال کہہ سکتے ہیں' ان میں مرحوم کا بھی شمار ہوتا ہے، آپکے تو رفیقِ کار تھے اور دارالمصنفین کے کاموں میں آپ کے ساتھ تھے، ان کی پُروقار شخصیت

اوران کے چہرے کی مسکراہٹ آنکھوں میں پھر رہی ہے، رمضان المبارک میں موت بھی خوش نصیبوں ہی کا حصہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے، ان کے پس ماندگان کو اور آپ جیسے ان کے رفقائے کار کو صبر جمیل عطا کرے۔

آپ کا مخلص   معین الدین حارث
(صدر انجمن اسلام بمبئی، چیرمین حج کمیٹی)

(۱۱)

۱/۹/ ۷۹ء لال محل

سید والاتبار زادالطافہٗ! سلام مسنون

رات کو ایک کرم فرما آئے تھے، انھوں نے بتایا کہ اخبار الجمعیۃ میں مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی کی وفات کی اطلاع شائع ہوئی ہے، اس اطلاع سے صدمہ ہوا، اللہ پاک مغفرت فرمائیں، وہ میرے بھی دیرینہ کرم فرما تھے، نہایت منکسر المزاج اور صاحبِ کمال تھے، آپ کے دوست اور مددگار تھے، ان کی دائمی جدائی سے آپ کو بھی صدمہ ہوگا، اللہ پاک صبر کی توفیق عنایت فرمائیں اور اجر عظیم بھی عنایت فرمائیں، جو صاحب کمال اٹھ جاتا ہے، اس کی جگہ خالی رہتی ہے، نعم البدل کم ہی ملتا ہے یا ملتا ہی نہیں، اللہ پاک مرحوم کو سایۂ رحمت میں مقام عنایت فرمائیں اور حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ان کے مراتب بلند فرمائیں، آمین ثم آمین۔

نیازمند
اخلاق حسین دہلوی
لال محل۔ بستی حضرت نظام الدین اولیائ دہلی ۱۱۰۰۱۳

(۱۲)

باسمہٖ تعالیٰ

قاضی منزل، قاضی اسٹریٹ۔ میرٹھ

مخلص محترم! مدت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج سامی بخیر۔

پرسوں کے "الجمعیۃ" سے محب مکرم مولانا عبدالسلام قدوائی کے یکایک انتقال کا حال معلوم ہوا۔ بے حد رنج و افسوس ہوا، افسوس ہے کہ علم و فضل کی ایک اور شمعِ فروزاں گل ہوئی، اور ندوۃ العلماء کا ایک اور ستون گر گیا۔

میرا مرحوم کے ساتھ سترہ۱۷ سال تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں رفاقت کا تعلق رہا، کبھی ان کی طرف سے کوئی بات ناگواری خاطر کی پیش نہیں آئی، محبت و اخلاص کا پیکر، اور رواداری و اعتدال فکر و نظر کا مجسمہ تھے، انہی اوصاف و محاسن کی وجہ سے جامعہ میں ان کے احباب اور نیازمندوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ رٹیائرمنٹ کے بعد دارالعلوم اور دارالمصنفین دونوں جگہ سہارا دیا اور اپنے بزرگوں کی جانشینی کا حق ادا کیا، دارالمصنفین میں ان کے نہ ہونے سے سارا بوجھ آپ پر آپڑا ہے، اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔

اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ عطا فرمائے اور احباب و اعزہ کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

آپ اور دیگر ارکانِ دارالمصنفین میری طرف سے دلی تعزیت قبول فرمائیں، والسلام

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

صدر مرکزی دینی تعلیمی بورڈ۔ دہلی

(۱۳)

دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

۵ رشوال ۹۹ھ

مکرم و محترم! سلام مسنون

چند دن ہوئے میں نے اپنی ایک ضرورت سے خط لکھا ہے، کل کے اخبارات میں
نرم مولانا عبدالسلام قدوائی کے انتقال کی خبر ملی، موصوف اپنے علم و فضل کی پختگی اور
تدال فکر کے لحاظ سے نمایاں حیثیت کے مالک تھے، اور کچھ شک نہیں کہ دارالمصنفین کے
ی وقار کے باقی رکھنے میں آپ کے مددگار تھے، انتقال کے لیے بڑا اچھا وقت پایا، یہ
، کے اعمال حسنہ کی مقبولیت کی ایک علامت ہے کہ رمضان کے ماہ رحمت نے انھیں
، آغوش میں لیا، میں اہل علم حضرات کی جدائی کا صدمہ محسوس کرتا ہوں، حق تعالیٰ مولانا
دم کو جوار رحمت میں جگہ دیں اور آپ سب حضرات کو صبر جمیل اور ان کا نعم البدل عنایت ہو
ہ کرم فرصت ملنے پر میرے پہلے خط کا جواب عنایت فرمائیں۔

سید محمد ازہر شاہ قیصر

(۱۴)

جامعہ ملیہ، نئی دہلی

۲۴ راگست ۱۹۶۹ء بوقت ۱۰ ½ بجے شب

محترمی! السلام علیکم

آج ۱۱ بجے کے قریب اطلاع ملی کہ مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی سخت
ں ہیں، اپنے تمام متعلقین کو فوراً بلایا ہے، ان کے ایک صاحبزادے دفتر میں تھے،

ان کو فوراً اطلاع کی گئی اور سب لوگ ایک بجے تک اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گئے کہ جو ٹرین بھی
مل جائے گی اس سے چلے جائیں گے، ابھی رات کے سوا دس بجے ان کے عزیزوں سے یہ
معلوم کرنے گیا کہ کون کون لوگ گئے ہیں اور کس ٹرین سے گئے ہیں، نیز یہ کہ لکھنؤ سے کوئی
اور اطلاع تو نہیں آئی ہے، تو معلوم ہوا کہ مولانا کا انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔
اگرچہ مولانا کی عمر کافی تھی، دل کے مریض بھی رہ چکے ہیں، کچھ نہ کچھ بیماری لگی ہی رہتی تھی،
مگر پھر بھی اس منحوس اطلاع کے لئے دل تیار نہیں تھا، سخت دھچکا لگا۔
مولانا جہاں بھی رہے، ندوہ، جامعہ اور بالآخر دارالمصنفین میں، ہر جگہ انتہائی مقبول
اور ہر دلعزیز رہے، ان کی نیکی، ان کی شرافت، ان کی سادگی، ان کا علم و فضل، ایک
ایک کر کے سبھی چیزیں یاد آتی ہیں، جامعہ میں ان کے جمعہ کے خطبے لوگوں کو بہت پسند
تھے، لوگوں کو انتظار رہتا تھا کہ مولانا آئیں تو ان کے خطبے سننے کو ملیں، وہ بہت تکلف
کرتے، فرماتے کہ یہ مستقل امام کا حق ہے، ان ہی کو نماز پڑھانی چاہئے اور خطبہ دینا چاہئے،
مگر جب خود امام صاحب اصرار کرتے تو وہ مجبور ہو جاتے، افسوس کہ ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ
کے فاضل اور دارالمصنفین کے رفیق سے ہم لوگ محروم ہو گئے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو ان کی نیک
صفات اور مخلصانہ خدمات کے عوض میں اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

نیاز مند: عبداللطیف اعظمی

(۱۵)

انصاری لاج۔ لال ڈگی۔ علی گڑھ　　　۲۶/۸/۱۹۷۶ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

اخبار سے مولانا عبدالسلام قدوائی صاحب کے ناگہانی انتقال پُر ملال کا حال معلوم ہو کر

ولی رنج و افسوس ہوا، اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو توفیق صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)

اس واقعہ کا آنجناب پر جو اثر ہوا ہوگا اور مرحوم کے انتقال سے دارالمصنفین میں جو خلاء پیدا ہوگیا ہے، اس کا بخوبی اندازہ ہے مگر مشیت ایزدی میں بجز صبر چارۂ کار ہی کیا ہے، اس لئے خود صبر و ضبط سے کام لے کر دوسرے رفقاء کو بھی تلقین صبر کیجئے، یقیناً مرحوم کے انتقال سے جو علمی خلاء پیدا ہوگیا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے اور آپ کو ان کی وجہ سے جو تقویت و سہارا تھا اس کا بھی نعم البدل دشوار ہے، ازراہ کرم جملہ رفقائے دارالمصنفین کو میرے کلماتِ تعزیت پہونچا کر تلقین صبر فرمادیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ پاک مرحوم کی تربت کو نور سے معمور فرما کر انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، میں بھی آج اپنے ایک شفیق استاد کی پدرانہ محبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

غمگین و شریک غم

اقبال انصاری

(۱۶)

۶ ستمبر ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری۔ جامعہ ملیہ دہلی

محترم صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بیحد صدمہ اور رنج ہوا، مولانا سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۲ء میں ہوئی جب میں نے لائبریری میں ملازمت حاصل کی،

جس لطف و مروت اور خوش خلقی سے مولانا مرحوم نے مجھ سے گفتگو کی وہ ہمیشہ یاد رہے گی، اس کے بعد جبتک مولانا یہاں رہے اکثر و بیشتر ملاقات کے مواقع ملتے رہے، ان کے جیسا عالم باعمل کم ہوتا ہے، مرحوم مجھ پر بے حد کرم فرماتے تھے۔

ادارہ دارالمصنفین کے لئے اور آپ کے لئے یہ حادثہ سخت ہے، گو میری یہ بساط نہیں کہ آپ کو صبر کی تلقین کروں، میں خدا سے ملتجی ہوں کہ وہ آپ لوگوں کو اس صدمہ کو برداشت کرنے کی قوت دے۔ فقط والسلام

مخلص: شہاب الدین انصاری

لائبریرین

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

(۱۷)

بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔۰۰۱۱

۲۶ راگست ۱۹۷۹ء

برادرم صباح الدین صاحب! السلام علیکم

مولانا عبدالسلام قدوائی کی وفات کی اچانک خبر سن کر بے حد صدمہ ہوا، خداوند تعالیٰ ان کی یقیناً مغفرت فرمائے گا، اس درجہ نیک، مخلص اور صالح دل و دماغ کا مالک انسان مشکل ہی سے مل سکے گا، ایسے ہی عالم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے، افسوس ہے کہ دارالمصنفین کو ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع زیادہ مدت نہ مل سکا۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ فقط

مخلص: عتیق صدیقی

(۱۸)

اکبر پور۔ فیض آباد ۲۲۴۱۲۲ ۳۰؍ اگست ۱۹۷۹ء

محترم و مخدوم دامت معالیکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پرسوں دانش محل لکھنؤ میں اتفاقیہ یہ خبر ملی کہ مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، یہ بھی پتہ چلا کہ یہ سفر آخرت مرحوم کو بڑی مختصر علالت کے بعد اچانک ہی پیش آیا، خداوند عالم حسن مغفرت سے نوازے۔ ایسے رفیق کی جدائی سے جو قلبی صدمہ آپ کو ہوگا اس کا پورا احساس ہے، امید ہے کہ مشیت صبر و شکیب ارزانی کرے گی، میرے قیام شبلی منزل کے وقت مرحوم نے جس التفات کا اظہار کیا تھا، اس کی لذت آج تک تازہ ہے اس لئے مجھے بھی صدمہ ہے۔

راقم: سبط محمد نقوی

(۱۹)

بمبئی یکم ستمبر ۱۹۷۹ء

محترمی! السلام علیکم

ان شاء اللہ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ مولانا عبدالسلام قدوائی صاحب کے ناگہانی انتقال کی خبر سن کر سخت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے اور اقربا و احباب کو صبر جمیل عطا فرمائے، اس اطلاع سے بیشتر آپ کا ایک خط بھی ملا ہے، ابا جان (منشی عبدالعزیز انصاری) اندور بغرض شرکت شادی تشریف لے گئے ہیں اور ان شاء اللہ پرسوں مورخہ ۳ کو واپسی کا ارادہ ہے اسی وقت ان شاء اللہ وہ مطلع ہوں گے، آپ کو ایک مفصل خط تحریر کروا چکے ہیں امید کہ ملا ہوگا۔ والسلام۔

احقر: ابوصالح

ادبیات

غزل

از جناب علی جواد زیدی صاحب علی گڑھ

ہجومِ شوق میں ہم کوئے یار سے گذرے　　نسیم جیسے دیارِ بہار سے گذرے
حیات و موت کا باریک فرق جان گئے　　جو لوگ مرحلۂ انتظار سے گذرے
عجیب شرط یہ پایا صبا نے اذنِ خرام　　گلوں تک آئے مگر نوکِ خار سے گذرے
نظر اٹھی تھی کہ نشتر سے چبھ گئے دل میں　　مگر یہ کیسے کہیں ایسے پیار سے گذرے
وہ ذوقِ راہ نوردی دیا جنوں نے ہمیں　　کہ ہم حدِ خلشِ اعتبار سے گذرے
سکونِ بے خبری کاش ایک دن ہوگا　　دیارِ زلزلہ و انتشار سے گذرے
رہِ وفا کی فضا میں نہ جانے کیا دیکھا　　کہ وہ بھی آئے تو کچھ اشکبار گذرے
ہوائے دورِ جوانی ذرا تھمے تو کہوں　　کہ اب دریچۂ لیل و نہار سے گذرے
نہ جانے کانٹوں کے ہونٹوں تک آئی لہو کس کا　　رواں دواں تو ہمیں خارزار سے گذرے
خزاں تو کیا انھیں اب خم یا بھی یاد نہیں　　وہ قافلے جو جوارِ بہار سے گذرے
دلوں تک آئی ہیں یادیں کئی کارواں لیکن　　دلوں کو چھوتے ہوئے نوکِ خار سے گذرے
جنونِ شوق نے کیا کہہ دیا کہ اہلِ نظر　　فضائے پیرہنِ تار تار سے گذرے
عطائے جام کا شکریہ ہے، مگر ساقی　　وہی تو لے تھے جو بیقرار سے گذرے

سکھا گئے مجھے زیدی رموزِ بے باکی
جو حوصلے رہِ زندان و دار سے گذرے

مطبوعاتِ جدیدہ

تجلیاتِ ربانی جلد اوّل و دوم

مرتبہ۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی تقطیع کلاں، کاغذ کتابت طباعت عمدہ مجلد مع گرد پوش صفحات جلد اوّل ۲۵۲ و جلد دوم ۱۹۲ قیمت اول تیرہ روپے پچاس پیسے دوم گیارہ روپے پچاس پیسے

ناشر۔ کتب خانہ الفرقان ۳۱، نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات تصوف کی اہم اور مقبول کتابوں میں ہیں، ان کی اہمیت اور افادیت کی بنا پر ان کے اردو ترجمے کے کئی ایڈیشن چھپے ہیں، لیکن وہ دین و شریعت کے اہم حقائق اور تصوف و احسان کے دقیق مسائل پر مشتمل ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہیں، ان کو سمجھنے کے لیے تصوف کے علاوہ مجدد صاحب کے دور اور اکبری و جہانگیری عہد کے واقعات سے واقفیت بھی ضروری ہے، اس لیے مکتوبات کی دقیق بحثوں کو نظر انداز کرکے سادہ اور آسان مباحث کی تلخیص اور اس کا سلیس و عام فہم اردو ترجمہ شائع کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ عام لوگ بھی دین و معرفت کے اس گنج گرانمایہ سے مستفید ہوسکیں، اس غرض سے پہلے بھی مکتوبات کے بعض خلاصے مرتب کیے گئے تھے، زیر نظر ترجمہ و تلخیص مولانا نسیم احمد فریدی نے اس عہد کے مذاق کے مطابق بہت شوق اور بڑے سلیقے سے انجام دیا ہے، وہ بادۂ عرفاں کے لذت شناس بزرگانِ دین کے عقیدت مند اور حضرت مجدد صاحبؒ کے پرستار ہیں، ان کے قلم سے مجدد صاحب کے علاوہ دوسرے

بھی بزرگوں کے ملفوظات و مکتوبات کی تلخیص و ترجمہ بھی ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں برابر شایع ہوتے رہے ہیں، اب انھوں نے مجدد صاحب کے مکتوبات کی تلخیص مع اردو ترجمہ کتابی صورت میں دو جلدوں میں شائع کی ہے، مکتوبات تین دفتروں پر مشتمل ہیں، پہلی جلد میں دفتر اول کے اور دوسری میں دوم و سوم کے مکتوبات کا ترجمہ و تلخیص درج ہے، اکثر مکتوب الیہم کے مختصر اور ضروری حالات بھی حاشیے میں دیدیئے ہیں اور شروع میں ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے اس میں مجدد صاحبؒ کے مختصر سوانح، مکتوبات کی عظمت و اہمیت اور ان کے بارہ میں اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس ضمن میں زمانۂ حال کے ایک مصنف اطہر عباس صاحب کی ہرزہ سرائی کا خاص طور پر ذکر ہے، ان کی انگریزی کتاب جس زمانہ میں شایع ہوئی تھی اسی زمانہ میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب اڈیٹر معارف اور جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری نے معارف میں اس کا مفصل و مدلل جواب لکھا تھا، مقدمہ نگار نے سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے جواب کا خلاصہ تحریر کرکے مجدد صاحب کے بارہ میں اطہر عباس کے رکیک اعتراضات کی حقیقت پوری طرح ظاہر کردی ہے، مجدد صاحبؒ کے مکتوبات کی اس تلخیص میں توحید خالص، اقامت دین، اتباع شریعت، احیائے سنت اور جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت اور تحریف دین اور بدعات سے اجتناب کی تلقین کی گئی ہے، اس لیے ان کے اندر مسلمانوں کی رہنمائی کا بڑا سامان ہے، اور ان سے حضرت مجدد صاحبؒ کی ایمانی حمیت، دینی غیرت اور مجاہدانہ کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

وفیاتِ ماجدی یا نثری مرثیے۔ مرتبہ حکیم مولوی عبدالقوی صاحب دریابادی، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۲۴ مجلد مع گردپوش قیمت ۱۵ روپیے

پتہ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اکاڈمی، ہیڈ آفس صدق کچہری روڈ لکھنؤ۔

یہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی ماتمی تحریروں کا انتخاب ہے، جو پہلے ان کے
بار سچ، صدق اور صدق جدید میں شایع ہوئی تھیں، اس میں علم وفضل، سیاست وصحافت
ب وحکمت وغیرہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ۲۲۰ اشخاص پر تعزیتی مضامین وتذکرے
رج ہیں، شروع میں مولانا نے اپنی ماں، بھائی، بہن، بیوی اور چند دوسرے اعزہ کا ماتم کیا ہے
ر علماء وفضلاء پر تعزیتی مقالے ہیں اس حصہ کے اہم نام یہ ہیں:۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں
شروانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا عبدالماجد بدایونی،
مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور رفضل العلماً
ڈاکٹر عبدالحق کرنولی، تیسرا حصہ لیڈروں کے ماتم پر مشتمل ہے، اس میں گاندھی جی، مولانا
شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، جواہر لال نہرو، راجہ صاحب
محمود آباد، رفیع احمد قدوائی، تصدق احمد خان شروانی، عبدالمجید خواجہ، بہادر یار جنگ،
شعیب قریشی، ڈاکٹر ذاکر حسین، چودھری خلیق الزماں، ڈاکٹر سمپورنانند اور سر سکندر حیات
کے متعلق تاثرات ہیں، چوتھا حصہ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے لیے اور پانچواں
ڈاکٹروں اور طبیبوں کے لیے مخصوص ہے، کتاب کے آخری حصہ میں متفرق اشخاص کا ماتم
کیا گیا ہے، جن میں سید صدیق حسن اور مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے نام
قابل ذکر ہیں، گو اکثر مضامین مختصر اور بعض محض چند سطری ہیں، لیکن
ان میں مولانا کے سحر طراز قلم نے مرحومین کی سیرت وشخصیت اور کمالات
وخصوصیات کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے، ہر مضمون مولانا کے ادب
وانشا کی خصوصیات سے معمور ہے، اس میں زبان وبیان کا لطف
محاوروں کا برمحل استعمال، لطافت وظرافت اور ادبی صنائع وبدائع

کئی بزرگوں کے ملفوظات ومکتوبات کی تلخیص وترجمہ بھی ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں برابر شایع ہوتے رہے ہیں، اب انھوں نے مجدد صاحب کے مکتوبات کی تلخیص مع اردو ترجمہ کتابی صورت میں دو جلدوں میں شائع کی ہے، مکتوبات تین دفتروں پر مشتمل ہیں، پہلی جلد میں دفتر اول کے اور دوسری میں دوم وسوم کے مکتوبات کا ترجمہ وتلخیص درج ہے، اکثر مکتوب الیہم کے مختصر اور ضروری حالات بھی حاشیے میں دیدیئے ہیں اور شروع میں ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے، اس میں مجدد صاحبؒ کے مختصر سوانح، مکتوبات کی عظمت واہمیت اور ان کے بارہ میں اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس ضمن میں زمانۂ حال کے ایک مصنف اطہر عباس صاحب کی ہرزہ سرائی کا خاص طور پر ذکر ہے، ان کی انگریزی کتاب جس زمانہ میں شایع ہوئی تھی اسی زمانہ میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب اڈیٹر معارف اور جناب شبیر احمد خان صاحب غوری نے معارف میں اس کا مفصل ومدلل جواب لکھا تھا، مقدمہ نگار نے سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے جواب کا خلاصہ تحریر کرکے مجدد صاحب کے بارہ میں اطہر عباس کے رکیک اعتراضات کی حقیقت پوری طرح ظاہر کردی ہے، مجدد صاحبؒ کے مکتوبات کی اس تلخیص میں توحید خالص، اقامت دین، اتباع شریعت، احیائے سنت اور جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت اور تحریف دین اور بدعات سے اجتناب کی تلقین کی گئی ہے، اس لیے ان کے اندر مسلمانوں کی رہنمائی کا بڑا سامان ہے، اور ان سے حضرت مجدد صاحبؒ کی ایمانی حمیت، دینی غیرت اور مجاہدانہ کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

وفیاتِ ماجدی یا نثری مرثیے۔ مرتبہ حکیم مولوی عبدالقوی صاحب دریابادی، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۴۴ مجلد مع گردپوش قیمت ۱۵ روپے پتہ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اکاڈمی، ہیڈ آفس ۵۴ کچہری روڈ لکھنؤ۔

یہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی ماتمی تحریروں کا انتخاب ہے، جو پہلے ان کے اخبار سچ، صدق اور صدق جدید میں شایع ہوئی تھیں، اس میں علم و فضل، سیاست و صحافت، طب و حکمت وغیرہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ۲۰۰ اشخاص پر تعزیتی مضامین و تذکرے درج ہیں، شروع میں مولانا نے اپنی ماں، بھائی، بہن، بیوی اور چند دوسرے اعزہ کا ماتم کیا ہے، پھر علماء و فضلا پر تعزیتی مقالے ہیں اس حصہ کے اہم نام یہ ہیں:۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالرحمن نگرامی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور شمس العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی، تیسرا حصہ لیڈروں کے ماتم پر مشتمل ہے، اس میں گاندھی جی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، جواہر لال نہرو، راجہ صاحب محمود آباد، رفیع احمد قدوائی، تصدق احمد خان شروانی، عبدالمجید خواجہ، بہادر یار جنگ، شعیب قریشی، ڈاکٹر ذاکر حسین، چودھری خلیق الزماں، ڈاکٹر سمپورنانند اور سر سکندر حیات کے متعلق تاثرات ہیں، چوتھا حصہ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے لیے اور پانچواں ڈاکٹروں اور طبیبوں کے لیے مخصوص ہے، کتاب کے آخری حصہ میں متفرق اشخاص کا ماتم کیا گیا ہے، جن میں سید صدیق حسن اور مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے نام قابل ذکر ہیں، گو اکثر مضامین مختصر اور بعض محض چند سطری ہیں، لیکن ان میں مولانا کے سحر طراز قلم نے مرحومین کی سیرت و شخصیت اور کمالات و خصوصیات کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے، ہر مضمون مولانا کے ادب و انشا کی خصوصیات سے معمور ہے، اس میں زبان و بیان کا لطف محاوروں کا برمحل استعمال، لطافت و ظرافت اور ادبی صنائع و بدائع

پوری طرح موجود ہیں، مگر کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔

اقبال کے ممدوح علماء، مرتبہ جناب قاضی افضل حق قرشی تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۴۴ مجلد قیمت ۱۵ روپیہ پتہ: مکتبہ محمودیہ، کریم پارک راوی روڈ، لاہور۔

اس کتاب میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے ممدوح و محبوب علما کا ذکر ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ لائق مرتب اور دوسرے اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں ڈاکٹر صاحب کے ان کے معاصرین سے مخلصانہ تعلقات دکھائے گئے ہیں، شروع کے مضمون میں ان کے استاد مولانا سید میر حسن سے ان کی عقیدت و محبت کا ذکر ہے، دوسرے مضامین میں مولانا انور شاہ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے اقبال کے روابط و تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اقبال اور مولانا سید سلیمان ندوی سے متعلق موجودہ ناظم دار المصنفین جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کا مضمون بہت سیر حاصل ہے، یہ چٹان کے اقبال نمبر کے لیے لکھا گیا تھا، اور بعد میں معارف میں بھی چھپا تھا، اس حصہ میں ایک غیر متعلق مضمون بھی ہے لیکن وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، اس میں ڈاکٹر صاحب کے ان اشعار و خیالات پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، جن سے انھوں نے رجوع کر لیا تھا یا رجوع نہ کرنے کے باوجود فتنہ و انتشار کے خوف سے ان کو اپنی کتابوں سے خارج کر دیا تھا، جیسے مثنوی اسرار خودی کے حافظ سے متعلق اشعار، دوسرے حصہ میں قدیم و جدید اکابر علما کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے تعریف و تحسین پر مشتمل اقوال و تاثرات درج ہیں، اس میں سابق الذکر معاصرین کے علاوہ حسب ذیل حضرات کے نام قابل ذکر ہیں، علامہ ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، مولانا شاہ اسماعیل شہید، جمال الدین افغانی، مولانا عبد اللہ غزنوی، مولانا شبلی، مولانا محمد علی، شاہ سلیمان پھلواروی وغیرہ اس حصہ میں مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا محمود الحسن اور مولانا اشرف علی کی نسبت ڈاکٹر صاحب کے جو اقوال درج ہیں وہ بے محل ہیں اور ان سے ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں ان حضرات کی عظمت ظاہر نہیں ہوتی، دیباچہ میں

اقبال کے مکفرین کا ذکر ہے اس میں بریلوی مسلک کے علما کا تلخ لہجہ میں ذکر ہے، ان حضرات کی شکایت لاحاصل ہے۔

آذری: ترجمہ جناب کبیر احمد صاحب جائسی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۰۴، مجلد، قیمت ۱۲/ ر پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر نئی دہلی

یہ کتاب آذر بائجان کی قدیم زبان آذری کے متعلق معلومات کا مجموعہ ہے، اس کے مصنف احمد کسروی ایران کے مشہور اہل قلم ہیں، انھوں نے پہلے آذر بائجان کی مختصر تاریخ، وہاں کے قدیم باشندوں اور ان کی بولیوں کا حال بیان کر کے دکھایا ہے کہ یہ کبھی ترکی کے زیر اثر نہیں رہا بلکہ ہمیشہ ایران کا صوبہ رہا، مصنف نے آذر بائجان کے دریاؤں، پہاڑوں اور شہروں کی تفصیل بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ عربوں کے حملہ کے وقت یہاں کی زبان آذری تھی، پھر سلجوقیوں، منگولوں، تیموریوں اور صفویوں کے ایران پر قبضہ و تسلط کا ذکر کر کے آذر بائجان کی عام بول چال ترکی ہونے کے اسباب بتائے ہیں، اس ضمن میں زبانوں کے وجود میں آنے کے بعض وجوہ پر بھی بحث کی ہے، آخر میں آذری کا جو قدیم سرمایہ محفوظ رہ گیا ہے اس کے اور موجودہ زمانہ کی آذری کے نمونے دے کر اس کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، کتاب محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے، اس طرح کی خشک کتاب کا ترجمہ مشکل ہوتا ہے، مگر کبیر احمد جائسی صاحب نے اس کا سلیس و رواں اردو ترجمہ کر کے اپنے کامیاب مترجم ہونے کا ثبوت دیا ہے، ابتدا میں ان کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں کتاب کے مندرجات کی وضاحت کی گئی ہے، امید کہ علمی حلقہ میں یہ کتاب مقبول ہوگی۔

دعائے صباح : مرتبہ جناب کالی داس گپتا رضا، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۴۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵ روپے
پتہ :- ناشر، ٹی پبلکیشنز، ۱۰۷ اجولی بھون نمبر ا نیو مرین لائن چرچ گیٹ، بمبئی ۲۰۰۰۲۰

مسلمانوں کے فرقہ شیعہ میں دعائے صباح کو بڑی اہمیت ومقبولیت حاصل ہے یہ حضرت علیؓ سے منسوب ایک مشہور دعا ہے، مرزا غالب مرحوم نے اس کا منظوم فارسی ترجمہ کیا تھا جو ان کی زندگی میں ان کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے ایما سے نول کشور نے پہلی دفعہ شائع کیا تھا، یہ اڈیشن اب نادر وکمیاب تھا، مگر حسن اتفاق سے غالب کے پرستار اور اردو کے معروف ادیب وشاعر جناب کالی داس گپتا رضا کے کتب خانہ کے غالب کلکشن میں پایا گیا، اسی کو انھوں نے اپنے مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اس اڈیشن میں غالب کے منظوم فارسی ترجمہ کے ساتھ دعائے صباح کا عربی متن اور فارسی میں ایک نثری ترجمہ بھی شامل تھا، یہ سب من وعن زیر تبصرہ کتاب میں بھی آ گئے ہیں، مقدمہ میں دعائے صباح کی اہمیت، غالب کے منظوم ترجمہ کی مختلف اشاعتوں اور اس کے متعلق دوسری ضروری باتوں کے علاوہ اس کی بعض خامیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، جو گپتا صاحب کے خیال میں غالب کے عہد جوانی سے پہلے کی تصنیف ہونے کا نتیجہ ہیں، ان کے خیال میں فارسی کا نثری ترجمہ غالب کے علاوہ کسی اور کا ہے، مگر انھوں نے اس پر کوئی سیر حاصل بحث نہیں کی ہے۔ ”ض“

......>>ختم<<......

دارالمصنفین کی تین نئی کتابیں

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

دارالمصنفین کا سلسلۂ تاریخ ہند دس کتابوں پر مشتمل ہے، اسی کے تحت عہد بعد کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کے کئی حصے ہوں گے، حصہ اول میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، انسان دوستی، مردم پروری کی تفصیل مستند علمی و تاریخی ماخذ کے حوالہ سے پیش کی گئی ہے، اس کے بعد کے حصوں میں دوسرے مسلمان فرمانروا خاندانوں خصوصاً مغل فرمانرواؤں جن کا عہد حکومت سب سے طویل رہا ہے اُن کی مذہبی رواداری، انسان دوستی اور آدم نوازی کی تفصیل پیش کی جائے گی، قیمت ... (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن)

تبع تابعین حصہ دوم

یہ سلسلہ تبع تابعین دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں امام ابو حنیفہ کے تین جلیل القدر تلامذہ کے علاوہ اور دوسرے مشہور تبع تابعین کے سوانح اور اُن کی علمی و دینی خدمات کی تفصیل ہے، اور حصہ دوم میں امام مالک، امام شافعی، امام حمیدی، قاضی شریک نخعی، امام کاظم، امام یحییٰ مصمودی، اور امام عبدالرزاق کے علاوہ اور دوسرے اہم صاحب تصنیف اور صاحب دعوت تبع تابعین کے حالات لکھے ہیں،

مرتبہ محمد نعیم صدیقی ندوی رفیق دارالمصنفین،

قیمت ۱/-

مرزا مظہر جانجاناں

(اور اُن کا اردو کلام)

مرزا مظہر جانجاناں اردو و فارسی کے ایک صاحب کمال صوفی شاعر ہیں، اس کتاب میں اُن ہی کے سوانح و حالات، اور اُن کا تمام اردو کلام پیش کیا گیا ہے، شروع میں سید صباح الدین عبدالرحمن ناظم دارالمصنفین کے قلم سے پیش لفظ اور جناب سید شہاب الدین دسنوی کے قلم سے مصنف کے مختصر حالات ہیں،

مرتبہ عبدالرزاق قریشی اعظمی،

قیمت ۱/- ۱۲-۰-

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

جن حالات میں حضور کے عہد مبارک سے ہر دور میں احادیث نبوی کی تحصیل و سماعت کا سلسلہ برابر جاری رہا یہ احادیث عرب و عجم کے کسی گوشہ میں نہیں پہنچیں، دنیائے اسلام میں کوئی بڑی سے بڑی ہستی نہیں، محدثین کرام کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے کہ ان حضرات نے ایسے زمانہ میں جب کہ آج کل کی طرح سفر کی سہولتیں، طبع و اور نشر و اشاعت کے اتنے وسیع ذرائع و وسائل موجود نہ تھے، دنیائے اسلام کا ایک ایک چپہ چھان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور ارشادات کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع کیا، اُن کے مجموعے مرتب کئے، سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے متعدد سلسلوں کے مکمل ہونے کے بعد حضرت سید صاحب علیہ الرحمۃ کو ان محدثین کرام کے حالات مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، امام بخاری پر ایک مضمون، اور صاحب موطا امام مالک کی سوانح عمری وہ خود بھی لکھ چکے تھے، یہ کام اُن کی وفات کے بعد یہاں کے رفیق مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد کیا گیا، جس کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، اور دو حصے اور شائع ہوں گے، ان میں سے ایک حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات پر مشتمل ہوگا، اور یہ حصہ زیر ترتیب بھی ہے،

حصہ اول میں امام مالک اور ائمہ صحاح کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً عبدالرزاق، امام حمیدی، امام احمد بن حنبل، امام طحاوی وغیرہ کے حالات و سوانح اور فن حدیث سے متعلق اُن کی شاندار خدمات کو مستند حوالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، حصہ دوم میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات و سوانح اور اُن کی حدیثی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے تیسرے حصہ میں آٹھویں صدی ہجری کے بقیہ حصہ کے بعد کے تمام قابل ذکر محدثین کے حالات ہوں گے، مرتبہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی

قیمت حصہ اول:- ۵۰-۱۳ــ قیمت حصہ دوم:- ۵۰-۱۳ "منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ — اکتوبر ۱۹۷۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

جلد ۱۲۴ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۹ء عدد ۴

مضامین

شذرات

۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات سے یہ برصغیر ہی نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا بھی ایک ممتاز متکلم، ایک مضطرب مفکر، ایک دیدہ ور مفسر، ایک بے چین شارح دین، ایک قابلِ قدر ترجمانِ شریعت اور ایک بلند پایہ مصنف سے محروم ہوگئی،

انھوں نے ۷۷ برس کی عمر پائی، ان گنت کتابوں کے مصنف ہوئے، شروع میں اُن کی تحریریں نکلیں تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو محسوس ہونے لگا کہ ان میں وہ ساری باتیں ہیں جن کی تلاش اُن کے ذہن کو ہے، جب وہ مغربی افکار کے ابلیس کی تلبیس سے دب کر اپنے تذبذب اور تشکیک کی بنا پر اسلام کو جامد اور غیر متحرک پا رہا تھا تو اُس کو مولانا مودودی کی تحریروں کے ذریعہ سے یہ احساس ہوا کہ کوئی اس کے تاریک اور منجمد ذہن پر تلہ بول کر اس کو جھنجھوڑ رہا ہے، مولانا مودودی کی تحریروں میں شگفتگی بھی ہوتی، دلنشینی بھی، حرارتِ ایمانی کی گرمی بھی، نظر و فکر کی گرمجوشی بھی، منطقی دلائل کے یقین کی پختگی بھی، عالمانہ انداز میں کلام پاک اور حدیث کی جاندار تعبیر بھی، اسلام کے نا قدوں خصوصاً فرنگی معترضوں کے خلاف جارحانہ حملے بھی، اور یورپی طرزِ فکر کو جرأت مندانہ تحدی بھی، اسلئے ذوق و شوق سے پڑھی گئیں، ان کا علم ایک بحرِ زخار تھا جس سے انھوں نے بقول استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی ملحدانہ افکار کے خلاف ایک بند باندھنے کی کوشش کی، اس میں اُن کے قلم کی بے مثال قوت اُن کا پورا ساتھ دیتی رہی، رفتہ رفتہ وہ ایک خاص مکتبِ فکر اور تحریک کے بانی قرار پائے جس سے صالح قیادت کے ذریعہ مسلمانوں کی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں طاقتور دینی روح، دینی اخلاص اور دینی قدریں پیدا کرنا چاہتے تھے، یہ تحریک اس برصغیر میں جماعت اسلامی کی تنظیموں سے مسلمانوں کے ایک اچھے خاصے طبقہ پر اثر انداز ہوئی،

اُن کی مقبولیت بڑھی تو بعض حلقوں میں اُن سے اختلاف بھی پیدا ہوتا گیا، انھوں نے تصورِ دین کے سلسلہ میں اِلٰہ، رب، دین اور عبادت کے قرآنی کلمات اور اسلامی اصطلاحات کی جو تشریح کی یا تصوف کو تعطل اور بطالت کا جو دوسرا نام قرار دیا، یا نسلی اور اصلی مسلمان کی جو تفریق بتائی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا، یا اور دوسرے صحابۂ کرام کی شان میں جو الفاظ استعمال کئے، یا امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں جو یہ لکھا کہ اُن کی فقہ میں بکثرت ایسے مسائل ہیں جو مرسل، معضل اور منقطع حدیثوں پر مبنی ہیں، یا معیارِ حق کی جو تصریح کی الخ، الخ تو اُن کے اور اُن کے حامیوں کے کلامی افکار و نظریات پر بہت ہی تلخ بحث چھڑ گئی،

حکومتِ الٰہیہ کے تخیل کے ساتھ مولانائے مرحوم نے پاکستان کی عملی سیاست میں حصہ لیا تو اُن کو دار کے تختہ تک پہنچانے کی کوشش کی گئی، خود ہندوستان کے اندر اُن کے حامیوں سے حکومت کچھ ایسی مشکوک ہوتی چلی گئی کہ بات بات پر اُن کو جیل جا کر ابتلا و آزمایش سے دوچار ہونا پڑا، مگر مولانائے مرحوم نے اپنے یقینِ محکم، عمل پیہم اور عزم راسخ کا وہی ثبوت دیا جو اسلام کے بڑے بڑے مصلحین نے دیا ہے، انھوں نے اپنے معتقدوں میں بھی استقامت کی ایسی روح پھونکی کہ وہ بھی ہر امتحان میں پورے اترے،

ہر نئی دعوت کے داعی اور اس کے حامیوں کو ہر طرح کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت کے صبر آزما مرحلوں سے ہمارے مصلحین اور مجاہدین درس لیتے رہے ہیں، یہ صحیح ہے کہ اسلامی تحریک شاید ہی کوئی ایسی ہو جس کی مخالفت کسی نہ کسی طرح نہ کی گئی ہو، مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ایسی ہر تحریک میں کچھ نہ کچھ نظری، فکری اور عملی خامیاں اور کمزوریاں بھی ضرور رہی ہیں، جن سے مخالفت کا موقع ملتا رہا، جن اسباب کی بنا پر اُن کی مخالفت ہوئی، ان کا گہرا تجزیہ کرنے کے بعد بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے، آخر ہم گذشتہ چودہ سو سال کی تاریخ کے اپنے عروج و زوال دونوں کے عواقب سے کب بصیرت اور عبرت حاصل کریں گے، موجودہ دور کے مسلمانوں کو بھی اپنے معاشرہ میں مذہبی، معاشرتی اور سیاسی انحطاط و ادبار کا سامنا ہے، وہ بے چینی سے متوقع ہیں کہ اس کو دور کرنے کے لئے اُن کے مفکرین اپنی اسلامی

نظر و فکر سے کچھ ایسی قابل عمل چیزیں پیش کریں جو متنازعہ فیہ ہونے کے بجائے متفق علیہ ہوں، یا کم از کم اس حد تک قابل قبول ہوں کہ اُن کے خلاف کفر و ضلالت کا فتویٰ صادر نہ کیا جائے کیا یہ ممکن نہیں ؟ اگر ناممکن ہے تو سارے مسلمان اپنے خیالات کی ریت میں اپنے ذہن کو یہ سوچ کر چھپا لیں کہ انسانی تاریخ میں آج تک کوئی ایسی تحریک نہیں چلی جس کی مخالفت نہ ہوئی ہو، مگر یہ اسلامی طرز فکر نہیں، ہر اسلامی تحریک کے درد مند اور مخلص محرک کو یہ سوچنا ضروری ہے کہ اس سے مسلمانوں کی یکجہتی اور یگانگت میں خلل پڑنے کا ذرا بھی احتمال ہو تو وہ اس تحریک کی خامیوں کو یا تو دور کرے یا اس سے دست بردار ہو جائے، ایک اسلامی قائد کی شان یہ ہے کہ اس کی کسی بات سے کسی مسلمان کے تلوے میں چبھن محسوس ہو تو وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس کرے،

اس قسم کی بحث ہوتی رہے گی مگر اب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی وہاں ہیں جہاں ان سے پہلے اسلام کے بڑے بڑے مفکرین جا چکے ہیں، وہ اپنے پیچھے اپنی نظر و فکر کا ایک خزانہ چھوڑ گئے، مگر اپنے ساتھ اسلام کی وہ شیریں دیوانگی لے گئے ہیں، جس میں وہ زندگی بھر مبتلا رہے، اُن کی تحریروں میں کہیں کہیں اسلام کی جو پسی ہوئی بجلیاں اور بکھری ہوئی تجلیاں ہیں وہ انکے آخری سفر کی زاد راہ ہیں وہ مضطرب اور بے قرار گھڑیاں جو انھوں نے اپنے مطمح نظر سے احیاے دین کی خاطر اپنی زندگی میں گذاریں، کیا عجب کہ عالم بالا میں رحمتِ الٰہی کے موتیوں کی لڑیاں بن جائیں، اُن کا جنازہ دھوم سے اٹھا، بے شمار لوگوں نے اُن کے جنازہ کی نماز پڑھی، علما، صلحاء، اتقیاء اور اصفیاء نے اُن کا ماتم کیا، دعا ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں بھی اُن کو یہی حسنِ قبول عطا ہو، آمین ثم آمین، اللّٰھُمّ اغفر لہ وارحمہ،

……٭٭٭……

مقالات

مطالعہ ملفوظات خواجگانِ چشت کے مبادیات
(خواجگانِ چشت کے ملفوظات کی روشنی میں)

از مولانا اخلاق حسین دہلوی بستی نظام الدین دہلی

(۳)

یہ بحث ذرا طویل ہو رہی ہے لیکن یہ موضوع کچھ ایسا اہم ہے کہ بعض تنقید نگاروں کی بیجا تنقیدوں سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر پہلو سے اس کا جائزہ لیا جائے، ناظرین سے اس بحث کی طوالت کے لئے معذرت خواہ ہیں،

خوارق عادات انسان اگر غور و فکر سے کام لے تو یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی کہ دنیا کی ہر شے عجائبات کا مرقع ہے، بلکہ وہ خود عجائبات کا مجموعہ ہے، بہر حال ایسے واقعات جو عام حالات سے مختلف، حیرت انگیز، عقل و فہم سے بالاتر ہوتے اور گاہ بگاہ ظہور میں آتے ہیں انھیں خوارق عادات سے تعبیر کیا جاتا ہے، اُن کی ایجاد پر جارج اسٹفنسن کے خلاف مذہبی پیشواؤں نے جو فتوے دیئے تھے، تاریخ آج بھی انھیں دہرا رہی ہے، بجلی، ٹیلیفون، وائرلیس، ریڈیو، ٹیلی ویژن سب ہی حیرت انگیز ہیں لیکن رواج عام نے اُن کی حیرت

واستعجاب کو زائل کر دیا ہے، اور وہ تمدن کا لازمہ بن گئے ہیں، اور روزمرہ کی چیزوں میں شمار ہونے لگے ہیں، ورنہ غیر شائستہ اذہان نے کیا کیا کچھ نہیں کیا ہے،

اسلامی اذہان نے خوارقِ عادات کی تین نوعیتیں قرار دی ہیں (۱) جو محیر العقول واقعات انبیاء علیہم السلام سے صادر ہوتے ہیں، انھیں معجزہ کہتے ہیں (۲) جو مافوق الفطرت امور ارادۃً یا بلا ارادہ، اولیاء اللہ سے ظہور میں آتے ہیں، انھیں کرامت سے تعبیر کرتے ہیں (۳) اور جو ان اشخاص سے ظہور میں آتے ہیں جو کسی مذہب سے رابطہ رکھتے ہی نہیں یا برائے نام رکھتے ہیں یا جن پر بے دین ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہے، اسے استدراج کہتے ہیں حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے،

آنچہ درو عقل را گنجایش نباشد	جس میں عقل کو دخل نہیں
آن کرامت است،	وہ کرامت ہے،

(فوائد الفواد ص ۷)

یہ اسی روایت سے متعلق ہے، جو لفظی اختلاف کے ساتھ فوائد السالکین (ص ۱۲) میں ہے لفظی اختلاف کی امثلہ علم جلیس سے آگاہی کے زیر عنوان گذر چکی ہیں، اس روایت سے متعلق اردو میں عہدِ حاضر کے ایک تنقید نگار نے لکھا ہے:

"ایسے واقعات کی بھرمار ہے، جو چشتی صوفیہ کے عقائد اور تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں، فوق العادۃ عنصر کی بھی کمی نہیں، اور خوارق کے بیان میں مبالغہ ہے"

(منادی دہلی ص ۸۶، بابا فرید نمبر جلد ۹۴ شمارہ ۳-۴-۵-۶، ۱۹۷۴ء)

کیا تنقید نگار کو چشتی صوفیہ کے عقائد اور تعلیمات سے آگاہی کے باب میں حضرت

محبوب الٰہیؒ پر فوقیت ہے، جو کمالِ علم و عمل کے باوجود اس سے آگاہ نہ تھے کہ یہ روایت چشتی صوفیہ کے عقائد اور تعلیمات کے سراسر خلاف ہے حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے،

سلوک را صد مرتبہ نہادہ اند	سلوک کے لئے سو درجات رکھے ہیں
مرتبہ کشف و کرامت است، اگر	سترہواں درجہ کرامت کا ہے اگر
سالک ہمدریں مرتبہ باز ماند	سالک اسی درجہ میں رہ گیا تو وہ بقیہ
وبہ دیگرے کے برسد،	تراسیؔ درجات کو کیسے پہنچے گا،

(فوائد الفواد ص ۱۷۱)

بیان کا اسلوب منہ سے پڑا بول رہا ہے کہ جب تک مدارج سلوک کی تکمیل نہ ہو جائے، اظہار کشف و کرامت میں محتاط رہنا چاہئے، البتہ تکمیل کے بعد ضرورۃً وارادۃً کشف و کرامت سے کام لیا جا سکتا ہے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کا ارشاد ہے، :

چوں صد مرتبہ ہم طے کند، آں	جب سواں مرتبہ بھی طے کرلے
گاہ ہرچہ خواہد کشف کند....	پھر جو چاہے ظاہر کرے......
... مرد کامل آنست کہ خود را تا	......، مرد کامل وہی ہے جو اس
آں زماں کشف نہ کند، تا تمام	وقت تک اپنے کو ظاہر نہ کرے جب
حاصل نہ کند،	تک تکمیل نہ کرلے،

(فوائد السالکین ص ۲۰)

فوائد الفواد ہو یا دیگر مجموعۂ ملفوظات ان سب میں ان ہی بزرگوں کی کرامات کا ذکر ہے، جو درجۂ کمال کو پہنچ چکے تھے؛ اور اگرچہ فوائد الفواد میں بھی خوارق عادات اور کرامات کا ذکر ہے، اور بکثرت ہے لیکن اسرار الاولیا، اور راحت القلوب کے جامعین کو منصب

سجادگی تفویض ہونا تھا اسلئے اُن کی ترتیب میں منصب کی رعایت کو بھی دخل ہے، اس اعتبار سے ان تینوں کتابوں میں وہ امتیاز ہے جو ہو سکتا ہے،

تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ وسطیٰ میں ہندوستانی اذہان جوگیوں اور سنیاسیوں کے دامِ فریب میں پھنسے ہوئے تھے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے عہدِ شیخوخت میں وہ کیفیت نہیں رہی تھی، اس لئے جو کچھ ان دونوں حضرات کی تربیت کے لئے درکار تھا، وہ ہرگز کسی اعتبار سے بھی خواجہ امیر حسن علا سجزی کی تربیت کے لئے نہ تو درکار تھا، اور نہ ہو سکتا تھا، فوائد الفواد میں وہ کچھ تلاش کرنا جو اسرار الاولیاء اور راحت القلوب میں ہے تلاش بے محل اور سعی لاحاصل ہے، بہر حال جن نفوسِ زکیہ کو اصلاحِ قوم کی خدمت تفویض کرنی ہوتی ہے، اُن کی تربیت عام تربیت سے ممیز ہوتی اور ہو سکتی ہے، حضرت امیر خسروؒ اور قاضی محی الدین کاشانیؒ کی تربیت کا امتیاز اس کی روشن دلیل ہے، لہٰذا ان نفوسِ زکیہ کو ماحول کی کیفیت سے اور منزل کے نشیب و فراز سے آگاہی بخشنا تربیت کا لازمہ ہے، اور اگرچہ ان ملفوظات میں آپ بیتی کے اُبھرتے ہوئے نقوش شاذ و نادر ہی ملتے ہیں تاہم آپ بیتی کے موثر انداز میں واقعات کو دلنشیں کرنا بھی مناسب ہوتا ہے جس سے استعداد عمل کو مہمیز ہوتی ہے، اور دل و دماغ آمادہ عمل ہو جاتے ہیں، ماحول کی کیفیات کو نظر انداز کر کے جو بھی جائزہ لیا جائے گا، غلط ہو گا، خواجہ حالی نے لکھا ہے،

"سوپر نیچرل یعنی ما فوق العادۃ باتیں اور عجیب و غریب قصے ... جن سے قدیم اور متوسط زمانے کا مغربی اور مشرقی لٹریچر بھرا ہوا ہے۔"

(حیاتِ سعدی ص ۱۲۵)

پھر ملفوظات جو عہدِ وسطیٰ ہی کا تہذیبی و روحانی سرمایہ ہے، اس میں ما فوق العادۃ عنصر کا نہ ہونا اُن کی خامی تو ہو سکتی ہے، خوبی نہیں ہو سکتی، خصوصاً اس لئے کہ ان بزرگوں کو

ان سے دو چار رہنا بھی پڑتا تھا، اور اگرچہ کتب ملفوظات ہم تک کامل صحت کے ساتھ نہیں پہنچ سکی ہیں، اور اکثر چند منتشر اوراق کا مجموعہ رہ گئی ہیں تاہم ان میں جو کچھ ہے، وہ بہت کچھ اپنے موضوع سے متعلق ہے، علمی مسائل کا بیان اور احکام کا درس متعلق ہوتا ہے روحانی نظام سے تربیت گاہوں کا نظام اپنا مقام آپ رکھتا ہے،

ع : ہر سخن محلے و ہر نکتہ مقامے دارد

صوفیائے کرام طبیب روحانی ہوتے ہیں قلوب کی نبض پر اُن کی انگلیاں اور دلوں کی تہہ میں اُن کی نظریں ہوتی ہیں، وہ جو کچھ مناسب سمجھتے ہیں، تجویز کرتے ہیں، کلام اللہ سمجھنے کے لئے اہلیت درکار ہے، جو آج عنقا ہے، پھر یہ کہنا کیا ہے:-

"اکثر بزرگوں کے فوق الفطرۃ تصرفات اور خوارق عادات کا مبالغہ آمیز بیان ہے، سب سے زیادہ شبہہ پیدا کرنے والا حصہ وہ ہے جس میں صاحب ملفوظ خود اپنی کرامت بیان کرتا ہے،"

(منادی دہلی ص ۳۴۱، جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶ ۱۹۷۴ء)

اولیاء اللہ جن کی زندگیاں اوصاف حمیدہ سے متجلی اور رذائل سے مبرا ہوتی ہیں اگر ضرورۃً شاذ و نادر آپ بیتی اُن کی زبان پر آگئی ہے، تو وہ خودستائی اور خودنمائی نہیں حالات کا اقتضا رہے، خواجہ حالی نے سو برنیچرل کی پینگ بڑھائی تھی، انھوں نے اپنے عہد کے خیالات کی وادیوں میں بھٹکنے والے شاعروں کو متنبہ کیا تھا، اور عملی زندگی کی ترجمانی کی ترغیب دی تھی، جس کی ضرورت تھی، ان کی تحریک سے اُردو شاعری نے کروٹ بدلی اور قومی و ملی باکمال شاعر منصۂ شہود پر آئے، مگر سات آٹھ سو برس قدیم صوفیانہ ادب کو ہدف ملامت بنانے کا کیا محل ہے، اور اس سے کونسی منفعت مقصود ہے،

بلا شبہ ہندوستان کے اکابرِ چشتیہ کے ملفوظات میں محیرالعقول اور ما فوق العادۃ عناصر کی آمیزش ہے، جو اس عہد کا تقاضائے امتیاز ہے، صوفیانہ ادب نہ اس سے خالی ہے، نہ ہونا چاہئے جو کچھ اس میں ہے وہ ہدایت و رشد کے روشن مینارے ہیں جن کی تابانی آج بھی جلوہ ریز ہے انھیں ہدفِ تنقید بنانا درست نہیں ہے،

عجائب الاسفار | عہدِ ماضی میں جن سیاحوں نے بری و بحری سفر کئے ہیں، اُن کے سفرنامے شاہد ہیں کہ انھیں عجائباتِ روزگار سے دوچار ہونا پڑا ہے مشہور مغربی سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے کا نام ہی عجائب الاسفار رکھا ہے، اس کی ملاقات متعدد ایسے اشخاص سے ہوئی تھی، جو حیرت انگیز شخصیتوں کے مالک تھے، اور خوارق العادۃ اُن سے ظہور میں آتے تھے، ابنِ بطوطہ اس عہد میں ہندوستان آیا تھا جب خوارق کا زور ٹوٹ چکا تھا، اور برائے نام ان کا وجود رہ گیا تھا تاہم ابنِ بطوطہ کے سفرنامہ کے اس حصہ میں جو سفر ہندوستان سے متعلق ہے، متعدد محیرالعقول واقعات ملتے ہیں، مگر اس بنا پر آج تک نہ کسی نے اس کو غیر اہم قرار دیا اور نہ جعلی بتایا،

صوفیائے کرام جو بذاتِ خود محیرالعقول اوصاف کے مالک ہوتے ہیں، اور اصلاحِ حال کے پیشِ نظر ہر رکاوٹ کو ٹھکرا دینے کا منصب رکھتے ہیں، اور انسان کو انسانیت کے وصف سے متصف کرنے میں لگے رہتے ہیں، اگر ماحول کی ضرورت سے خرقِ عادت سے کام لیتے ہیں تو اس میں کیا مضائقہ ہے، اس عہد کا لازمہ ہے جس کو عہدِ ماضی کے تمدن کا مورخ نظر انداز نہیں کرسکتا، عہدِ حاضر میں تنقیدی جائزے جو ملفوظات سے متعلق شائع ہوئے ہیں اور میرے مطالعہ میں آئے ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں، اس اجمال کی تفصیل ان مضامین میں ملے گی جو کتبِ ملفوظات میں لکھے گئے ہیں، اور لکھے جائیں گے،

کتابیات | کتب ملفوظات میں اس عہد کی متعدد کتابوں کے نام آئے ہیں، جن میں سے بہت سی اب ناپید ہیں، شمائل الاتقیاء و دلائل الانقیاء میں ماخذ کی طویل فہرست درج ہے، اس میں ایسی کتابوں اور رسالوں کے نام بھی ہیں، جو اس عہد کے اہل قلم نے شاید ہی دیکھے اور سُنے ہوں، یہ فہرست ڈیڑھ پونے دو سو کتب و رسائل کے اسماء پر مشتمل ہے، کتب ملفوظات جو ہدف تنقید ہیں، ان میں سے جس کتاب میں سب سے زیادہ تعداد ہے، وہ چونتیس ۳۴ ہے، تعجب ہے کہ تنقید نگار اس مختصر تعداد کے بارہ میں بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ

"اتنی کتابوں سے جامع نے شاید ہی استفادہ کیا ہو، ان میں سے اکثر فرضی ہیں"

(منادی دہلی ص ۲۲، بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶ ۱۹۷۴ء)

یہ دو ہی جملے ہیں جو باہم متضاد ہیں، حالانکہ جامع ملفوظات کا کام صرف ملفوظات کا جمع کرنا ہے، اس کیلئے ان کتابوں سے استفادہ ضروری نہیں جن کا ذکر ملفوظات میں آیا ہو، خواہ اس کا مطالعہ کیسا ہی وسیع کیوں نہ ہو، جن کتابوں کے نام کتب ملفوظات کی زینت ہیں، وہ فرضی نہیں واقعی ہیں جن کا مطالعہ وسیع ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں سے اکثر کے نام کتب قدیمہ میں ملتے ہیں، انکو فرضی تصور کرنا اپنی لاعلمی کا ثبوت دینا ہے،

تاریخی قدریں | کسی واقعہ کا تاریخ سے وابستہ ہونا اور تاریخی اندراج کا صحیح ہونا بلا شبہہ واقعہ کو تقویت بخشتا ہے، اہل علم انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ تاریخ میں متعدد واقعات مختلف فیہ ہوتے ہیں، اور تاریخی اندراجات بھی مختلف ہوتے ہیں، لیکن تاریخی اختلاف کی بنا پر کسی واقعہ سے اور نفس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاتا، بلکہ صحت کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے،

کتب ملفوظات میں سے اگر کسی نسخے میں واقعہ کے ساتھ سنہ اور تاریخ وغیرہ صحیح نہیں ہے تو تصحیح کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، واقعہ کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے، یہ علمی

تحقیقی نقطۂ نظر ہے، جو علمی دنیا میں مروج ہے، غلط تاریخی اندراج کی بنا پر کسی کتاب کو جعلی قرار نہیں دیا جا سکتا، اگر صحت کا نقطۂ نظر یہی قرار پائے، تو ملفوظات ہی کیا بہت بڑا علمی ذخیرہ جعلی قرار پائے گا، اس لئے اہلِ علم و اہلِ نظر اس روش پر کار فرما نہیں ہیں،

ملفوظات سے دلچسپی رکھنے والے خاص ہوں یا عام معدودے چند کے سوا تاریخی قدروں سے دلچسپی نہیں رکھتے، اُن کے دل و دماغ نفسِ واقعہ سے متاثر اور کیف اندوز ہوتے ہیں اور ہدایت کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں، انھیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کوئی واقعہ کب ہوا کس دن ہوا کس تاریخ کو ہوا کس مہینہ میں ہوا، اور کس سنہ میں پیش آیا، یہ سوال اٹھتا ہی نہیں ہے، اُن کے دل و دماغ روحِ واقعہ سے متعلق رہتے ہیں۔

بلاشبہ تاریخی صحت نہایت کارآمد اور مفید ہے، خصوصًا اُن کے لئے جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں، اصلاح کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، اور صحت مند معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں، لیکن جن کتابوں کا وجود صد[illegible] سے پایا جاتا ہے [illegible] میں اگر کسی تاریخی واقعہ میں سقم پایا جائے تو اُن کو جعلی قرار دینا صحیح نہیں، یہ بھی کوئی اصول نہیں کہ اگر کسی کتاب کا کوئی قدیم ترین نسخہ دستیاب نہ ہو سکے، یا متداول کتابوں میں اس کا ذکر نہ ملے تو اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے، اگر یہی اصول ہے تو درر نظامی کے وجود سے سب سے پہلے انکار کیا جائے گا جس کا قدیم ترین نسخہ جو دستیاب ہوا ہے، وہ قیاسًا بارھویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے اور کہیں کہیں معلومات بھی مشتبہ ہیں، جس سے یہ بھی یقین ہوتا ہے، کہ دُررِ نظامی بھی الحاق و تحریف سے محفوظ نہیں ہے، حالانکہ تنقید نگار کے نزدیک دررِ نظامی کا شمار نہایت درجہ مستند کتابوں میں ہے،

بہرحال کتب ملفوظات جو ہم تک پہنچی ہیں، وہ داخلی دلچسپی کی بدولت پہنچی ہیں،

جس میں بلا امتیاز عقیدت مندوں کی دلچسپی کو دخل ہے، علماء کی دلچسپی کے نقوش خال خال ملتے ہیں، غالباً اس لئے کہ ان میں درسِ عمل ہے، اور عالمانہ قیل و قال نام کو نہیں ہے، بہرحال ہم ان عقیدتمندوں کی دلچسپی کے مرہونِ منت ہیں، جن کی بدولت ہم اپنے قدیم روحانی اور تہذیبی سرمایہ سے فیض یاب ہیں،

ان حالات میں تاریخی قدروں کا برقرار رہنا کچھ یقینی نہیں لہٰذا ان کے درپے ہونا معقولیت سے بعید ہے، البتہ صحت کی جانب توجہ کی جاسکتی ہے، اور یہ ایک اچھی کوشش ہوگی،

ملفوظات کی مقبولیت ملفوظات میں کچھ ایسی جاذبیت اور کشش ہے، کہ گوناگوں خامیوں کے باوجود پڑھنے اور سننے والے ان سے محظوظ اور لطف اندوز ہوتے ہیں، بسا اوقات وہ عالم کیف و سرور میں کھو سے جاتے ہیں، ان کا دل وہ جگہ چاہتا ہے، جہاں نور و سرور ہی ہو، اور کچھ نہ ہو، ان سے ان کی روح کو ایسی طمانیت نصیب ہوتی ہے، جو کسی نعمت سے کم نہیں، وہ اللہ کے سوا سب کچھ بھول جاتے ہیں، انھیں اپنے حال پر ندامت ہوتی ہے، اصلاحِ حال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، انھیں ہدایت نصیب ہوتی ہے، اور نور و سرور بھی، مجھے دراصل ملفوظات ہی نے مسلمان بنایا، اور بنائے رکھا ہے، اس مادی دور میں ملفوظات کی یہ تاثیر حیرت انگیز ہے، مگر

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت محبوب الٰہیؒ کی مجلس میں بسبیل تذکرہ ایک صاحب نے بیان کیا کہ ایک صاحب تھے جو صلاحیت بھی رکھتے تھے، اور درویشوں کی خدمت بھی خوب کیا کرتے تھے ایک دن میں نے اُن سے کہا کہ آپ ہمارے حضرت سے بیعت کیوں نہیں ہوجاتے تم انھوں نے کہا

کہ ایک دن بیعت ہونے کے ارادے سے گیا تھا، مگر کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں خوان پوش ہی خوان پوش جمع ہیں، اور شمعیں روشن ہیں، یہ منظر دیکھ کر مجھ عقیدت نہیں رہی، میں چلا آیا، حضرت محبوب الٰہیؒ نے حاضرین مجلس کی طرف رُخ کیا، اور فرمایا کہ یہاں خوان اور شمعیں کب تھیں، پھر مسکرائے اور فرمایا، یہ نعمت مقدر میں نہ تھی، تو یہ کچھ دکھا دیا، (فوائد ص ۲۵)

ایک زمانہ تھا کہ عام وخاص کو ملفوظات کے پڑھنے اور سننے میں بڑا ہی شغف تھا، خواندہ اشخاص کو اپنی مشغولیت سے جب وقت ملتا، تو مطالعہ کرتے ہی تھے، خواص کے ہاں رات کو جو نشست ہوتی تھی، اس میں بھی اولیاء اللہ کا ذکر رہتا تھا، ان میں شریک ہونے والوں کے دلوں میں اللہ کی یاد تھی،

میرے بچپن میں دلی کے کارخانہ داروں کا دستور یہ تھا، کہ وہ جاڑوں کی راتوں میں مل بیٹھتے، کارخانے ہی میں جمع ہوجاتے، نوجوان ہوتے تو قصے کہانیاں ہوتیں، قصۂ چہار درویش پڑھا اور سُنا جاتا، بوڑھے بزرگ اور سن رسیدہ ہوتے تو کسی سے ملفوظات پڑھواتے، سنتے اور سنواتے، گاہ بگاہ میں بھی پکڑا میں آجاتا تھا، اگر پڑھنے والا نہ ملتا تو کوئی بزرگ خود بیان کرتے، سنتے سنتے انھیں بھی واقعات ازبر ہوتے تھے، مزے لے لے کے خوب سناتے تھے، کوئی شوخ کہہ بھی بیٹھتا انا، د تو اچھے خاصے مولوی ہیں، وعظ بھی کہیں تو جچ جائے، پھر ان کا روز دنیا سے دم بھر کے لئے چھٹکارا مل جاتا، اور انھیں ایسا لگتا کہ وہ نور کی دنیا میں آبسے ہیں، بیساختہ کہہ اٹھتے ؎

نور کی دنیا میں اب بستے ہیں ہم دل کے ہاتوں منزلت پائی بہت

یہ ذوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ان پڑھ بھی اچھے خوشنویسوں سے ملفوظات نقل کراتے سنہری روپہلی جدولیں بنواتے، خوشنما چرمی جلدیں بنواتے، ان پر بھی رنگ برنگی گلکاری کراتے،

جزدانوں میں رکھتے، اور بڑے احترام سے رکھتے اور نکالتے تھے، لوبان کی دھونی دیتے، کوئی نامی گرامی عالم یا ایسا ہی کوئی پڑھا لکھا آنکلتا تو اسے اپنے گھر یا اپنے کارخانے میں لیجاتے، عزت سے بٹھاتے، آؤ بھگت کرتے، اور بڑے فخر سے وہ مجموعۂ ملفوظات اسے دکھاتے، جب وہ حروف کی نوک پلک کشش و دوائر کی تعریف کرتے تو مجھے حیرت ہوتی، یہ تو ان پڑھ ہیں، میں ہی نہیں جانتا انھیں آگاہی کیسے ہوئی، میں دیکھتا، اور غور سے دیکھتا اور سنتا، کہ کس کس کی کیا تعریف کر رہے ہیں، حیران رہ جاتا، بول کیا سکتا تھا، ان آنکھوں نے ایسے ایسے خوش عقیدہ دیکھے ہیں جن کی یاد سے آج بھی روح میں اہتزاز پیدا ہوتا اور جی بھر آتا ہے، اللہ پاک اُن کی مغفرت فرمائیں، اور اُن کے صدقے میں ہماری بھی،

والد مرحوم کا معمول والد مرحوم حضرت سید محمد ابراہیم حسنی حسینی نہ تو سجادہ نشین تھے، نہ کسی درگاہ کے خادم و مجاور، اُن کا تعلق محنت کش طبقہ سے تھا، البتہ صاحبِ ذوق اور صاحبِ نسبت تھے، مجاز بھی تھے، مگر پیری و مریدی پیشہ نہ تھا، علماء، صوفیہ، اور شرفاء غرض کہ عوام و خواص سب ہی سے میل جول تھا،

ع: دل بیار و دست بکار

پر عمل تھا، ان کا معمول یہ تھا کہ وہ رمضان المبارک میں روزہ مردانہ میں افطار کیا کرتے تھے، عصر کے بعد سے معمولاً ملفوظات کا مطالعہ فرماتے، رفتہ رفتہ احباب آ جمع ہوتے تو آواز سے پڑھنے لگتے، ورنہ خاموش مطالعہ فرماتے رہتے تھے،

عجیب سماں ہوتا تھا، رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ، عصر و مغرب کا درمیانی وقت، روزے کا کیف، روح میں تازگی اور بالیدگی، ایسا لگتا تھا کہ یہ فرشتے ہیں، یا نور کے پتلے، چہروں پر معصومیت اور نورانیت، ایسے بیٹھے سنتے، جیسے یہ ہی نہیں مجلس سنسان ہو کا میدان ہے،

گاہ بگاہ گریہ طاری ہو جاتا، یا آنسو ڈبڈبا آتے، دل کا کیا عالم ہو گا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، یا کچھ وہی جانتے ہوں گے، اللہ سے لو لگی ہوتی اور زبان پر اللہ اللہ ہوتا کبھی کبھی درد بھری آہ بھی سننے میں آجاتی، میں بیٹھا منہ تکتا رہتا، اور زبانِ حال سے کچھ کہتا سنائی دیتا ہے،

بکُن پنبۂ غفلت از گوشِ ہوش

کہ از مردگاں پندت آید بگوش

میری آنکھوں نے سالہا سال یہاں دیکھا ہے، ملفوظات سے مجھے جو اُنسیت ہے، وہ مجھے ورثہ میں ملی ہے، ماں ییچے گھٹی میں پڑی ہے،

عہدِ حاضر میں ہند و پاک کے تنقید نگار ملفوظات پر جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ تنقیدیں نہیں تنقیصیں معلوم ہوتی ہیں، بارگاہِ الٰہی میں میری التجا ہے کہ تخریب سے یہ لوگ درگذریں اور تعمیر میں لگ جائیں،

ملفوظات ہماری تہذیب و ثقافت کا گراں قدر سرمایہ ہے، جو اب بھی ہمارے لئے ... اس سرمایہ کا ضائع ہونا قوم و ملت کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے، ان کی قدامت ... وخاص میں اُن کی مقبولیت راز سربستہ ہے، جو ہمیں دعوتِ عمل دیتا ہے، یہ صحیح ہے کہ ملفوظات کے جو نسخے دستیاب ہوتے ہیں، وہ خامیوں سے مُبرا نہیں، مگر وہ خامیاں ایسی بھی نہیں جو دفع نہ ہو سکیں، یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ قدیم سے قدیم نسخوں کا کھوج لگائیں، اور نقد و تحقیق کی صیقل سے اصل کا آئینہ بنا دکھائیں، چودہویں صدی کی یہ جیتی جاگتی کرامت ہے کہ جن کتبِ ملفوظات کے وجود سے انکار کیا جارہا ہے، اور جنھیں جعلی قرار دیا جارہا ہے، اور جنھیں مابعد کے کسی شخص کے ذہن کی خلاقی کا نتیجہ بتایا جارہا ہے، (ص ۱۴۰) ان کے قدیم ترین (۷۳۱ھ تک کے) نسخوں کا سراغ ملنے لگا ہے، اور جنھیں معتبر و مستند بتایا جارہا ہے، بارہویں صدی

تک پہنچ کر اُن کے نشانِ قدم کا کھوج نہیں ملتا، بارہویں صدی تک بھی جو کھوج ملتا ہے وہ ظنی اور قیاسی ہے حقیقی نہیں ہے، یہ امداد غیبی بھی ہے، اور پیرانِ باصفا کی کرامت بھی ہے اور عقیدتمندوں کے لئے دعوت ایثار و عمل بھی ہے، دیکھئے پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے اور کون یہ سعادت حاصل کرتا ہے، یخلق ما یشاء و یختار۔

تصنیف و تالیف | کسی موضوع یا کسی عنوان سے متعلق معلومات فراہم کر کے اپنے خیالات اور اپنی معلومات کو سلیقے سے سپردِ قلم کرنا تصنیف ہے، تصنیف کسی اہلِ قلم کی ذاتی جدوجہد اور اس کے اپنے خیالات و رجحانات کا مرقع ہوتی ہے، مصنف ہی اس کا ذمہ دار ہوتا ہے،

"تالیف" عرفِ عام میں مختلف مضامین (نثر و نظم) کو ایک جا جمع کرنے کو تالیف کہتے ہیں اور تالیف کرنے والے کو مولف کہتے ہیں، مؤلف کسی ایک شخص کے مضامین کو بھی جمع کر سکتا ہے اور مختلف اشخاص کے مضامین کو بھی، کتب ملفوظات کو بھی تالیف سے تعبیر کرتے ہیں اگرچہ بہم ہلکا سا امتیاز بھی ہے، اور وہ یہ کہ مؤلف مرتب شدہ مضامین کو جمع کرتا ہے، جو کسی ایک سے مخصوص ہوتے ہیں، یا زیادہ سے، مگر کتبِ ملفوظات میں سے ہر ایک کسی ایک ہی کی آوازِ بازگشت ہوتی ہے، جس کو سُن کر مرتب کیا جاتا ہے، اس لئے بغرضِ امتیاز ملفوظات کے مرتب کرنے والے کو جامع بھی کہتے ہیں،

جامع ملفوظات | جامع ملفوظات کو استحقاق ہوتا ہے، کہ اگر دورانِ گفتگو میں کوئی واقعہ پیش آجائے، تو اس کی روداد بھی ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ مثلاً فلاں آیا، مقرر اس کی طرف متوجہ ہوا، اور اس سے یہ گفتگو ہوئی، یا فلاں نے یہ سوال کیا، اور اس کا یہ جواب دیا، اس اعتبار سے ملفوظات کی نہ تو وہ نوعیت رہتی ہے، جو ان مضامین کی ہوتی ہے جنھیں مولف تالیف کرتا ہے، اور نہ تقریرِ مسلسل ہی کی نوعیت برقرار رہتی ہے، اس لئے ملفوظات

نہ بعینہٖ تقریر ہوتے ہیں، اور نہ بعینہٖ تالیف، جامع ملفوظات بھی اس اعتبار سے قدرے مؤلف سے ممیز ہوتا ہے لیکن عرف عام میں ملفوظات کو تالیف سے اور جامع کو مولف سے بھی تعبیر کرتے ہیں، تاہم یہ امتیازات ذہن میں محفوظ رہنے چاہئیں۔

ملفوظات کو اُن یادداشتوں کے مثل جاننا بھی صحیح نہیں جو اساتذہ درس کے دوران کسی عنوان سے متعلق طلبہ کو لکھواتے ہیں، اس لئے کہ وہ تقریر نہیں، بلکہ مضمون مسلسل ہوتے ہیں جو اکثر مرتب کئے ہوئے ہوتے ہیں، خواہ وہ زبانی بیان کئے جائیں، ان کی نوعیت ہرگز تقریر کی سی نہیں ہوتی، پھر وہ عموماً وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں، مگر ملفوظات جب تک وہ محفوظ رہ سکتے ہیں، شمعِ ہدایت ہوتے ہیں، اس مختصر معلومات سے مجموعۂ ملفوظات کی نوعیت واضح ہوجاتی ہے کہ وہ تصنیف نہیں ہوتے، اور ان پر تالیف کا بھی پورا اطلاق نہیں ہوتا اور یہ غلط فہمی رفع ہوتی ہے،

"بخوبی ممکن ہے اس کا سبب یہی رہا ہو کہ ہمارے شیوخ نے کتابیں نہیں لکھی ہیں تو ہم کیوں تصنیف و تالیف کی طرف التفات کریں، متابعت کاملۂ شیخ اور اتحاد مطلب کا ان بزرگوں کے ہاں اتنا ہی اہتمام ہوتا تھا، .... یہ ذاتی یادداشت تھی، اسے کتابی صورت میں مرتب کرکے شائع کرنے کا کبھی ارادہ نہیں تھا،

(منادی دہلی ص ۱۳۰ بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶ ۱۹۷۴ء)

مجموعۂ ملفوظات کو تصنیف و تالیف سے تعبیر کرنا صحیح نہیں، متابعت شیخ اور اتحاد مطلب کا بھی وہ مدعا نہیں جو تنقید نگار سمجھتے ہیں، اگر یہی مطلب ہوتا تو حضرت محبوب الٰہیؒ یہ کیوں فرماتے :۔

"سہ چیز کہ شیخ کبیر .... رامیسر شد من نمی توانم کرد،

اوّل آں کہ ہر روز غسل کردے الخ ...... (سیر الاولیاء ص ۳۰۸)

حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے "نسخہ کردم" اس کا مدعا یہی ہے کہ آپ نے حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات کو کتابی شکل میں مرتب فرمایا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ شائع کرنے کا ارادہ نہ تھا، حضرت محبوب الٰہیؒ کے دل کی بات آج کون جان سکتا ہے،

نوشتہ کا اطلاق | نوشتہ کا اطلاق ہر تحریر پر ہوتا ہے، تصنیف، تالیف، نقل کتاب، یادداشت، قطعہ، طغرا، مراسلہ، رقعہ، دستاویز، کتبہ .... نظم و نثر سب ہی تحریریں نوشتہ میں شمار ہوتی ہیں، البتہ قرینے سے اطلاق کا امتیاز ہوتا ہے، ۱۵ محرم ۷۱۰ھ کی مجلس میں خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ نے ذکر کیا ہے،

عزیزے حاضر بود، عرض داشت	ایک دوست تھے انھوں نے عرض
کرد کہ مرا در اودھ مردے کتابے	کیا کہ ایک شخص نے اودھ میں مجھ
نمود۔ گفت کہ ایں نبشتۂ خدمتِ	کتاب دکھائی، (اور) کہا کہ یہ حضرتؒ
مخدوم است، خواجہ ذکرہ اللہ	والا کی لکھی ہوئی ہے آپ نے فرمایا
بالخیر گفت کہ تفاوت گفتہ است	اُس نے تفاوت (فرق) سے کہا ہے
من ہیچ کتابے نہ نوشتہ ام،	(دو چیزوں کے درمیان دوری کو
(فوائد الفواد ص ۷۵)	فرق ہے) میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے

یہ بیان واضح نہیں مبہم ہے، نوشتہ کا مفہوم وضاحت طلب ہے، تفاوت گفتہ سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، کہ نوشتہ کا مفہوم مبہم ہی ہے، مطلب یہ ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہو وہ لکھا ہے، مگر وہ کتاب نہیں لکھی جو اس کے تصرف میں ہو سکتی ہے، کیونکہ مجموعی طور پر نوشتہ سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا تھا، ایسا لگتا ہے کہ اسی مماثلت سے کسی کو شبہہ ہوا تھا، تاہم جس

خیال سے یہ بات کہی گئی تھی، حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے کمالِ بلاغت سے اسی کے لفظ کو منفی صورت میں دہرادیا، تاکہ نوشتہ کا جو مفہوم اس کے ذہن میں تھا، کلیتہً اس کی تردید ہو جائے، کتابے سے بھی اس کے معہودِ ذہنی کی نوعیت واضح نہیں ہوتی کہ وہ کس موضوع سے متعلق تھی تصنیف تھی یا تالیف تھی "من ہیچ کتابے نہ نوشتم" سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، ورنہ لکھنے کو تو آپ نے کیا کچھ نہ لکھا ہوگا، حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات بھی لکھے تھے، جنھیں بصورت کتاب ہی مدوّن فرمایا تھا، آپ کا ارشاد ہے،

"ہرچہ از شیخ شنودہ شد، نوشتم، چوں بمقام خود باز آمدم برجائے نسخہ کردم ....تا ایں غایت آں مجموعہ برمن است"

(فوائد الفواد ص ۳۰)

یہ کہ نسخہ کردم کیا ہے، ؟ کتاب نہیں لکھی تھی، تو اور کیا لکھا تھا" مگر ہیچ کتابے نہ نوشتم" کا مدعا یہ ہے کہ معہود ذہنی جیسی میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے، گویا کہ یہ جملہ معہودِ ذہنی سے متعلق ہے، وہ سب تحریریں مستثنیٰ ہیں، جو آپ کے قلم سے نکلی تھیں، یہ جملہ تمام تحریروں سے متعلق نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے، امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے کہ جو سوال صوفی حمید الدین ناگوریؒ سے کئے گئے تھے، اور جو انھوں نے جواب دیئے تھے، وہ آپ نے ایک کتاب کے حاشیہ پر لکھے تھے (سیر الاولیاء ص ۱۰۰) جو حال ہی میں پاکستان میں رسالہ سوال وجواب کے نام سے شائع ہوچکے ہیں، شمائل الاتقیاء جو آپ کے بزرگ خلیفہ شیخ برہان الدین غریبؒ کے ایما سے مرتب ہوئی تھی، اس میں رسالہ قوام العقائد آپ کی تصنیف سے فہرستِ ماخذات میں موجود ہے، اس نکتے کو سمجھ لینے کے بعد کوئی الجھن باقی نہیں رہتی، (باقی)

راجہ جے سنگھ کی رصدگاہیں

از

جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے، ایل ایل بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو معارف نومبر ۱۹۶۷ء

جے سنگھ کا مُسلم ماخذ

سلطنت مغلیہ کے عظیم ترین اور خاندانی وفادار ماتحت امبر راج کا فرزند ارجمند ہونے کے ناطے چھوٹے راج کمار جے سنگھ کے لئے وقت کے علوم متداولہ کی اعلیٰ تعلیم کا بڑے شایانِ شان طریقہ پر انتظام کیا گیا ہوگا، اور اگرچہ اسے حصول تعلیم کے لئے زیادہ وقت نہیں مل سکا، کیونکہ تیرہ ۱۳ سال ہی کی عمر میں وہ سایۂ پدری سے محروم ہوگیا[1] اور امبر راج کی گدی اور اس سے زیادہ خاندانی وقار کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فوراً ہی فوجی خدمات کی انجام دہی کے لئے بچپن کی بے فکر زندگی کو خیرباد کہنا پڑا[2] مگر اتنے قلیل عرصہ ہی میں اس نے مختلف علوم میں غیر معمولی دستگاہ حاصل کرلی،

---

[1] جے سنگھ ۱۶۹۹ء مطابق ۱۱۱۰ھ میں پیدا ہوا تھا اور ۱۲۲۳ھ مطابق سنہ چوالیس ۴۴ جلوس عالمگیری امبر کا راجہ بنا۔

"دھیراج راجہ جے سنگھ سوائی ... بعد فوت پدر بسال چہل و چہارم جلوس خلد مکان از اصل و اضافہ بمنصب ہزار و پانصدی ہزار سوار و خطاب راجہ جے سنگھ ... امتیاز داشتند۔" (مآثر الامرا، ج ۲، ص ۸۱)

[2] "سال چہل و پنجم ہمراہ اسد خاں بتسخیر قلعہ سنحر لنا عرف کھلنا نامزد گردید، و در گرفتن قلعۂ مذکور روز یورش کارہاے بستہ از دو بو قوع آمد" (مآثر الامرا، ج ۲، ص ۸۱)

ان میں سب سے اہم فارسی ادب تھا، جس پر قدرت کا ثبوت اس کی مرتب کردہ "زیج محمد شاہی" کا دیباچہ ہے، اس کی تحریر میں وہ اس وقت کے صف اول کے فارسی انشا پردازوں کے دوش بدوش نظر آتا ہے۔ عام طور پر مصنفین اپنے فضل وکمال کا مظاہرہ حمد باری تعالیٰ، نعت رسول اور مدح بادشاہ وقت میں کیا کرتے ہیں اور سوائی جے سنگھ بھی ان سے کم نہیں ہے، چنانچہ حمد باری تعالیٰ میں لکھتا ہے:

"ثنائے کہ خرد خردہ بین ھندسان عقدہ کشائے دراداے دقیقۂ ازاں زبان اعتراف بعجز وقصور کشاید، وستائشے کہ فکراصابت قرین راصدان فلک پیمائے بادلیں درجۂ آں شرح وبیان اقرار بتحیر ونارسائی نماید، نثار بارگاہ شہنشاہے کہ طباق سموات بلند درتے است چند از دفتر دیوان قدرت او تقدست اسمارہ، وانجم وخورشید آسماں پیوند دینار و درواہے است معدود از خزینۂ خازن سلطنت دے تعالت آلارہ[1]۔"

جزالت کلام کے ساتھ صنائع وبدائع بالخصوص براعت استہلال کا استعمال ملاحظہ ہو:۔

"اگر صفحات زیج اقالیم زمین را بجداول انہار ورقوم نجوم اشجار محلی ومزین نمی ساخت، ہیچ مستخرجے استخراج تقویم انواع حبوب وثمار نتوانست نمود، واگر راہ ظلمت آباد عناصر را بمشاعل ثوابت وسیار تابدار ومہتاب وآفتاب نوربار ظاہر نمی کرد، دررسیدن بسر منزل مقصود ونجات از ورطات غفلت مہالک چہ ممکن بود[2]۔"

صنعت براعت استہلال کی مندرجۂ ذیل مثال اس لئے اہم ہے کہ اس سے بعض مصنفین نے اس کے ماٰخذ ومصادر کو مستنبط کیا ہے:

"از نارسائی غور محیط قدرتش ابر خس خسے است بر ہم زدن دست افسوس ودر اندیشہ ارتفاع قدرتش

[1] زیج محمد شاہی (مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلیکشن فارسیہ علوم ۳۰ ص ۲، ورق اب۔

[2] زیج محمد شاہی، ورق اب

بطلمیوس خامشے است از رسیدن بآفتاب حقیقت مایوس، براہین اقلیدس دربیانِ اشکالِ صنائع اوحرفے ناتمام و ہزاراں جمشید کاشی چوں نصیر طوسی در پختن سودائے خام[1]"

بادشاہ وقت کی تعریف میں اشہب قلم کی جولانی دکھاتا ہے:

"حضرت قدر قدرت، مہر سپہر اُبہت و کامگارے، غرہ عظمت و شہریاری و دریکتائے بحر خلافت کبریٰ، در بے ہمتائے فلک سلطنت عظمیٰ، خورشید علم، قمر حشم، مریخ رزم، عطارد علم ناہید م، سپہر آستاں مشتری نگین کیوان پاسبان السلطان ابن السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان ابن الخاقان سکندر جاہ ظل اللہ بادشاہ غازی محمد شاہ لازال مظفراً فی المعارک والمغازی[2]"

لیکن دیباچہ میں "نعت رسول" نہیں ہے، جس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ راجہ انتہائی متعصب اور اسلام بیزار تھا، یہ صحیح ہے کہ ایک ہندو ادیب پیغمبر اسلام کی نعت کے لئے مکلف نہیں ہے، اگر یہ رسم معروف اور وقت کا دستور معہود تھی، دوسرے ہندو مصنفین بھی تھے جو اگر کسی وجہ سے پیغمبر اسلام کی مصرح طور پر نعت نہ لکھتے تو بھی کم از کم انبیا و رسل کی روح پُر فتوح کو نذرانۂ عقیدت پیش کئے بغیر نہ رہتے، مثلاً جے سنگھ سے کچھ عرصہ پہلے سبحان رائے بھنڈاری نے "خلاصۃ التواریخ" میں "نعت رسول" تو نہیں لکھی مگر انبیا، و رسل کی تعریف ضرور کی:

"دربیان خاصان درگاہ ایزدی و تعریف آخر سدۂ عالم

بنابر استحکام ادیان در ہر دیار و ہر فریق یکے از خاصان جناب صمدیت را بخلعت بشری مخلع گردانیدہ، اور آں قدر قدرت عطار زمودہ کہ عارف دقایق عقول و نفوس و کاشف حقائق معقول و محسوس بود......

و بالہام ربانی کتاب آسمانی بدست داشتہ خلایق را ہادی وادی ایزد پرستی و رہ نمودن راہ

---

[1] زیچ محمد شاہی، ورق اب [2] زیچ محمد شاہی ورق اب ۲ ط

راشناسی گشت[1]"

مگر راجہ کی چھپی ہوئی اسلام بیزاری نا اسلام دشمنی اسے ان رسمیات کی اجازت نہیں دے سکتی تھی،
مریہ کوئی اتفاقی بات بھی نہیں تھی، اسے اسلام اور اسلامیات سے بغض و عناد تھا، اس کی تفصیل
سب ذیل ہے :

"زیج محمد شاہی" اور "زیج الغ بیگ" کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر ثانی الذکر
سرقہ نہیں تو چربہ تو ضرور ہے، نہ صرف تقسیم ابواب میں مماثلت ہے، مواد میں بھی یکسانی ہے، بالخصوص
قالۂ دوم کے ابواب کے موضوع اور عنوان، نیز ان کا مواد ضمائر کے اختلاف سے قطع نظر بالکل
یک ہیں (مزید تفصیل آگے آئے گی) "زیج الغ بیگ" کا اٹھارہواں باب دو ستاروں کے درمیانی
اصلہ کی معرفت میں ہے :

"باب ہیژدہم در استخراج بعد میان دو کوکب[2]"

ور بیسواں باب ستارے کے ارتفاع سے اس کا طالع معلوم کرنے کے باب میں :

"باب بستم در معرفت طالع از ارتفاع"[3]

"زیج محمد شاہی" میں بھی سترہواں باب "دو ستاروں کے درمیانی فاصلہ کی معرفت[4]" میں اور
ٹھارہواں باب "ارتفاع کوکب سے اس کا طالع معلوم کرنے کے باب" میں ہے[5] مگر "زیج الغ بیگ"
میں اٹھارہویں اور بیسویں باب کے درمیان انیسواں باب "سمت قبلہ اور اس کا انحراف
معلوم کرنے کے باب" میں بھی ہے۔

"باب نوزدہم در سمت قبلہ و انحراف او[6]"

---

[1] سجان رائے بھنڈاری: خلاصۃ التواریخ ص ۲، [2] زیج الغ بیگ ص ۲۰ ظ، [3] زیج الغ بیگ ص ۲۱،
[4] زیج محمد شاہی ص ۱۰ ظ، [5] زیج محمد شاہی ص ۱۰ ظ۔ [6] زیج الغ بیگ ص ۲۱ ظ۔

اور مذہبی نقطۂ نظر سے علم الہیئت کا یہ ایک عظیم فائدہ ہے، لیکن چونکہ "توجہ الی القبلہ" نماز کا رکن رکین ہے اور نماز دین اسلام کا عظیم ستون، لہٰذا باوجودیکہ "زیج محمد شاہی" ایک مسلمان بادشاہ کے نام ہی معنون نہیں کی گئی تھی، بلکہ اس کے حکم کی تعمیل میں اور اس سے زیادہ یہ کہ اس کی دی ہوئی رقم کثیر (تیس لاکھ روپیہ) سے مرتب ہوئی تھی، راجہ کی اسلام بیزاری نے اس مبحث کا باب باندھنے یا الغ بیگ کی عبارت دہرانے تک کی اجازت نہیں دی۔

اور سیاسی طور پر وہ اُس سازش کا سربراہ تھا جو ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے استیصال اور اس کی جگہ ہندو راشٹر کے قیام کے لئے ہندوؤں کے مختلف طبقوں (راجپوتوں، مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں) میں کی جا رہی تھی۔

(۲) لیکن یہی چیز یعنی "نعت رسول" اور "معرفت سمت قبلہ کے باب" کا ترک اس بات کی بھی دلالت ہے کہ یہ زیج ضرور راجہ ہی کی مرتب کردہ ہے، یہ نہیں کہ اس نے اپنے ماتحتوں سے یا معاوضہ پر لکھوائی ہو، اگر ایسا ہوتا تو وہ کسی مسلمان ہی سے لکھواتا اور وہ یہ دونوں کام نہ کرتا۔

ظاہر ہے جب راجہ کو فارسی انشا پردازی میں یہ دستگاہ عالی حاصل تھی تو دیگر علوم متداولہ میں بھی یہی تبحر و تمہر ہوگا، مگر اس نے اپنی افتادِ طبع کے پیش نظر ان علوم میں سے ریاضی و ہیئت میں خصوصی کمال حاصل کیا، چنانچہ "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ میں کہتا ہے:

"ایں خیرخواہ اصناف آفرینش و تماشا کارگاہ دانش و بینش سوائی جے سنگھ از بدو فطرت و عنوان شعور بفن ریاضی مشغوف و مالوف بود و ہموارہ عنان طبعش بکشف دقائق و حل غوامض آں مصروف، و بتائید کردگار از اصول و قوانین آں حظے وافر

لہ مولانا عبدالحی حسنی: نزہۃ الخواطر (دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۷۶ھ، ۱۹۵۷ء) الجزء السادس، ص ۲۵۸۔

ونصیبے کامل حاصل کرد۔"[1]

لیکن فن ریاضی میں شوق و شغف اور تبحر و تمہر کے ساتھ راجہ کے مزاج میں مذہب پسندی بدرجۂ اتم رچی ہوئی تھی، وہ ایک راسخ العقیدہ ہندو تھا اور جملہ مذہبی مراسم کو ان کے صحیح وقت پر انجام دینے کا اہتمام کرنا چاہتا تھا۔[2] اس غرض سے فطری طور پر اس نے ہندو جوتش سے رجوع کیا، مگر جوتش کی قدیم و جدید کتابیں اس باب میں اس کے دقت پسند معیار کو مطمئن نہ کر سکیں اور اس لئے اس نے بقول جی۔ ایم۔ موریس مسلم علم الہیئت کی طرف توجہ کی۔[3]

یوں بھی اس زمانہ میں سماج کے اعلیٰ علمی طبقوں میں اسلامی علوم بالخصوص معقولات کا عام رواج تھا، بالخصوص موخر الذکر میں دستگاہ عالی حاصل کئے بغیر کسی فاضل کا علم و فضل غیر مکمل سمجھا جاتا تھا، ان علوم عقلیہ میں ریاضی و ہیئت بھی شامل تھی جس کا مغل دور میں اکبر کے بعد سے بہت زیادہ رواج بڑھ گیا تھا۔ اس کے اندر ہندو اور مسلمان کا کوئی امتیاز نہ تھا چنانچہ راجہ کا دست راست جگناتھ پنڈت جو اپنے وقت میں سنسکرت علوم کا فاضل نبیل تھا عربی زبان اور مسلم علم الہیئت میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔

پھر سلطنت مغلیہ کے عظیم ترین اور وفادار ماتحت امیر راج کا راج کمار ہونے کے ناطے راجہ جے سنگھ کے لئے بھی فارسی ادب کے ساتھ مسلم علم الہیئت کی تعلیم کا بھی بہترین انتظام کیا گیا تھا اور مستقبل کے عظیم ہیئت داں نے اس سے پورے طور پر استفادہ کیا۔

---

[1] زیج محمد شاہی؛ ص ۱۱۳۔ [2] زیج محمد شاہی؛ ص ۱۱۲۔

Moraes G. M: Astronomical Mission Jai Pur [3]

P. L. 61-62 Moraes.

عام اور قدیم ماخذ کے برخلاف جے سنگھ نے اپنے پیش رو مسلمان ہیئت دانوں کی تصانیف کا نام بنام ذکر بھی کیا ہے، مگر ان کی تفصیل سے پیشتر ان دو مسئلوں پر بھی ایک تحقیقی نظر ڈالنا مستحسن ہوگا جو اس کے ہندو ماخذ کی طرح اس سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں۔

مسلم ہیئتی ورثہ کی نوعیت | مسلمان نہ تو اپنی تہذیب کے لئے اور نہ علمی بالخصوص ہیئتی سرگرمیوں کے لئے ایسی عسیر الیقین قدامت کا ادعا کرتے ہیں جو ہندوؤں کے ہاں عام ہے۔ اسلام بجائے خود ایک تاریخی حقیقت ہے، جس کی عمر صرف چودہ سو سال ہے، مگر کم یا زیادہ اس کی ہر سرگرمی "تاریخی حقیقت" کی مصداق ہے اور کسی حسابی یا فرضی وادعائی قیاس آرائی کی محتاج نہیں ہے۔

البتہ اسلام نے پہلے ہی دن سے دیگر علوم کی تحصیل کے ساتھ علم ہیئت کے حصول پر بھی زور دیا، اس طرح علم الہیئت کا آغاز صدر اسلام ہی میں ہوگیا ہے، چنانچہ ایک جانب قرآن حکیم نے اجرام فلکی کے سیر و گردش کے مشاہدے کی ترغیب دی[1] اور جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر غور و فکر کرنے میں کوتاہی برتنے کو بدنصیبی بتایا[2] اور دوسری جانب اسلام نے نجوم اور جوتش کے ڈھکوسلوں کو منافیٔ اسلام قرار دیا[3]

باقاعدہ ہیئتی ادب کی ابتدا پہلی صدی ہجری کی آٹھویں دہائی سے ہوئی، جب کہ یزید بن معاویہ کے دوسرے بیٹے خالد نے (جو علوم حکمیہ کے ساتھ اپنے شغف کی بنا پر "حکیم آل مروان" کہلاتا تھا) کیمیا کے ساتھ طب اور نجوم کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ کرایا[4]

باضابطہ ارصادی سرگرمیوں کا پتہ پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی میں چلتا ہے، جبکہ بقول ابوریحان البیرونی شہر بست میں ۹۰ھ اور ۱۰۰ھ کے درمیان متعدد سورج گہنوں کا مشاہدہ

---

[1] قرآن کریم: سورۂ یونس آیت ۵۔ [2] امام الدین ریاضی تصریح ص ۳۔ [3] ابن قتیبہ کتاب الانواء ص ۱۴۱

[4] ابن الندیم کتاب الفہرست، ص ۳۳۸ و ۴۹۱۔

کیا گیا تھا۔ (تحدید نہایات الاماکن، ص ۲۶۸)

اسلام کے ہیئتی ادب میں قدیم ترین تصنیف ابراہیم بن حبیب الفزاری کی "کتاب الزیج علی سنی العرب"[1] ہے، جسے اس نے دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے حکم سے مرتب کیا تھا اس کے معاصرین نے بھی علم ہیئت میں مختلف کتابیں لکھیں، اس کے بعد ہارون الرشید کے عہد میں بطلیموس کے ہیئتی شاہکار "کتاب المجسطی" کا عربی میں ترجمہ ہوا[2]۔ اسی زمانہ میں عہد اسلام کی پہلی رصدگاہ جندیسابور میں احمد بن محمد النہاوندی کی سرپرستی میں قائم ہوئی اور اس نے اپنی "الزیج المشتمل" لکھی[3]۔ اگلی صدی میں ساتویں خلیفہ المامون نے بغداد اور دمشق میں رصدگاہیں تعمیر کرائیں، اور ان کے ارصادات کی مدد سے رصدگاہوں کے کارکنوں نے اپنی اپنی زیجیں مرتب کیں[4]۔ انہی فلکیاتی دریافتوں کی مدد سے سرکاری طور پر "الزیج الممتحن" تیار کی گئی۔

رصدگاہ مامونی کے بعد رصدگاہوں کی تعمیر کا ایک سلسلہ چل نکلا، چنانچہ ایک ترک محقق نے ان رصدگاہوں کی تعداد جو ۸۰۰ء اور ۱۰۵۰ء کے مابین قائم کی گئیں اور جن کے ارصادات کی تفصیل ہنوز دنیا کی لائبریریوں میں محفوظ ہے ایک سو چار بتائی ہے[5]، ان میں بیشتر سرکاری سرپرستی سے بے نیاز ہو کر قائم کی گئی تھیں، جیسے البتانی اور ابوریحان البیرونی کی رصدگاہیں ارصادی سرگرمیوں کے ساتھ فضلائے اسلام علم الہیئت میں بھی کتابیں لکھتے رہے، جن کی تعداد صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

قدیم ترین ہیئتی تصنیف جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے، البتانی کی "الزیج الصابی" ہے جو اس کے ان فلکیاتی مشاہدات پر مشتمل ہے جو اس نے ۲۶۴ھ اور ۳۰۶ھ کے مابین کئے تھے

---

1 ابن القفطی: تاریخ الحکماء، ص ۵۰، 2 ابن الندیم کتاب الفہرست ص ۲۴، 3 زیج ابن یونس ص ۱۴۱

4 طبقات الامم ص ۵۰، 5 Cambridge History of Iran, Vol V-P.672.

چوتھی صدی ہجری عجم کے حسن طبیعت کے نکھار کا منتہائے کمال ہے، بویہیوں نے برسراقتدار آتے ہی مختلف علوم حکمیہ کی سرپرستی پر غیر معمولی توجہ دی، بالخصوص نجوم وہیئت کی ترقی میں، عبدالرحمٰن الصوفی، ابوجعفر الخازن، ابوالوفار البوزجانی الخجندی، ابونصر بن عراق، احمد بن عبدالجلیل السنجزی اس عہد کے باکمال ہیں، اس صدی کا نصف آخر اور پانچویں صدی کا آغاز چار باکمالوں کے ظہور و نبوغ کے لئے مشہور ہے: عجم میں شیخ بوعلی سینا اور ابوریحان البیرونی اور مصر میں ابن الہیثم اور ابن یونس، البیرونی کی قانون مسعودی اور ابن یونس کی "الزیج الکبیر الحاکمی" اسلامی ہیئت کی ادبیات عالیہ کی مصداق ہیں۔

پانچویں صدی کے نصف آخر میں سلجوقی تاجدار ملک شاہ کے حکم سے عمرخیام کی نگرانی میں رصدگاہ اصفہان تعمیر ہوئی، جس کی مدد سے تقویم کی اصلاح اور تاریخ جلالی کا آغاز عمل میں آیا[1]

اگلی صدی میں عبدالرحمٰن الخازن نے "زیج سنجری" اور الخرقی نے "منتہی الادراک فی تقاسیم الافلاک" اور "التبصرہ فی الہیئۃ" مرتب کئے۔ صدی کے خاتمے پر الجغمنی نے "الملخص فی الہیئۃ" لکھی، جس کی "شرح چغمنی" کے نام سے کچھ عرصہ پہلے تک عربی مدارس کے اندر ہیئت کے اعلیٰ نصاب میں داخل تھی۔

ساتویں صدی کے وسط میں ہلاکو نے حملہ کرکے عالم اسلام کو تہس نہس کر دیا، مگر تاریخ کا یہ عجوبہ بھی موجب صدہزار حیرت ہے کہ اسی کی زیر سرپرستی اسلامی علم الہیئۃ کی تجدید بھی ہوئی، اس نے محقق طوسی کی نگرانی میں مراغہ کی رصدگاہ تعمیر کرائی، یہ دنیا کی پہلی رصدگاہ تھی جو بین الاقوامی انداز پر قائم کی گئی، کیونکہ اس میں مغرب و اندلس کے علاوہ کم از کم ایک چینی

---

[1] ابن الاثیر، کامل التواریخ، المجلد العاشر (مطبوعہ بیروت ۱۳۸۶ھ، ۱۹۵۰ء)، ص ۹۸۔

ہیئت داں بھی شریک تھا۔[1] رصدگاہ مراغہ کی دریافتیں "زیج ایلخانی" میں مرتب کی گئیں۔

رصدگاہ مراغہ کے نگرانِ اعلیٰ خواجہ نصیر الدین طوسی تھے جنھیں بجا طور پر نہ صرف اسلامی فلسفہ بلکہ اسلامی ہیئت کا بھی مجدد کہنا چاہیے، "زیج ایلخانی" انھیں کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے "المجسطی" کا بھی نیا ایڈیشن تیار کیا اور بعد میں یہی ایڈیشن "تحریر المجسطی" کے نام سے مستعمل رہا۔ انھوں نے علم الہیئۃ کا ایک متن متین بھی "تذکرہ" کے نام سے مرتب کیا، جو عرصہ تک ہیئت کے اعلیٰ نصاب میں مشمول رہا۔ اور بھی کتابیں لکھیں جن میں "بست باب" اسطرلاب میں اور "الشکل القطاع" کروی مثلثات میں مشہور ہیں۔

اگلی صدی کے فضلاء کی ہیئتی سرگرمیاں جغمینی کے "الملخص" اور محقق طوسی کے "التذکرہ" کی شرح لکھنے میں محدود ہیں، ان شراح میں نظام اعرج اور میر سید شریف خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

نویں صدی ہجری کے نصف اول میں عجم کی آخری قابل ذکر رصدگاہ تعمیر ہوئی، یہ سمرقند کی رصدگاہ تھی جسے تیمور کے پوتے الغ بیگ نے قائم کیا تھا، وہ خود زیورِ علم و فضل سے آراستہ تھا، اور علوم ریاضی و ہیئت میں سرآمد فضلائے روزگار تھا، صاحب "مطلع السعدین" نے اس کے علم و فضل کے بارے میں لکھا ہے:

"مرزا الغ بیگ کہ در علوم و فنون صاحب نصیب اوفی و نصاب مستوفی بود۔"[2]

اسی طرح صاحب "حبیب السیر" اس کے علم و فضل کے بارے میں لکھتے ہیں:

"دانش جالینوس باحشمت کیکاؤس جمع فرمودہ در سائر فنون خصوصاً علم ریاضی و نجوم در آں زماں عدیل و نظیرِ او کسے نہ بود۔"[3]

---

[1] تاریخ بناکتی بحوالہ معارف ہند جلد ۲ ص ۳۱۰، [2] عبدالرزاق کاشی: مطلع السعدین ص ۲۳۷، [3] خواندمیر: حبیب السیر ج ۳ جزء سوم ص ۱۵۱

دولت شاہ اس کے تبحر فی النجوم و الہیئۃ کے بارے میں لکھتا ہے:

"اما سلطان مغفور سعید الغ بیگ گورگان .... در علم نجوم مرتبۂ عالی یافتہ، و در معانی موے می شگافت[1]"

علم وحکمت بالخصوص ریاضی وہیئت کی ترقی کے لئے اس نے دنیا کی پہلی "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی تھی، جس کے ارکان اربعہ مولانا معین الدین کاشی، غیاث الدین جمشید کاشی، مولانا صلاح الدین موسیٰ المعروف بقاضی زادہ رومی اور مولانا علاء الدین علی قوشجی تھے، ۸۲۳ھ میں اس کے باپ شاہ رخ نے اسے ماوراء النہر کی حکومت عطاء کی اور ۸۲۴ھ میں اس نے سمرقند میں دوسری عمارات کے علاوہ ایک رصدگاہ قائم کی جس کے اندر استعمال کے لئے بقول گستاولی بان

"اس نے ایسے کامل آلات رصد بنوائے جو اس وقت تک نہیں بنے تھے"[2]

رصدگاہ کی تولیت پہلے مولانا غیاث الدین جمشید کاشی کو تفویض ہوئی مگر جلد ہی ان کا انتقال ہوگیا تب یہ عہدہ بادشاہ نے صلاح الدین موسیٰ المعروف بہ قاضی زادہ رومی کو عطا کیا مگر وہ بھی کار رصد کے اختتام سے پہلے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے[3]، لہٰذا الغ بیگ نے بہ نفس نفیس اپنے شاگرد رشید مولانا علاء الدین علی قوشجی کی مدد سے اس کام کو سر حد تکمیل تک پہونچایا[4]، اور نئی دریافتوں کو "زیج جدید سلطانی" (یا "زیج الغ بیگ") میں مدون کیا، دولت شاہ اس زیج کے بارے میں لکھتا ہے:

"والیوم نزد حکما آں زیج متداول و معتبر است و بعضے آں را بر زیج نصیری ایلخانی ترجیح می کنند[5]"

---

[1] دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء (مطبوعہ بریل لیڈن ۱۹۰۱ء) ص ۳۶۱ [2] گستاؤلی بان: تمدن عرب ص ۴۲۴

[3] الشقائق النعمانیہ برحاشیہ تاریخ ابن خلکان، ج ۱، ص ۸، [4] زیج الغ بیگ ص ۲ [5] تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۶۲

صاحب مطلع السعدین اس زیج کی مقبولیت وافادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آں زیج تصحیح یافتہ باتمام رسید و بزیج سلطانی گورگانی موسوم شد و درمیان بہرہ صناعت تنجیم واصحاب تقویم معمول و متداول است"[1]

مستشرقین کی تحقیق کے مطابق رصدگاہ سمرقند تاریخ اسلام کی آخری رصدگاہ تھی، اور وہ اسی پر اسلام کی ہیئتی سرگرمیوں کے تذکرے کو ختم کر دیتے ہیں، چنانچہ کارا دی وو جس نے مسٹر آرنلڈ کے مرتبہ "ورثہ اسلام" میں مسلمانوں کی ریاضی و ہیئت پر مقالہ لکھا ہے، اس کے آخر میں لکھتا ہے:

"آخر میں ہمیں سمرقند کے ہیئت دانوں کا ذکر کرنا چاہیے، جنھوں نے ۱۴۳۰ء میں تیموری خاندان کے ایک بادشاہ کے لیے زیج الغ بیگ کے نام سے ہیئتی جداول مرتب کی تھیں انھیں یورپ میں بڑے احترام سے دیکھا جاتا تھا، چنانچہ اٹھارویں صدی میں ان کا ایک جزء انگلستان میں شائع ہوا"[2]

دوسرا مستشرق شاخت کہتا ہے کہ رصدگاہ سمرقند سے متاثر ہو کر عالم اسلام کے وسطی علاقہ روم (ترکیہ) کے شہر استانبول میں ۱۵۷۵ء میں ایک رصدگاہ قائم کی گئی جس کی تقلید میں یورپ کے اندر رصدگاہوں کی تعمیر کا ایک سلسلہ جاری ہوا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رصدگاہ سمرقند نے (جسے ۱۴۲۰ء میں الغ بیگ نے تعمیر کرایا تھا) رصدگاہ استانبول کے قیام پر فیصلہ کن اثر ڈالا (تاریخ تعمیر ۱۵۷۵ء) موخر الذکر اپنی نوبت میں سترہویں صدی کے اندر یورپ کی رصدگاہوں کی تعمیر کے لیے موثر قوی ثابت ہوئی، اس کے اندر استعمال کردہ آلات رصدیہ اور ٹیکو براہے کے آلات میں شدید مماثلت تھی"[3]

---

[1] مطلع السعدین ص ۲۳۹ [2] Arnold: Legacy of Islam P. 377 [3] Schacht: Legacy of Islam - P. 487

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہیئتی سرگرمیوں کا سلسلہ اسلامی دنیا میں اس کے بعد بھی جاری رہا، بخصوص ہندوستان میں، عجم میں دسویں صدی ہجری میں دو مشہور ہیئت داں ملتے ہیں، خضری جنھوں نے محقق طوسی کے "تذکرہ" کی شرح لکھی اور مولانا نظام الدین مولانا عبدالعلی برجندی جنھوں نے محقق طوسی کی اکثر ہیئتی تصانیف کی شروح لکھیں، ان کے علم و فضل کے بارے میں صاحبِ "حبیب السیر" نے لکھا ہے:

"مولانا عبدالعلی برجندی جامع اصناف علوم منقول و معقول است و حاوی انواع مسائل فروع و اصول، در علم نجوم و حکمیات بے مثل و بدل است و در شیوۂ زہد و تقویٰ ضرب المثل ..... ہموارہ نقش افادہ و تالیف بر صحیفۂ خاطر شریف می نگارد[1]"

اسی طرح "جامع بہادر خانی" کے مصنف ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، ان کا خیال ہے کہ تین سو سال تک اُن جیسا ماہر ریاضی و ہیئت پیدا نہیں ہوا:

"و از عہد قدوۃ المتاخرین، مولانا عبدالعلی البرجندی طاب اللہ ثراہ تا ایں زمان کہ تخمیناً سہ صد سال قمری گذشتہ است، کتابے کہ مساہمت مجسطی و شرح تذکرہ و غیرہا نماید.... بعبارت واضح حسن ترتیب نیافتہ است[2]"

گیارہویں صدی ہجری کے ایران میں ایک شیعی عالم ملتے ہیں، وہ شیخ بہاء الدین عاملی ہیں، انھوں نے علم الہیئت میں ایک متن متین "تشریح الافلاک" کے نام سے لکھا جو بہت زیادہ مقبول ہوا۔

لیکن علم الہیئت کو زیادہ ترقی ہندوستان میں نصیب ہوئی، بالخصوص مغلوں کے آنے کے بعد، پہلے مغل تاجدار بابر کا بیٹا ہمایوں خود نجوم و ہیئت کا ماہر تھا اور اس فن کے ماہرین کا قدر دان، اس کے عہد کے مشہور فضلائے ہیئت میں ابوالقاسم استرآبادی، مولانا الیاس اردبیلی

---

[1] حبیب السیر ج ۳ جزء چہارم ص ۳۱۱، [2] جامع بہادر خانی ص ۳۔

نورالدین تیرخان، مولانا چاند اور مصلح الدین لاری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اول الذکر سے بادشاہ نجوم و ہیئت کا مذاکرہ کیا کرتا تھا، مولانا چاند کی تسہیلات "راجہ جے سنگھ کے زمانہ تک مشہور تھی اور اس نے اس سے استفادہ بھی کیا تھا، مصلح الدین لاری نے قوشجی کے رسالہ فی الہیئۃ کی شرح "ہمایوں نامہ" کے نام سے لکھ کر بادشاہ کے نام معنون کی تھی[1]

نجوم و ہیئت کے ساتھ اکبر کا شغف اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اس نے مدارس میں علوم دینیہ کی تعلیم کے بجائے ان علوم کی تعلیم کے لئے شاہی حکم جاری کیا[2] اس کے عہد کی نادرۂ روزگار شخصیت امیر فتح اللہ شیرازی تھے، جنھوں نے تقویم کی اصلاح کر کے سن الٰہی جاری کیا تھا[3]

مگر مغل دور نے ملا فرید منجم دہلوی سے بڑا کوئی ہیئت داں پیدا نہیں کیا، اس نے اپنے بھائی ملا طیب اور دوسرے یونانی، عربی علم الہیئت اور ہند دجوتش کے ماہرین کے ساتھ مل کر وزیر اعظم آصف خان کی نگرانی میں "زیج شاہجہانی" مرتب کی تھی، یہ اتنی مقبول ہوئی کہ اس فن کے ماہرین کو زیج الغ بیگ کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیا، اس کی غیر معمولی افادیت کے پیش نظر بادشاہ نے اسے ہندی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا[4]

عہد شاہجہانی کے دوسرے ماہر علم الہیئت ملا محمود جونپوری تھے، جن کی "شمس بازغہ" نے ہیئت داں کی حیثیت سے ان کی شہرت کو ماند کر دیا ہے، وہ بادشاہ کے پاس رصدگاہ کے قیام کی تجویز لے کر گئے تھے، مگر وزیر اعظم نے اسے نامنظور کر دیا[5]

---

[1] اس کتاب کے دو مخطوطے مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہیں، ایک سبحان اللہ خاں کلکشن میں نمبر ۵۲۰/۱۹ "فلکیات فارسی" اور دوسرا ذخیرہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی میں نمبر ۱۱/۳ علوم فارسیہ [2] دبستان المذاہب ص ۳۲۸، [3] آئین اکبری ج ۲، ص ۲۲۱ [4] عمل صالح ص ۳۶۱-۳۶۲ [5] آزاد بلگرامی "مآثر الکرام ص ۲۰۰،

اسی زمانہ میں احمد معمار کا خاندان ریاضی وہیئت میں اپنے تبحر و تمہر کے لئے مشہور تھا، ان کے صاحبزادے لطف اللہ مہندسہ و نجوم سے اپنے غیر معمولی شغف کی بنا پر مہندس کہلاتے تھے اور پوتے مولانا امام الدین کا تخلص "ریاضی" تھا، اوپر شیخ بہاء الدین کے رسالہ "تشریح الافلاک" کا ذکر آچکا ہے، امام الدین ریاضی نے "التصریح" کے نام سے اس کی شرح لکھی، جو آج کے دن تک مدارس عربیہ میں ہیئت کے نصاب میں داخل ہے، ان سے پہلے ملا عصمت اللہ سہارنپوری نے "باب تشریح الافلاک" کے نام سے اس کی شرح لکھی تھی، امام الدین ریاضی نے مندسہ کردیہ اور دیگر رسائل متوسطات کی مدد سے ان کے خلاصے تیار کئے تھے، انھوں نے قاضی زادہ رومی کی شرح چغمینی پر حاشیہ بھی لکھا تھا اور اس کے اندر "تنقیح المقال" کے عنوان سے رصد خانوں کے قیام و تعمیر پر ایک ہدایت نامہ بھی مرتب کیا ہے، انہی کے بھائی مرزا خیر اللہ تھے جو رصدگاہ دہلی میں راجہ جے سنگھ کے برائے نام نائب اور عملاً رصدگاہ کے متولی تھے، اسی رصدگاہ کے ایک اور کارکن مولانا عابد دہلوی تھے، ان کی تصانیف میں سے ان کا رسالہ فی استخراج اوساط علویہ بادِ حوادث کے جھونکوں سے بچ کر رضا لائبریری رامپور میں باقی رہ گیا ہے[1]۔

کرنل ٹاڈ کی تقلید میں فاضل مصنف نے بھی لکھا ہے کہ راجہ جے سنگھ کی موت کے ساتھ سائنس اور ہیئت اس ملک میں ختم ہو گئے، مگر یہ قلت مطالعہ کا نتیجہ ہے، ریاضی وہیئت کی ترقی جے سنگھ کے بعد بھی جاری رہی، اگلی (انیسویں) صدی ہی نے ایک عظیم فاضل کو پیدا کیا، یہ مولانا غلام حسین جون پوری ہیں جنھوں نے علم ہیئت اور متعلقہ ریاضیاتی علوم پر ایک انتہائی ضخیم کتاب "جامع بہادر خانی" کے نام سے تصنیف کی، یہ محض اپنے پیش روؤں کی خوشہ چینی ہی پر مشتمل

---

[1] نزہۃ الخواطر: الجزء السادس، ص ۳۴۷، نیز فہرست کتب عربی قدیم رضا لائبریری، رامپور فن ہیئت، ص ۴۲۴۔

نہیں ہے، بلکہ ان کی ذاتی دریافتوں پر بھی حاوی ہے، جامع بہادر خانی ۱۸۳۴ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔

آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے زمانہ میں لکھنؤ میں رصدگاہ قائم کرنے کی تحریک شروع ہوئی، کام شروع بھی ہوا، آلات منگائے گئے، مگر بدانتظامی کی وجہ سے منصوبہ اختتام کو نہ پہونچ سکا پھر غدر ہوگیا، نئے حکمرانوں کو محکوموں کی ثقافت سے کوئی ہمدردی نہ تھی، وہ تو اسے نیست ونابود کردینا چاہتے تھے، پھر بھی مدارس عربیہ کے معلمین و متعلمین کی تعلیمی سرگرمیوں کے طفیل میں اور کچھ نہیں تو اس کا کم از کم نام تو باقی رہ گیا، والی اللہ المشتکی۔

رہی مسلم علم الہیئت کی عظمت تو خود مسلمانوں نے تو اس باب میں کوئی بلند یا پست دعویٰ نہیں کیا، البتہ غیر جانبدار اور منصف مزاج غیر مسلم محققین نے بڑے شاندار الفاظ میں اسے خراج تحسین ادا کیا ہے، مثال کے طور پر کارادی وو عرب (مسلم) فضلاے ریاضی وہیئت کے علمی کمالات کے بارے میں لکھتا ہے:

"مسلمانوں نے سائنس کے اندر واقعی بڑے عظیم کمالات حاصل کیے، انھوں نے اعداد کی ترقیم کا طریقہ سکھایا، اگرچہ وہ ان کی ایجاد نہیں تھا، اور اس طرح وہ روزانہ زندگی کے علم الحساب کے بانی بن گئے، انھوں نے علم الجبر والمقابلہ کو ایک تحقیقی علم بنا دیا اور اسے بہت زیادہ ترقی دی، نیز ہندسۂ تحلیلی کی بنیاد ڈالی، اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ علم المثلثات مستوی و کروی کے بانی وہی ہیں، جن کا سچ تو یہ ہے کہ یونانیوں کے یہاں وجود بھی نہیں تھا، علم الہیئۃ میں بھی انھوں نے بہت سے قیمتی مشاہدات کیے"[1]

اسی طرح مشہور مورخ ریاضیات کاجوری نے لکھا ہے:

---

[1] Arnold: Legacy of Islam. p. 397

"ہمیں عربوں کے یہاں ایک قابل تعریف علمی سرگرمی نظر آتی ہے، خوش قسمتی سے انھیں علم دوست حکراں ملے تھے، جنھوں نے اپنی شاہانہ نوازشوں سے علمی تحقیقات کو ترقی دی، خلفاء کے دربار میں اہل علم اور سائنس دانوں کے لئے کتب خانے اور رصدگاہیں موجود رہتی تھیں، عرب (مسلمان) مصنفین کی کاوش فکر سے تصانیف کی ایک کثیر تعداد ظہور میں آئی، کہا جاتا ہے کہ عرب عالم تو ضرور تھے، مگر عبقری نہیں تھے، لیکن اب جو معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں، ان کے پیش نظر اس قسم کے تبصروں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، انھیں (مسلمان فضلاء کو) بہت سے قابل اعتناء کمالات کا شرف اولیت پہونچتا ہے، انھوں نے تیسرے درجہ کی مساواتوں کو ہندسی اعمال کے ذریعہ حل کیا، علم المثلثات کو ایک نمایاں حد تک مکمل کیا، ان کے علاوہ انھوں نے ریاضیات، طبیعیات اور فلکیات کے اندر بھی بے شمار اضافے کئے"[1]

دوسری جگہ یہی مصنف خصوصیت سے ان فلکیاتی مساعی کے بارے میں رقمطراز ہے:

"ان وجوہ کی بناپر (ان علوم کے اندر مسلمان ہیئت دانوں کے یہاں) بہت زیادہ ترقی ہوئی، ہیئتی جداول (زیجوں) اور آلات رصدیہ کی اصلاح کی گئی، رصدگاہیں تعمیر کی گئیں اور فلکیاتی مشاہدات کے پیہم سلسلوں کی رسم جاری کی گئی"[2]

خود فاضل مصنف نے مسلمان ہیئت دانوں کی فلکیاتی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا ہے:

"قرون وسطیٰ میں مسلمان اپنے زمانہ کے عظیم ترین ہیئت داں تھے، انھوں نے بطلیموسی

---

[1] F. Cajori: History of Mathematics. Ph. 111.112

[2] F. Cajori: History of Mathematics. Ph. 102

نظام ہیئت کے اساسی اصول تسلیم کر لیے تھے، وہ اعتدالین کی تصحیح سے واقف تھے

انھوں نے اوج شمس کی حرکت کو بھی معلوم کر لیا تھا، نیز منطقۃ البروج کے میلان (میں

کلی کی مقدار میں) تفاوت کا بھی پتہ چلا لیا تھا، انھوں نے اس مسئلہ پر بھی بحث و تمحیص کی تھی

کہ آیا زمین اپنے محور پر گھومتی ہے، مگر عموماً اس نظریہ کو مسترد کر دیا تھا، انھیں باقاعدہ اصولی

طور پر مشاہدات فلکی کرتے رہنے کی ضرورت کا پورے طور پر احساس تھا، عملی علم الہیئت میں وہ اپنے

زمانہ کے ہندو اور یورپی ہیئت دانوں سے کہیں آگے تھے"

ظاہر ہے ایک جاندار علمی نظام جو چودہ [۱۴] سو سال تک (بلکہ دو ہزار تین سو سال تک کیونکہ مسلمانوں

کی فلکی سرگرمیاں یونانی علم الہیئت کی تجدید تھیں) متمدن دنیا کے علمی حلقوں پر چھایا رہا ہے اور جس نے

قدم قدم پر اپنی نظریاتی و مشاہداتی پیچیدگیوں کا حل دریافت کیا ہے، راجہ جے سنگھ جیسے

محب فن ماہر فن کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ "باقی"

مقالات سلیمان (حصہ دوم)

مقالات سلیمان کی فنی اعتبار سے از سر نو ترتیب و اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے، یہ اس کا

دوسرا حصہ ہے، اس میں مولانا سید سلیمان ندوی جانشین شبلی کے علمی و تحقیقی مضامین ..... الندوہ

لکھنؤ اور معارف اعظم گڈھ سے اکٹھا کیے گئے ہیں جن میں ان کے معرکۃ الآراء تحقیقی مضامین مثلاً

ہندوستان میں علم حدیث، واقدی، کتب خانہ اسکندریہ، کیا مرزا بیدل عظیم آبادی نہ تھے' کے

علاوہ، جو ان کی تلاش و تحقیق کا شاہکار ہیں، ایک اہم مضمون اسلامی رصدخانوں پر بھی ہے، جو

اس موضوع پر اردو زبان میں سید صاحب کے قلم سے پہلا مضمون ہے۔

قیمت:- ۱۷-۰۰

امیر خسروؒ کی صوفیانہ شاعری

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

(۴)

امیر خسرو نے خواجگانِ چشت کے مسلک ہی کو اپنا کے اپنے دل کے اندر عشق کی آگ بھڑکائی، اُن کے مرشد کی نصیحت بھی تھی، کہ عشق انگیز کلام کہا کرو، جیسا کہ سیر الاولیار کے حوالے سے پہلے ذکر آیا ہے، (سیر الاولیار ص ۳۰۱) اس کو انھوں نے انتہائے کمال تک پہونچا دیا، وہ اپنی شاعری خصوصاً اپنی غزلوں میں تصوف کے رموز و نکات میں سب سے زیادہ زور عشق یعنی عشق الٰہی پر دیتے ہیں، جس کے سوز سے اُن کا سینہ بھی ایک آتشکدہ بنا رہا، اسی لئے اُن کے اشعار میں اس کی چنگاریاں بھڑکتی نظر آتی ہیں، اسی کی بدولت اُن کے مرشد نے ترک اللہ یعنی اللہ کا معشوق کہا ہے، ذیل میں ہم اُن کے ایسے زیادہ سے زیادہ اشعار اُن کے مطالب کے ساتھ پیش کرتے ہیں، تاکہ ان کے قلبی واردات کے ساتھ ان کے مسلکِ عشق کا صحیح اندازہ ہو جائے، اُن کے مطالب کی وضاحت کے بعد کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں،

(۱) میرے دل کے ویرانے میں تیرے عشق کا خزانہ پوشیدہ ہے، اسی شعلہ سے ہمیشہ میری روح میں آگ بھڑکتی رہتی ہے،

گنجِ عشقِ تو نہاں شد در دلِ ویرانِ ما   می زند زاں شعلہ دائم آتشے در جانِ ما

(۲) ہم اپنے کو تیرے ہی عشق کے غم سے ہم آہنگ بناتے ہیں، پنہاں طریقے سے تیرے ہی عشق سے کھیلا کرتے ہیں،

با غمِ عشقِ تو می سازیم ما　　　　با تو پنہاں عشق می بازیم ما

(۳) میرا دل عاشقی میں پریشان ہو کر پریشان تر ہوتا گیا، عشق میں دل جاتا رہا، تو میرا بدن مجبور ہو کر مجبور تر ہوتا گیا،

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا　　　　تنم از بیدلی بیچارہ شد بیچارہ تر بادا

(۴) عشق نے میری روح کی خاطر مجھ کو گرفت میں لے لیا ہے، اس کے بعد میری زبان بھی گرفت میں آگئی ہے،

عشق از پے جاں گرفت ما را　　　　حلقے بزباں گرفت ما را

(۵) عشق کی وجہ سے رو بھی نہیں سکتا، پھر کیا کہوں؟ یہ وہ بھری کشتی ہے جس کو بارش کی ضرورت نہیں،

بہ عشق از گریہ ہم ماندم چہ گویم　　　　پر از کشتی کہ باراں نیست او را

(۶) میں نے اپنی روح سے عاشقی کی پیوند کاری کر دی ہے، اب روح تو جا چکی لیکن وہ پیوند باقی ہے،

بجاں پیوند کردم عاشقی را　　　　کنوں جاں رفت و آں پیوند ماندہ است

(۷) عشق کے سینہ کے اندر روح کی گنجایش نہیں، اس میں غم کی بھی گنجایش نہیں، یہ بھی سی میں سے ہے،

نگنجد جاں درونِ سینۂ عشق　　　　نہ گنجد غم کہ او ہم زاں خویش است

(۸) تیرا عشق ایک بلا ہے مگر روح کو یہی پسند ہے، تیرے دہن سے ایک بار کی ہنسی پسند ہے

عشق تو بلائے جاں پسند ست — یک خندہ ازاں دہاں پسند ست

(۹) ہر گروہ کے لئے ایک دین ہے، مگر میرا دین عاشقی ہے، اور تمام چیزوں سے بے خبر رہنا میرا مسلک ہے،

ہر گروہے بگزیدند بہ عالم دینے — عاشقی دینِ من و بے خبری کیشِ من ست

(۱۰) عشق میری روح کے ساتھ ہی باہر نکلے گا، یہ نہ سمجھ کہ یہ تعویذ اور جادو کے ذریعہ سے نکلے گا،

عشق با جان ہم از سینہ بروں خواہد رفت — تا ندانی کہ بہ تعویذ و فسوں خواہد رفت

(۱۱) عشق میری روح میں آکر سما گیا ہے، اور میرے دل کے گھر کو خراب کر رکھا ہے میرے جیسے سوختہ دل کے لئے یہی جنون ہے،

عشق بنشست بجان خانۂ دل کرد خراب — کہ منِ سوختہ را بہ سراں سودا داشت

(۱۲) جب تک یہ بندہ زندہ رہے گا، غم عشق روح میں سمایا رہے گا، اور میرا سر اس سرو رواں یعنی معشوق کی راہ کی خاک رہے گا،

تا زید بندہ، غمِ عشق بجاں خواہد داشت — سر بہ خاک رہِ آں سرو رواں خواہد داشت

(۱۳) تیرے عشق کا بوجھ میرے دل کے لئے بہت خوشگوار ہے، میرا کام عشق کرنا ہے، اور یہ بہت اچھا کام ہے،

بارِ عشقت بر دلم بارے خوش ست — کارِ من عشق است و ایں کارے خوش ست

(۱۴) عاشقوں کے لئے وہی زخم اچھا ہے جس کو مرہم نہ ملے، بیدلوں کی پرنم آنکھ ہی اچھی ہوتی ہے،

عاشقاں را زخم بے مرہم خوش ست — بیدلاں را دیدۂ پرنم خوش ست

(۱۵) وصال کے بعد عشق کی لذت باقی نہیں رہتی، اہلِ عشق کے لئے جدائی ہی اچھی چیز ہے، ادنیٰ چیزوں کے عشق سے خسرو اپنے دماغ کو باز رکھ، سرِ خدائی کے ساتھ ہی عشق اچھا ہوتا ہے،

نیست لذت عشق را بعد از وصال — عشق باز آں را جدائی خوشتر است
عشقِ دوناں خسروا از سر بنہ — عشق بر سرِ خدائی خوش تر است

(۱۶) ساقی! شراب لا کیونکہ دل عشق سے ایسا جل گیا ہے کہ اس کباب کے جلنے کی بو گھر گھر پھیلی ہوئی ہے،

ساقی! بیار مے کہ چناں سوخت دل ز عشق — کز سوز ایں کباب ہمہ خانہ بو گرفت

(۱۷) جو آدمی عشق نہیں کرتا ہے، وہ آدمی نہیں پتھر ہے، اور جو آدمیت کے رنگ میں ہے، وہ یقیناً عشق کی تمام بلاؤں کو برداشت کرتا ہے،

کسے کہ عشق نبازد نہ آدمی سنگ است — بلائے عشق کشد ہر کہ آدمی رنگ است

(۱۸) اس خیال سے کیا نقش بنا سکتے ہو جو عشق کی کیفیت سے خالی ہے، ایسے آئینہ میں کیسے چہرہ دیکھ سکتے ہو، جو زنگ سے بھرا ہوا ہے،

چہ نقش بندی از اندیشہ ئے کہ بے عشق است؟ — چہ روے بینی از آئینہ ئے کہ در زنگ است؟

(۱۹) عشق اگرچہ بدبختی کا نشان ہے لیکن عاشق کے خیال میں یہی اس کے لئے ابدی سعادت کا ذریعہ ہے جو معشوق سے کوئی مراد چاہتا ہے، تو پھر یہ کیسے کہ وہ اپنی مراد کا عاشق ہے، اگرچہ عاشقوں کے لئے سیکڑوں دن اچھے ہوں لیکن اس کے لئے بہترین دن وہ ہے جب وہ کسی بُرے دن میں مبتلا ہو جائے،

عشق اگرچہ نشان بخت بد ست — نزدِ عاشق سعادتِ ابد ست
ہر کہ جوید مرادے از معشوق — گوئی او عاشق مراد خود ست

گرچہ صد روز نیک عاشق راست
بہترین روز اسیر روز بدست

(۲۰) تیرے عشق سے میرا دل خون، جگر فگار، اور روح برباد ہوگئی ہے، خدایا میری چشم خونیں کہاں تیرے چہرے پر پڑ گئی،

شد از عشقت دلم خون و جگر افگار و جاں برباد
کجا یارب مرا ایں چشم خونیں بر رخت افتاد

(۲۱) تم یہ خیال کرتے ہو کہ میں عاشقی میں دیوانہ ہو جاؤں گا، اگرچہ رسوائی کی وجہ سے دنیا میں افسانہ ہی کیوں نہ بن جاؤں، عشق بازی کا نعرہ خود پرستوں کے لئے بہت ہی زیبا ہے، جب میں عشق سے آشنا ہو جاؤں گا، تو اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاؤں گا،

چہ پنداری کہ من از عاشقی دیوانہ خواہم شد؟
ز رسوائی اگرچہ در جہاں افسانہ خواہم شد
زبس زیباست لافِ عشق بازی خود پرستاں را
چو با عشق آشنا گشتم ز خود بیگانہ خواہم شد

(۲۲) میں عشق میں مر مٹوں گا، کیونکہ اس وادی میں جہاں لاکھوں قافلے گم ہو گئے، ایک آدمی کیسے جانبر ہو سکتا ہے، مسکین عاشقوں کے لئے اُن کے مقصود کا دروازہ کیسے کھل سکتا ہے، جب کہ اُن کے معشوقوں کے دروازے کی خاک میں اُن کے بخت کے قفل کی کنجی گم ہوگئی ہے، آخر کب تیرا قدم ان مسکینوں کا حال دیکھنے کے لئے بڑھے گا، عاشق تو خاک ہو چکا ہے، اور اُس کی روح خاکدان میں گم ہوگئی ہے،

من اندر عشق خواہم مرد کے جاں می برد ہر کس؟
از آں وادی کہ در وے صد ہزاراں کارواں گم شد

درِ مقصود بر عشاقِ مسکیں باز کے گردد؟

چو در خاکِ درِ خوباں کلید بختِ شاں گم شد

قدم تا کے درریغ اختر کنوں ازحالِ مسکیناں

کہ عاشق خاک گشت و جانش اندر خاک داں گم شد

(۲۳) میں نے عشق اور عاشقوں کے مذہب میں نام پیدا کیا ہے، اگر میرے سر کو دار پر چڑھا دیا جائے تو میں منصور ہو جاؤں،

درعشق علم کردم و در مذہبِ عشاق

منصور شوم گر بہ سرِ دار برآرید

(۲۴) عشق کی بات اس تک اس طرح پہونچتی ہے، کہ معشوق کے ہاتھ سے سیکڑوں بلاؤں کے تیر مارے گئے، اگر تکلیف محسوس نہیں ہوتی،

آں راسخنِ عشق رسد کو بدل از دوست صد تیر بلا گنجد و آزار نہ گنجد

(۲۵) اگر کوئی عاشقی سے بیزار ہو تو اس کی عبادت بیکار ہو جائے گی،

کسے کز عاشقی بیزار باشد اگر طاعت کند بیکار باشد

(۲۶) عشق کی راہ میں کس طرح سلامتی کی گنجایش ہو سکتی ہے، اس راہ میں سونا اور کھانا پینا بھی محال ہے،

بہ راہِ عشق سلامت چگونہ در گنجد زہے محال کہ درشوقِ خواب و خور گنجد

(۲۷) عاشق اپنی روح کو سینہ سے اس لئے باہر کر دیتا ہے تاکہ تیرے غم کو روح کی طرح سینہ میں رکھ لے،

عاشق از سینہ جاں بر د تا غمت را بہ جاں دروں گیرد

(۲۸) اگرچہ عشق میں پختہ نہ ہوسکا، پھر بھی درد و الم سے جان سوختہ ہوگیا،

پختہ نہ شدم زعشق ہرچند جانِ سوختہ شد ز دردِ الم

جذبۂ عشق الہٰی سے دل کے اندر جو روحانی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، اُن کی عکاسی بھی امیر خسرو نے کی ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ خود اُن کے دل کے اندر عشقِ الہٰی کی جو جلوہ نمائیاں رہیں، ان ہی کو وہ مختلف پیرایے میں بیان کرتے رہے، تو یہ صحیح ہوگا،

(۲۹) کہتے ہیں میرے دل کے اندر درد بھرا ہوا ہے، دوستو، اس کا کوئی علاج نہیں میں ہوں اور تیرا درد ہے، اس لئے کہ تو خود میرے دل کا علاج نہیں چاہتا ہے،

مرا دردیست اندر دل کہ درمان نیستش یارا

من و دردت چو تو درماں نمی خواہی دلِ ما را

(۳۰) اے طبیب ہم کو اپنے حال پر چھوڑ دے، میرے درد کا علاج، اُس وقت تک مت ڈھونڈھ جب تک میرا معشوق اپنی مہربانی سے خود میرا علاج نہ کرے،

اے طبیب از ما گذر درمانِ دردِ ما مجوے،

تا کند جانانِ ما از لطفِ خود درمانِ ما

(۳۱) میرے دل کو غم کے ہاتھوں امان نہیں ہے، اسی لئے دنیا میں کوئی شادمانی ہے'

دلِ ما از دستِ غم اماں نیست نشانِ شادمانی در جہاں نیست

(۳۲) میری عقل کے لئے میرا عشق بلا تھا، لیکن میرے لئے یہ بلا ہے کہ اب عشق سے امان حاصل نہیں،

بلائے عقل عشقم بود اکنوں بلا ایں شد کہ از عشقم اماں نیست

(۳۳) دل کی آنکھ کو بلا میں ڈال دیا ہے، اگر اس کو ظاہر میں دیکھنا چاہتا ہے؛

تو دل اور آنکھ کے درمیان خون کی موجیں اٹھتی دکھائی دیتی گی،

دیدہ دل را در بلا افگندہ خواہی دیدہ فاش

درمیانِ دیدہ و دل موجِ خوں خواہد گذشت

(۳۴) خسرو ہے، سوز دل نہیں ہے، ذوق عالم سے بے خبر ہے آگ کھانے والے پرند کو دانہ کھانے میں کیا لذت مل سکتی ہے،

خسرو ست نہ سوز دل وز ذوق عالم بے خبر مرغ آتش خوارہ کے لذت شناسد دانہ را

(۳۵) سوختہ دل عاشق زندہ تو رہتا ہے لیکن اس کی روح دوسرے کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اس دنیا کی خبر اس کو نہیں رہتی ہی، اس کی دنیا دوسری ہوتی ہے،

عاشقِ سوختہ دل زندہ بجانِ دگر است

زیں جہانش چہ خبر کو بہ جہانِ دگر است

(۳۶) دل گرفتار عشق ہے، جگر خستہ ہو رہا ہے، اور بدن تکلیف میں اب تک ہے، معلوم نہیں اس مسکین کے سر پر کیا خرابیاں آئیں گی،

دل گرفتار و جگر خستہ و تنِ زار ہنوز تا چہا بر سر مسکین زبوں خواہد آمد

(۳۷) اگر میں کہوں کہ میرے دل کے اندر کیا پوشیدہ ہے تو تو خود کہہ دیگا اور جان لیگا کہ ہجر کا غم کیا ہوتا ہے،

گر بگویم کہ درونِ دلِ من پنہاں چیست خود بگوئی و بدانی کہ غم ہجراں چیست

(۳۸) اے میرے اللہ، میرے دل چاک کے اندر وہ ہنستا ہوا پھول یعنی معشوق کیا ہے؟ میرا چمکتا ہوا چاند (یعنی معشوق) میرے ہجر کی رات میں کیسا ہے؟

یارب اندر دلِ چاکم آں گل خنداں چو نست ماہِ تابانِ من اندر شبِ ہجراں چو نست

(۳۹) وہ وقت کیسا اچھا تھا کہ میرا دل بے غم تھا عشق کے وسوسہ سے خالی تھا،
اب دل نہیں رکھتا ہوں، تو غم جاناں کیا کھاؤں گا، اس سے پہلے غم تھا تو دل بھی تھا،

اے خوش آں وقت کہ مارا دلِ غم بود ست ۔۔۔ خاطر از وسوسۂ عشق فراہم بود ست
دل ندارم غم جاناں زچہ تنہا نم خورد ۔۔۔ پیش ازیں گرچہ غمے بود دلے ہم بود ست

(۴۰) میری آنکھوں میں نہ نیند ہے نہ میرے ہاتھ میں دل ہے، میری آنکھ اور میرا دل
دونوں تیرے رخسار کے آشفتہ اور مست ہیں،

نہ مرا خوابِ چشم نہ مرا دل در دست ۔۔۔ چشم و دل ہر دو برخسارِ تو آشفتہ ذست

(۴۱) سیکڑوں دل اس سیاہ رات کی طرح زلف کی وجہ سے جل گئے ہیں، اس طرح
جیسے رات کو چراغ جل رہے ہیں،
یہ دل شمشیرِ جفا سے پھٹ کر رہ گیا ہے، اس کے مژہ کے تیر سے چھلنی ہو گیا ہے،

صد دل اندر زلفِ شب گوں سوختہ است ۔۔۔ گو ئیا در شب چراغ افروختہ ست
دل بہ شمشیرِ جفا بشگافتہ است ۔۔۔ واں کہ از تیرِ مژہ بردوختہ ست

(۴۲) میرے دل کے درد کا علاج طبیب کے پاس نہیں، میرے ٹکڑے ٹکڑے
زخم کے لئے کوئی مرہم نہیں جانتا ہے،

دردِ دلم را طبیب چارہ ندانست ۔۔۔ مرہم ایں ریش پارہ پارہ ندانست

(۴۳) اے دلِ غمگیں مت ہو کہ معشوق مل ہی جائیگا، تشنہ لبوں کو آبِ حیات مل
ہی جاتا ہے،

اے دل غمگیں مباش کہ جاناں رسیدنی ست
در کامِ تشنہ چشمۂ حیواں رسیدنی است

(۴۴) وہ دل جو جسم کے اندر بری خواہشوں سے گھرا ہوا ہے، وہ دل نہیں ہے، وہ دل کیا جس کے اندر اصل معشوق پر نقاب پڑا ہوا ہو۔

ہر دل کہ در تنے بہ ہوائے مقیداست دل نیست کہ شاہدے اندر نقابہ است

(۴۵) میرا خون اگر میرے رخسار کا ناجرا ہو جائے تو اس کا مطالعہ لطف سے کرنا چاہئے، کہ یہ میری وفا کا دیباچہ ہے،

زخونِ دل کہ برخسار ماجرائے منست بخواں بلطف کہ دیباچۂ وفائے منست

(۴۶) میرا دل میرے عشق کا محرم نہیں ہے، وہ عشق سے بے گانہ ہے، ہمدم نہیں ہے،

مرا بعشق دلِ خویش نیز محرم نیست کہ می زند دمِ بیگانگی و ہمدم نیست

(۴۷) ایسا دل کہاں ہے کہ اس کے غم کو پوشیدہ رکھتا، وہ صبر کرتا اور اس کے اندر سمائے رہتا،

کجاست دل کہ غمت را نہاں تواند داشت بہ صبر کوشد و خود را بداں تواند داشت

(۴۸) آجا کہ تیرے بغیر میرا دل خون میں غرق ہے، اب مجھ میں طاقت باقی نہیں رہی اور نیند بھی حرام ہے،

بیا کہ بے تو دل خستہ غرقِ خونابست مرا نہ طاقتِ صبر نہ ذرہ خوابست

(۴۹) دل نے اس کے چہرہ کے کعبہ کو طلب کیا اور اس کی زلفِ پریشاں کے حلقہ میں پھنس کر رہ گیا،

دل طلبِ کعبۂ روئے تو کرد حلقۂ آں زلف پریشاں کرد

(۵۰) تیرے عشق میں میرا دل خون، جگر زخمی اور روح برباد ہو کر رہی، اے اللہ میری یہ خونیں آنکھیں کہاں تیرے رخ پر جا پڑیں،

شد از عشقت دلم خون و جگر افگار و جاں برباد

کجا یارب مرا ایں چشم خونیں بر رخت افتاد

(۵۱) وہ دل کس کام کا ہے جس میں تیرا گھر نہ ہو، اور وہ زلف کس لئے دل سنوارے

میں تیرا گھر نہ ہو،

آں دل بہ چہ کار آید کاں خانۂ تو نبود　　واں موئے چہ بند و دل گر خانۂ تو نبود

(۵۲) میں عشق کا جلایا ہوا ہوں، مگر اے دل تو میری سانس کی سانس ہے، اس جلی

ئی چیز سے آخر آگ بھڑک اٹھے گی،

من سوختۂ عشقم تو دم و میم اے دل

ایں سوختہ را آخر آتش ہم ازیں خیزد

(۵۳) عاشق کا دل اپنے معشوق کا شیدائی کیوں نہ ہو، وہ اپنے اس عشق سے

نیا میں رسوا نہ ہوگا،

دل عاشق چرا شیدا نباشد　　بعشق اندر جہاں رسوا نباشد

(۵۴) میرے دل کو میری روح سے صبر حاصل نہیں ہو سکتا، اور اگر روح سے

صبر ہو جائے تو یہ صبر در اصل روح سے نہ ہوگا،

دل ما را شکیب از جاں نباشد　　ور از جاں باشد از جاں نباشد

(۵۵) تیرے ایسا دلدار نہ ہو تو اہل عشق کے نزدیک ایسے دل کی کوئی

قدر نہیں،

دلے کو چوں تو دلدارے ندارد　　بر اہل عشق مقدارے ندارد

(۵۶) اے اہل دل پہلے اپنی روح سے اپنی روح کو آزاد کر لے، پھر اس دل لینے والے

کے رُخ پر نظر ڈال

اے اہلِ دل نخست ز ترک جاں کنند   واں گہ نظارۂ رُخ آں دل ستاں کنید

اور پھر دل پر پوری ایک غزل کہدی ہے،

رستہ بودم چو بن چند گہ از زاری دل   از نمکدان تو شد تازہ جگر خواری دل

اے میرے چاند! کچھ دیر کے لئے دل کی تکلیف سے آزاد ہو گیا تھا لیکن تیرے نمک چھڑکنے سے میرے دل کی جگر خواری تازہ ہو گئی

تو ہمی آئی و صد غارت جاں از ہر سو   در چنیں فتنہ کجا صبر کند یاری دل

تو میرے پاس آتا ہے لیکن ہر طرف سے میری روح کی سیکڑوں قسم کی غارت گری ہوتی ہے ایسے فتنہ سے دل کو صبر کہاں سے آئے،

ہر کسے با دل آزاد ازیں شہر گذشت   من گرفتار بماندم بہ گرفتاری دل

اس آبادی سے ہر شخص آزاد دل لے کر گذر گیا لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں گرفتار رہا

دل گنہ کرد کہ عاشق شد و نزد خوباں   نہ شود عفو بہ عمر گنہ گاری دل

دل نے یہ گناہ کیا کہ یہ عاشق ہو گیا، مگر معشوقوں کے نزدیک دل کی گناہگاری کی معافی تمام عمر نہیں کی جاتی ہے،

وقتے افگن نظرے جانبِ من اے خورشید   کہ سیہ روے بماندم ز شب تاری دل

اے میرے آفتاب یعنی معشوق میری طرف بھی کچھ دیر کے لئے نظر کر کہ میں اپنے دل کی رات کی تاریکی کی وجہ سے سیہ رو ہو رہا ہوں،

وقت آنست کہ دست دہی اے دوست بلطف   کہ فرو رفتم در گلِ ز گراں باری دل

اب وقت آگیا ہے کہ اے دوست مجھ کو سہارا دے کیونکہ میں اپنے دل کی گراں باری

کی وجہ سے مٹی میں مل گیا ہوں،

عشقتم فگند میانِ من و دل بیزاری   بر رُخ از خون نگر آنیک خطابہ زاری دل

تیرے عشق نے میرے اور میرے دل کے درمیان بے زاری پیدا کر دی ہے، میرے رُخ پر خون دیکھ کہ یہی بیزاریِ دل کا نشان ہے،

می شود زلف تو آسیب نسیمے درہم   بس کہ بے تاب شد از زحمت بیاری دل

تیری زلف نسیم کے آسیب سے درہم ہو جاتی ہے، اور یہ نسیم میرے دل کی تکلیف کی زیادتی کی وجہ سے بے قرار ہو گئی،

عشق گوید کہ کار دل بیدار بود   بہرہ ام خواب اجل زبیداری دل

عشق کہتا ہے کہ دل کا اصلی کام بیدار رہنا ہے لیکن میں اس بیداریِ دل سے موت کی نیند سے بہرہ مند ہوا،

اوپر کے اشعار کا لُبِ لباب یہ ہے کہ عشق جب ہو تو دل میں ایسا درد پیدا ہو جائے کہ پھر اس کا کوئی علاج نہ ہو، دل اور آنکھ کے درمیان خون کی ندیاں بہتی رہیں، دنیا میں اس کے لئے شادمانی نہ ہو، ایسے سوختہ دل عاشق کی روح دوسروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے مگر اسی سوزِ دل سے اس کو روحانی مسرتیں حاصل ہوتی رہتی ہیں،

عشق پر بھی پوری ایک غزل کہدی ہے، ذرا پہلے اس کے اشعار سے ناظرین لطف اندوز ہوں

اے زسودائے تو در دل رونقِ بازارِ عشق

مرہم جانہاست از یاد لبت آزارِ عشق

دیرکہ می رفتی بہ پیشِ عاشقاں غمزہ زناں

دیگر آں بسمل شدند و من شدم مردارِ عشق

من بداں ندرم کہ گر میرم بسوزم منکری
بیں کہ چوں من چند کس مردست دربازارِ عشق

تیغ خود بگذار تا دامِ تو بگذارم ازانک
دامِ معشوق است سر برگردنِ عیارِ عشق

از دعایت من چو اے زاہد نگشتم نیک بخت
تو بیا بارے چو من بدبخت شو درکارِ عشق

آں کہ بیداریش بہ خوابِ خوش باشاہد است
شاہدش داں آں کہ حق است ایں چنیں بیدار عشق

خسروا باجان و دل ہم قصۂ جاناں بگوے
زاں کہ نتواں گفت با نامحرماں اسرارِ عشق

اس غزل میں یہ پیام ہے کہ جنونِ عشق الٰہی سے عشق میں رونق پیدا ہوتی
کا آزار روح کا مرہم ہے، عشق کی راہ میں بسمل بننے کے بجائے فنا ہوجانا بہتر ہے
میں مرجانا عشق کی کامرانی ہے، عشق کی کسوٹی یہ ہے کہ اس پر معشوق ہر حال
زاہد کی نیک بختی اس میں ہے کہ وہ عشق کی راہ میں بدبخت ہوجائے، معشو
وصل کی نیند کے بجائے عشق کی بیداری زیادہ بہتر ہے، عشق کا راز یہ ہے کہ اس
نامحرموں حتی کہ روح اور دل سے بھی نہ بیان کئے جائیں،

اوپر امیر خسرو کے جتنے اشعار عشق پر نقل کئے گئے ہیں، ان سے ان کی روحا
اندازہ کیا جاسکتا ہے، اُن کے نزدیک عشق یعنی عشقِ الٰہی ایسا ہو جو آگ کی ط
میں شعلہ زن ہو، غمِ عشق نئی زندگی پر چھایا ہو، زندگی کی ساری لذت عش

ں میں محسوس ہو، اس میں جتنی پریشانیاں بڑھتی ہیں، وہ اور بھی پُرکیف ہوتی جاتی ہیں، شق کے ہاتھوں روح گرفتار رہے، اور زبان گونگی بن کر رہ جائے، عشق کے آزار میں آنکھیں ٹکیا رہیں، لیکن اُن سے آنسو ٹپکنے نہ پائیں عشق ایسا ہو کہ اس میں روح یا غم سمانے کی کوشش کرے، تو ان کی گنجایش نہ ہو، عشق ہی دین بن کر رہے، عشق جنون کی حد تک ہو، عشق میں وصل کی فکر نہ ہو، ہجر ہی میں عشق کی لذت ہے، عشق میں دل خونبار، جگر گار اور روح برباد ہو، یہی عشق کی کامرانی ہے، عشق کا راز اس میں ہے کہ عاشق خاک ور اس کی روح خاکدان بن جائے، غمِ عشق میں روح پہ بے خبری چھائی ہوئی ہو، گر دل پر زخم کاری لگے، تو اس پر مرہم رکھنے کی فکر نہ ہو، بلکہ دل کباب کی طرح جلتا رہے، اگر دل میں عشق نہیں تو وہ آدمی کا دل نہیں بلکہ پتھر ہے، عشق سعادت ابدی کا ذریعہ ہے، عشق کسی مطلب برآری کی خاطر نہ ہو، عشق میں معشوق سے مراد کا طلبگار ہونا گویا مراد سے عشق کرنا ہے، جو عشق سے آشنا ہوگا، وہ اپنے سے بیگانہ رہیگا، عشق کی اصلی کامیابی منصور بن کر دار پر چڑھ جانا ہے، اگر کوئی عشق سے بیزار ہے تو اس کی ساری عبادت و ریاضت بھی بیکار ہے، عشق میں وہی پختہ ہوگا، جو سوختہ جان ہوگا، عشق کا راز ایسا پوشیدہ رہے کہ اس کی خبر روح اور دل کو بھی نہ ہو،

عشق کی نیرنگیاں دکھانے میں خسرو کبھی پسپا ہو کر ناامید ہو جاتے ہیں، تو دردِ عشق کا علاج نہیں چاہتے، بلکہ سوزِ عشق میں مرجانا عشق کی کامرانی سمجھتے ہیں،

.... اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ عشق کی اصلی کامیابی یہ ہے کہ منصور ہو کر دار پر چڑھ جائے تو وہ گویا وحدت الوجود کے قائل ہو کر وحدت الوجود کی ترویج کرتے ہیں، ان کے یہاں عشق کی جو سرشاری ہے، اسی کا نام وحدت الوجود ہے جس کو انھوں نے

من بداں نذرم کہ گر میرم بہ سوزم صد گری
بیں کہ چوں من چند کس مردست در بازارِ عشق

تیغ خود بگذارتا دامِ تو بگذارم ازانک
دامِ معشوق است سر برگردنِ عیارِ عشق

از دعایت من چو اے زاہد نہ گشتم نیک بخت
تو بیا بارے چو من بدبخت شو درکارِ عشق

آں کہ بیداریش بہ خواب خوش با شاہد است
شاہدش داں آں کہ حق است ایں چنیں بیدارِ عشق

خسروا با جان و دل ہم قصۂ جاناں مگوے
زاں کہ نتواں گفت با نا محرماں اسرارِ عشق

اس غزل میں یہ پیام ہے کہ جنونِ عشقِ الٰہی سے عشق میں رونق پیدا ہوتی ہے، عشق کا آزار روح کا مرہم ہے، عشق کی راہ میں بسل بننے کے بجائے فنا ہو جانا بہتر ہے، سوزِ عشق میں مر جانا عشق کی کامرانی ہے، عشق کی کسوٹی یہ ہے کہ اس پر معشوق ہر حال میں چھا جائے، زاہد کی نیک بختی اس میں ہے کہ وہ عشق کی راہ میں بدبخت ہو جائے، معشوق سے وصل کی نیند کے بجائے عشق کی بیداری زیادہ بہتر ہے، عشق کا راز یہ ہے کہ اس کے اسرار نا محرموں حتیٰ کہ روح اور دل سے بھی نہ بیان کئے جائیں،

اوپر امیر خسرو کے جتنے اشعار عشق پر نقل کئے گئے ہیں، ان سے ان کی روحانیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اُن کے نزدیک عشق یعنی عشقِ الٰہی ایسا ہو جو آگ کی طرح روح میں شعلہ زن ہو، غمِ عشق نئی زندگی پر چھایا ہو، زندگی کی ساری لذت عشق کے کھیل

ں میں محسوس ہو، اس میں جتنی پریشانیاں بڑھتی ہیں، وہ اور بھی پُرکیف ہوتی جاتی ہیں، شق کے ہاتھوں روح گرفتار رہے، اور زبان گونگی بن کر رہ جائے، عشق کے آزار میں آنکھیں شکبار رہیں، لیکن اُن سے آنسو ٹپکنے نہ پائیں عشق ایسا ہو کہ اس میں روح یا غم سمانے کی کوشش کرے، تو ان کی گنجایش نہ ہو، عشق ہی دین بن کر رہے، عشق جنون کی حد تک ہو، عشق میں وصل کی فکر نہ ہو، ہجر ہی میں عشق کی لذت ہے، عشق میں دل خونبار، جگر فگار اور روح برباد ہو، یہی عشق کی کامرانی ہے، عشق کا راز اس میں ہے کہ عاشق خاک اور اس کی روح خاکدان بن جائے، غم عشق میں روح پر بے خبری چھائی ہوتی ہو، اگر دل پر زخم کاری لگے، تو اس پر مرہم رکھنے کی فکر نہ ہو، بلکہ دل کباب کی طرح جلتا رہے، اگر دل میں عشق نہیں تو وہ آدمی کا دل نہیں بلکہ پتھر ہے، عشق سعادت ابدی کا ذریعہ ہے، عشق کسی مطلب برآری کی خاطر نہ ہو، عشق میں معشوق سے مراد کا طلبگار ہونا گویا مراد سے عشق کرنا ہے، جو عشق سے آشنا ہوگا، وہ اپنے سے بیگانہ رہیگا، عشق کی اصلی کامیابی منصور بن کر دار پر چڑھ جانا ہے، اگر کوئی عشق سے بیزار ہے تو اس کی ساری عبادت و ریاضت بھی بیکار ہے، عشق میں وہی پختہ ہوگا، جو سوختہ جان ہوگا، عشق کا راز ایسا پوشیدہ رہے کہ اس کی خبر روح اور دل کو بھی نہ ہو،

عشق کی نیرنگیاں دکھانے میں خسرو کبھی یاس ہو کر ناامید ہو جاتے ہیں، تو درد عشق کا علاج نہیں چاہتے، بلکہ سوز عشق میں مرجانا عشق کی کامرانی سمجھتے ہیں، .... اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ عشق کی اصلی کامیابی یہ ہے کہ منصور ہو کر دار پر چڑھ جائے تو وہ گویا وحدت الوجود کے قائل ہو کر وحدت الوجود کی ترویج کرتے ہیں، اُن کے یہاں عشق کی جو سرشاری ہے، اسی کا نام وحدت الوجود ہے جس کو انھوں نے

من بداں نذرم کہ گر میرم بہ سوزم بنگری
بیں کہ چوں من چند کس مردست در بازارِ عشق

تیغ خود بگذار تا دامِ تو بگذارم ازانک
دام معشوق است سر بر گردنِ عیارِ عشق

از دعایت من چرا اے زاہد نگشتم نیک بخت
تو بیا بارے چو من بدبخت شو درکارِ عشق

آں کہ بیداریش بہ خواب خوش باشاہد است
شاہدش داں آں کہ حق است ایں چنیں بیدارِ عشق

خسروا با جان و دل ہم قصۂ جاناں مگوے
زاں کہ نتواں گفت با نامحرماں اسرارِ عشق

اس غزل میں یہ پیام ہے کہ جنونِ عشق الٰہی سے عشق میں رونق پیدا ہوتی ہے عشق کا آزار روح کا مرہم ہے، عشق کی راہ میں بسمل بننے کے بجائے فنا ہو جانا بہتر ہے، سوزِ عشق میں مرجانا عشق کی کامرانی ہے، عشق کی کسوٹی یہ ہے کہ اس پر معشوق ہر حال میں چھایا رہے زاہد کی نیک بختی اس میں ہے کہ وہ عشق کی راہ میں بدبخت ہو جائے معشوق سے وصل کی نیند کے بجائے عشق کی بیداری زیادہ بہتر ہے، عشق کا راز یہ ہے کہ اس کے اسرار نامحرموں حتی کہ روح اور دل سے بھی نہ بیان کئے جائیں،

اوپر امیر خسرو کے جتنے اشعار عشق پر نقل کئے گئے ہیں، ان سے ان کی روحانیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اُن کے نزدیک عشق یعنی عشقِ الٰہی ایسا ہو جو آگ کی طرح روح میں شعلہ زن ہو، غمِ عشق نئی زندگی پر چھایا ہو، زندگی کی ساری لذت عشق کے کھیل

)یں محسوس ہو، اس یں جتنی پریشانیاں بڑھتی ہیں، وہ اور بھی پُرکیف ہوتی جاتی ہیں'
ق کے ہاتھوں روح گرفتار رہے، اور زبان گونگی بن کر رہ جائے، عشق کے آزار یں آنکھیں
لمبا رہیں، لیکن اُن سے آنسو ٹپکنے نہ پائیں عشق ایسا ہو کہ اس یں روح یا غم سمانے
لی کوشش کرے، تو ان کی گنجایش نہ ہو، عشق ہی دین بن کر رہے، عشق جنون کی حد تک ہو،
شق یں وصل کی فکر نہ ہو، ہجر ہی یں عشق کی لذت ہے، عشق یں دل خونبار، جگر
گار، اور روح برباد ہو، یہی عشق کی کامرانی ہے، عشق کا راز اس یں ہے کہ عاشق خاک
ور اس کی روح خاکدان بن جائے، غم عشق یں روح پر بے خبری چھائی ہوئی ہو،
ر دل پر زخم کاری لگے، تو اس پر مرہم رکھنے کی فکر نہ ہو، بلکہ دل کباب کی طرح
جلتا رہے، اگر دل یں عشق نہیں تو وہ آدمی کا دل نہیں بلکہ پتھر ہے، عشق سعادت
ابدی کا ذریعہ ہے، عشق کسی مطلب برآری کی خاطر نہ ہو، عشق یں معشوق سے مراد کا
طلبگار ہونا گویا مراد سے عشق کرنا ہے، جو عشق سے آشنا ہوگا، وہ اپنے سے بے گانہ رہیگا،
عشق کی اصلی کامیابی منصور بن کر دار پر چڑھ جانا ہے، اگر کوئی عشق سے بیزار ہے تو
اس کی ساری عبادت و ریاضت بھی بیکار ہے، عشق یں وہی پختہ ہوگا، جو سوختہ جان ہوگا،
عشق کا راز ایسا پوشیدہ رہے کہ اس کی خبر روح اور دل کو بھی نہ ہو،

عشق کی نیرنگیاں دکھانے یں خسرو کبھی ایسا ہو کرنا امید ہو جاتے ہیں، تو درد عشق
کا علاج نہیں چاہتے، بلکہ سوز عشق یں مرجانا عشق کی کامرانی سمجھتے ہیں'

.........اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ عشق کی اصلی کامیابی یہ ہے کہ
منصور ہو کر دار پر چڑھ جائے تو وہ گویا وحدت الوجود کے قائل ہو کر وحدت الوجود کی ترویج
کرتے ہیں، اُن کے یہاں عشق کی جو سرشاری ہے، اسی کا نام وحدت الوجود ہے جس کو انھوں نے

فلسفیانہ انداز کے بجائے عارفانہ اور شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے، پھر اسی سرشارانہ رنگ میں یہ بھی کہہ اٹھے ہیں،

ع :- کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست

اس کو ان کی بیگانگی مذہب محمول نہیں کیا جا سکتا ہے، در اصل اُن کے عشق الٰہی کا ایک نعرۂ مستانہ ہے، اُن کے یہاں عشق کا وہی تصور اور تخیل ہے، جو خواجگان چشت کے یہاں رہا، گذشتہ صفحات میں حضرت فریدالدین گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے جو تصورات عشق سے ان کا ذکر آیا ہے، ان بزرگوں نے اجمالی حیثیت سے جو کچھ کہا تھا، اسی کو امیر خسرو اپنے اشعار میں دلکش، پُرکیف اور موثر انداز میں پیش کرتے رہے،

امیر خسرو کے یہاں عشق و عقل کی آویزش بھی دکھائی دیتی ہے لیکن اُن کے یہاں عشق کی سرشاری کی اتنی فراوانی ہے، کہ عقل اُن کے عشق کے پنجے میں دب کر رہ گئی ہے، وہ ہر حال میں عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ

دلے دارم کہ ماندہ ست از پئے عشق خرد جوئی برائے آن نماندہ ست

میں ایسا دل رکھتا ہوں جو عشق کے پیچھے سرگرداں ہے، اب اس کے لئے عقل کی تلاش باقی نہیں رہ گئی ہے،

اسی بات کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں،

ملامت می کند مارا خرد در عشق ورزیدن

دلِ عاشق کجا قولِ خرد را معتبر گیرد ؟

ہم کو عشق کرنے پر خرد ملامت کرتی ہے، مگر عاشق کے دل میں عقل کی بات کب معتبر ہوتی ہے،

وہ عشق کو ایک سلطان قرار دیتے ہیں، اور اپنے کو اس کا غلام سمجھتے ہیں، اور اس لامی میں عقل کو کوئی درجہ دینا پسند نہیں کرتے ہیں،

من مسکیں غلامِ عشقم اے عقل از سرم بگذر
کہ ایں سلطاں ترا درکارِ خود محرم نمی بیند

میں عشق کا ایک ادنیٰ غلام ہوں، اے عقل میرے سر سے دور ہوجا عشق ایسا سلطان ہے کہ وہ اپنے کام میں مجھ کو محرم کی حیثیت سے دیکھنا نہیں چاہتا ہے،

وہ عشق کی مجلسِ خاص میں عقل کو اجنبی اور غیر سمجھتے ہیں، اس لئے کہتے ہیں کہ

در دل چو بود عشق نہ گنجد خرد و عقل		درمجلس خاصِ ملک اغیار نہ گنجد

جب دل میں عشق ہو تو اس میں خرد اور عقل کی گنجایش نہیں، اس مجلسِ خاص میں اغیار کا گذر نہیں۔

وہ عشقِ الٰہی کی سرشاری و شادمانی میں عقل کی مطلق پروا نہیں کرتے،

خوشم با عشقِ تو بے عقل و بے جاں		نہ گنجد درمیاں بیگانہ لے چند

میں تیرے عشق میں خوش ہوں جس کے بعد بے عقل اور بے روح ہو کر رہ گیا ہوں اب میرے عشق کے درمیان کسی یعنی عقل جیسی بیگانہ کی گنجایش نہیں۔

وہ اس کے قائل تھے کہ عاقلوں کے پاس دل نہیں ہوتا، دماغ ہوتا ہے، مگر عشقِ الٰہی میں مبتلا رہنے والے دماغ کی حکمرانی پسند نہیں کرتے،

دلِ دیوانگاں عاقل نہ گردد		سرِ شوریدگاں ساماں نہ خواہد

عاقل دیوانوں کی طرح دل نہیں رکھتا ہے، شوریدہ سر والے کوئی سروساماں نہیں چاہتے،

وہ عشق کو ایک پہاڑ تصور کرتے ہیں، اس کے مقابلہ میں عقل کو محض پرکاہ قرار دیتے ہیں، اس لئے کہتے ہیں،

عشق راآں کوسپر سازد زعقل دفع کوہے را بہ کاہے می کند

کون ہے جو عشق کا سپر عقل کو بنا سکتا ہے، پہاڑ کی مدافعت پرکاہ سے کیسے کی جا سکتی ہے،

وہ تو عشق الٰہی کی سرشاری میں نہ صرف دماغ، عقل، بلکہ دل سے بھی بیگانہ ہو کر رہنا پسند کرتے ہیں،

عشق آمد و دل ز دستِ ما برد تدبیر عقل مبتلا برد

(عشق ہوا، دل میرے ہاتھ سے جاتا رہا، عقل کی ساری تدبیریں بھی جاتی رہیں)

عشق و عقل کی آویزش مشہور ہے، فلسفہ کا سارا زور عقل پر صرف ہوتا ہے، روحانیات اور تصوف میں ساری کرشمہ سازیاں اور جلوہ آرائیاں عشق کی ہیں، فلسفیوں کے یہاں عقل اصل چیز ہوتی ہے، اُن کے نزدیک یہی تمام موجودات پر محیط ہے، ان کا تو یہ بھی خیال ہے کہ خدا بھی تعقل محض ہے، اور یہ آپ ہی اپنا معروض ہے، پھر موجودہ دور کی ساری سائنسی تحقیقات عقل ہی کے ماتحت ہو رہی ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی عقل کے ذریعہ سے زہرہ، چاند، اور حتی کہ سورج تک پہونچ سکتے ہیں لیکن صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے کہ کائنات کی ساری چیزوں کی تسخیر عقل کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے، انسان ہوا میں اڑ سکتا ہے، پانی کو قابو میں لا سکتا ہے، آفتاب اور ماہتاب تک پہونچ سکتا ہے، مگر زمان و مکان کے کچھ ایسے اسرار بھی ہیں جن کے رموز اور حقائق تک پہنچنے میں عقل کی پرپرواز قاصر ہے، انسان اپنی عقل سے مٹی، ہوا، پانی، اور آگ کی ساری خصوصیتیں اور صفتیں اپنی عقل سے

معلوم کرسکتا ہے مگر اس کی عقل یہ نہیں بتا سکتی ہے کہ آخر یہ اربعہ عناصر کس اصلی مادہ سے نکلے ہیں،
اسی لئے خضر راہ، گلزار خلیل، شعلۂ طور، ید بیضا، دم عیسیٰ اور نور محمدی کا احاطہ کرنا عقل و فہم کے لئے ممکن نہیں، انبیا کے ذریعہ سے دنیا میں جو روحانی اور مذہبی انقلاب پیدا ہوا، وہ بھی عقل کی سمجھ میں نہیں آسکتا، یا نالۂ شبگیر اور فغانِ صبح گاہی سے باطن کے جو دروازے کھلتے رہے ہیں، وہ بھی عقل کے ادراک سے بالاتر ہے، لیکن یہ ساری باتیں عشق کے ذریعہ سے سمجھ میں آتی رہی ہیں اور آتی رہیں گی، جہاں عقل تشکیک اور تذبذب پیدا کرتی ہے، وہاں عشق یقین محکم پیدا کرتا رہا ہے،

عشق اور عقل کی بحث نظریاتی، تاثراتی اور تجرباتی انداز میں ہوتی رہی ہے، امیر خسرو کے یہاں اگر یہ بحث نظریاتی اور تاثراتی رنگ میں ہے تو اس پر ان کا تجرباتی رنگ بھی غالب رہا ہے انکے پرسوز سینہ میں جو کچھ ذاتی طور پر گزرتا رہا، اس کو وہ اپنے اشعار میں منتقل کرتے رہے، اور یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے، کہ عشق، دل اور عقل کے متعلق انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے سوز دل کی چنگاریاں بھی ہیں، جو ان کے مرشد کی صحبت میں اور بھی بھڑک اٹھتی تھیں،

امیر خسرو کے یہاں عشق الٰہی کی شیریں دیوانگی ضرور رہی، لیکن کسی حال میں شریعت کا دامن چھوڑنا پسند نہیں کیا، خواجگان چشت کا مسلک یہ رہا کہ وجد و حال، ذوق و کیف اور استغراق و تحیر کی کیفیات کیوں نہ ہوں، چاہے انوار الٰہی اور احوال معرفت سے عالم ملکوت و جبروت ہی کیوں نہ تسخیر ہو جائے، کسی حال میں بھی اتباع سنت اور احترام شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو۔ خود خواجہ نظام الدین اولیا کی بھی یہی تعلیم رہی کہ "آنچہ نامشروع است ناپسندیدہ است"، اپنے خواجگان کی طرح یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی مقام سے گرے تو شرع میں گرے اور اگر یہاں سے گر گیا، تو پھر اس کا کوئی ٹھکانا نہیں (فوائد الفوائد ص ۲۴۰)، اسی لئے امیر خسرو نے

بھی اپنی شاعری میں اسی بات کی ترویج کی کہ

ع، بے روشِ مصطفیٰ راہ بر افلاک نیست

ع، شرع اگر عین نباشد شر ست

تصوف انسان کی فضیلت پر بڑا زور دیتا ہے، اس لئے امیر خسرو کی شاعری میں اس فضیلت کو گوناگوں طریقہ سے بیان کیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ انسان گوہر پاک اور زیور خاک ہے وہ نو چرخ سے چھن کر دُرِّ پاک ہو کر نمودار ہوا ہے، وہ جانِ جہان ہے، وہ خود سارا عالم ہے، سارا جہان اس کے وجود کا بار برداشت نہیں کر سکتا ہے، وہ ہر دو سرا کا بادشاہ ہے، گنج خدا کی کلید ہے، وہ لڑکوں کا محض کھیل نہیں ہے، اس میں رحمان کی صورت دکھائی دیتی ہے، اگر اس کی غفلتوں سے اس کی انسانیت کا آئینہ زنگ آلود ہو جائے، تو یہ کائنات کے لئے بڑی مصیبت ہے

اے ز ازل گوہر پاک آمدہ　　گوہر تو زیور خاک آمدہ

چنبر نہ چرخ بسے بیخت خاک　　تا تو بروں آمدی اے دُرِّ پاک

جان جہاں ہمہ عالم توئی　　وآنچہ نگنجد بہ جہان ہم توئی

تو شہ اقلیم ہر دو سرائے　　نہ فلکے تختِ تو شد چار پائے

گنج خدا را تو کلید آمدی　　نہ از پئے بازیچہ پدید آمدی

چرخ کہ از گوہر احسانت ساخت　　آئینہ صورت رحمانت ساخت

آئینہ زیں گونہ کہ داری بہ جنگ　　آہ ہزار آہ کہ داری بہ زنگ

اس سے بڑھ کر انسان کیلئے اور کون سا دلنواز پیام ہو سکتا ہے، تصوف اسی قسم کی انسانیت کو سنوارا کرتا ہے، اور جب انسان اس قسم کی سنوری ہوئی انسانیت کا حامل ہو جاتا ہے تو خسرو کے خیال کے مطابق وہ کہہ اٹھتا ہے،

نے گلم نے بلبلم نے شمع و نے پروانہ ام
عاشقِ حسنِ خودم بر حسنِ خود دیوانہ ام

تصوف باطنی تعلیمات کے ساتھ صوری اخلاق کی درستگی پر بھی زور دیتا ہے اس لئے امیر خسرو کے یہاں اخلاقی تعلیمات بھی ہیں، وہ اپنے دور کے ہر طبقہ کے لوگوں کے اخلاق حسنہ کے خواہاں رہے، اسی لئے ان کے اخلاق کو درست کرنے کے دردمندانہ پیامات دیتے رہتے، مثلاً، اپنے زمانہ کے حکمرانوں کو مخاطب کرکے کہا کہ وہ اپنے اللہ اور رسول کے احکام کے فرماں بردار ہوں، ان کی ہر رائے محکم ہو اور اس پر سختی سے عمل کریں، ہر کام وقت پر عزم و سکون کے ساتھ کریں، غفلت کو راہ نہ دیں، انصاف سے کام لیں، تاکہ چھوٹا بڑا کوئی بھی ظلم کی آواز نہ سنے، خواص و عوام کی آسودگی کا خیال رکھیں تاکہ بیابان کے چلنے والے اور محل کے رہنے والے دونوں یکساں طور پر خوش رہیں، مثنوی نہ سپہر میں کہتے ہیں (ص ۲۹-۲۲۸)

پنج بنا شرط جہاں داریست / آید از دکش ز خدایا ریست
اولش آنست کہ در کار تخت / رائے بود محکم و تدبیر سخت
کارگذاراں بشہ کام گار / باز نمایند سر انجام کار
سیومش آنست کہ در حزم خویش / دور کند پردۂ غفلت ز پیش
آنکہ سر خویش ندارد نگاہ / کے سر غیری رہد ش در پناہ
چارمش آں شد کہ بانصاف و داد / تازہ کند گلشنِ دین را سواد
تاکہ دمہ ز اہل خراش و خروش / نشنود آواز تظلم بہ گوش
پنجمش آں شد کہ نماید مدام / جہد در آسودگی خاص و عام
بر ہمہ دارد بہ بیابان و کاخ / جا خوش و رہ ایمن و نعمت فراخ

آنچہ بفہرست رقم یافت چست | بازنمایم بہ بیاباں درست

امراکو بھی مخاطب کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگران پر خداکو خوش رکھنے کا خیال غالب رہے گا، تو وہ اپنے ملک کے بادشاہ کو بھی خوش رکھ سکتے ہیں، حقیقی مالک کی اطاعت گذاری ہی سے دنیاوی مالک کی فرماں برداری آسکتی ہے، (مثنوی نہ سپہر ص ۲۵۱)

اے کہ بہ شغل ملکی و سری | نصیب زدرگاہ شہ کشوری
ہر کہ شود بر سر جمعی بلند | نہ کہ بود از پے دیں بہ پسند
ادلش از طاعت یزداں ہمی است | زاں پسش از خدمت سلطاں ہمی است

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امرا کو بادشاہ ہی سے جاگیر، مال اور رتبہ ملتا ہے، اگر وہ اس کے نیک خواہ نہ ہوں گے تو یہ سب چیزیں ان کے لئے حلال نہ ہوں گی،

شہ کہ ولایت دہد و مال و جاہ | نیست حلال ار نہ بوی نیک خواہ

وہ لشکریوں کو بھی مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ وہ مذہبی ہوں، فرائض وسنن کے پابند ہوں، خدا کے پیام کی فتح وکامرانی کے لئے کوشاں ہوں، غارت گری اور ناموری کے لئے لڑائی نہ لڑتے ہوں، رعایا کی کھیتی نہ برباد کرتے ہوں، خونِ جگر سے کاشتکار جو خوشے تیار کرتے ہوں، ان کو اپنے گھوڑوں کے پیٹ میں نہ جانے دیں (نہ سپہر ص ۵۷-۲۵۶)

اولش اں باشد کہ بہ نفسِ صبور | ازسنن و فرض نباشند دور
وادہ تند شان بہر خدا صفدری | نے زپئے غارت ونام آوری
دردہ درہ رفتن دما دم کنند | واشتلم لشکریاں کم کنند
ور تو تاراج بری خرمنے | خرمنِ تو نیز بود دشمنے
باہمہ نیروئی توئی پائگان | کشت رعیت مچراں رائگاں

نوشتہ کہ ہند و نہ جگر دادہ آب	در جگر اسپ تو بنود صواب

پھر عام لوگوں کے اخلاق کو سنوارنے کے لئے نصیحت کرتے ہیں کہ وہ آبرو شناس اور حلیم ہوں، حلم وسکون ہی میں سیرت کی فرزانگی ہے، خشم وغضب میں دیوانگی ہے، (نہ سپہر ص ۶۵-۲۶۴)

حلم وسکون سیرتِ فرزانگی است	خشم وغضب مایۂ دیوانگی است

وہ دیانت اختیار کریں کہ اس سے دین بھی سنورتا ہے، خیانت سے ادبار آتا ہے،

دیں ز دیانت شود آراستہ	خاین از ادبار شود کاستہ

حسد، غصہ اور بخیلی بہت بڑی بدی ہے،

ہیچ بدی در دل وجاں بد اں	چوں حسد وخشم وبخیلی مدان

امیر خسرو ایک ہندوستانی نوجوان میں جو اوصاف چاہتے تھے، ان کی عکاسی ان کی ان نصیحتوں سے ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے لڑکے کو دی تھیں (خسرو شیریں ص ۲۹-۲۴)، کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا اطاعت گذار ہو، وہ پاک اعتقاد کا ہو، نیک اور پرہیزگار لوگوں کی صحبت میں رہتا ہو،

نخستیں پندم آں شد گر نیوشی | کہ جز در طاعتِ یزداں نکوشی
ہمیشہ ز اعتقادِ پاک پیوند | خدا را بندہ باشی نفس را بند
بہ صفِ نیک مرداں شو کماں گیر | ز بدناماں گریزاں باش چو تیر

وہ کہتے کہ ایک نوجوان شیر کی طرح رہے جو اپنے شکار کے ساتھ مست رہتا ہے، سور اور کتے کی طرح حریص نہ رہے،

چوں شیراں در شکار انداز مستی	چو خوک وسگ مکن شہوت پرستی

د وہ روشن ضمیر کا مالک بن کر رہے، کوئی کام ایسا نہ کرے جو بڑے ناپسند کریں،

بطاعت کوش چوں روشن ضمیراں مکن کارے کہ نہ پسندند پیراں

وہ ہمیشہ سچ بولے، اگر سچ بولنے میں بھی اس پر تہمت رکھی جائے تو اس کی پرواہ نہ کرے، راست گاری ہی میں اس کی رستگاری ہے،

اگر خواہی نکو باشی نکو باشی ہمیشہ راست کاری و راست گو باش
مترس از تہمت گو رستگار ست کہ مرد از راست کاری رستگار ست

ایک روٹی پر صبر کر لینا اصل بادشاہی ہے، خزانہ کے پیچھے دوڑنا گدائی ہے،

بنانے صبر کردن بادشائست دویدن در پئے گنجے گدائست

وہ اسکو اس بلندی کی تعلیم دیتے ہیں، کہ تخت و تاج کے لئے محتاج رہنا مناسب نہیں، وہ زمین کو اپنا تخت اور چرخ کو اپنا تاج سمجھ کر زندگی گذارے،

مباش از بہرِ تخت و تاج محتاج زمیں را تخت دان و چرخ را تاج

وہ حاجت مند بن کر دنیا کی کسی چیز کی طلب نہ کرے اگر تلاش کے بغیر اس کو کوئی چیز مل جائے تو اس کو رد بھی نہ کرے،

ز حاجت پیش در دنیا مجو چیز وگر ناجستہ یابی رد مکن نیز

اور اگر ابر دولت اس پر موتی برسائے تو وہ شاخِ گلنار کی طرح اپنی فروتنی میں جھکا رہے،

چو گردد ابر دولت بر تو دُر بار
فرو تن باش، ہمچوں شاخِ گلنار

وہ ہاتھی کی پیشانی کی طرح کشادہ بن کر رہے، چیونٹیوں کی طرح بن کر نہ رہے،

چوں پیالاں باشں پیشانی کشادہ
کہ چون مور کز پرسینہ دادہ

عورتوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ شرم وحیا کے ساتھ گھر ہی کی زینت بنی رہیں، جو عورتیں گلی گلی ماری پھرتی ہیں، اُن کے متعلق لکھا ہے، (ہشت بہشت ص ۲۹)

زن کہ در کوچہ ہا بنگ باشد
زن نباشد کہ مادہ سگ باشد

صاحب المثنوی

یہ فارسی زبان کے مشہور صوفی اور مثنوی نگار شاعر، اور فارسی کی سب سے مشہور صوفیانہ مثنوی کے مصنف مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری ہے، جس میں حضرت شمس تبریزی کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اور جس طرح درس و تدریس وعظ ونصیحت، پند وارشاد کو چھوڑ کر، ان کے عشق میں دیوانہ ہوئے ہیں اس کو اور اُن کی زندگی کے اور بہت سے واقعات کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے یہ مولانائے جلال الدین رومی پر مولانا شبلی کی سوانح مولانائے روم کے بعد دوسری مستند کتاب ہے، از قاضی تلمذ حسین صاحب

قیمت :-

امام ربیع بن سلیمانؒ مرادی

از حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ

امام شافعی کے محبوب شاگرد، ان کی بزم علم کے رکن رکین، اور ان کی فقہ کے راوی امام ربیع بن سلیمان مرادی ۱۷۴ھ (۷۹۰ء) میں مصر میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی قابل فخر سال ہے، جس میں فقہ شافعی کے دو اور نامور فقیہوں امام مزنی اور امام بحر بن نصر نے اس دنیائے آب و گل میں آنکھیں کھولیں، امام مزنی، امام ربیع مرادی کے رضاعی بھائی اور عمر میں ان سے چھ مہینے بڑے تھے[1]

امام ربیع کی مشہور کنیت ابو محمد ہے، سبھی تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ابن ندیم۔ انھیں ابو سلیمان بھی کہتے ہیں، موذن فسطاط اور موذن شافعی کے لقب سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔

ان کا خاندان مدت دراز سے مصر میں آباد تھا، ... وہ قبیلۂ مراد سے تعلق رکھتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس قبیلہ کے اجداد میں یحابر بن مالک بن ادد بن سبا ایک ظالم و متمرد شخص تھا، اس کے تمرد کی وجہ سے اس کا نام ہی مراد پڑ گیا،

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۶ طبقات کبری، سبکی ج ۱ ص ۲۴۸

پھر اسی نام سے یہ قبیلہ مشہور ہو گیا، جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں یہ قبیلہ بڑا مردم آفریں رہا ہے[1]
امام ربیع کا تعلق اس قبیلہ سے نسلی اعتبار سے نہ تھا، بلکہ وہ موالاۃ یا حلیف ہونے کی بنا پر مرادی
کہلاتے ہیں[1]، ان کے خاندان کے حالات پردۂ خفا میں ہیں، لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ خاصے عرصے
یہ لوگ مصر میں بود و باش اختیار کئے ہوئے تھے، اور خالص مصری ہو گئے تھے[2]،

امام ربیع کی نشو و نما اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارہ میں تاریخ کے صفحات خاموش ہیں، لیکن
ان کے اساتذہ میں عبد اللہ بن وہب، عبد اللہ بن یوسف، ایوب بن سوید رملی یحییٰ بن حسان،
اسد بن موسیٰ، بشر بن بکر اور شعیب بن لیث[3] جیسے ممتاز محدثین کے اسما گرامی سے اندازہ ہوتا ہے کہ
ابتدائی تعلیم کے بعد ہی علم حدیث سے شغف اور ممتاز محدثین کی مصر میں موجودگی کی کشش نے
امام ربیع کی علم جو طبیعت کو اپنی جانب متوجہ کر لیا، ان کے حسن ذوق نے اس زمانہ میں علم کلام کی
گرم بازاری سے صرف نظر کر کے علم حدیث کا انتخاب کیا، عبد اللہ بن وہب امام ربیع کے خاص استاذ
تھے، اس تعلق خاص کی وجہ سے بعض حضرات نے امام ربیع کو صاحب ابن وہب بھی کہا ہے[4]، ابن وہب
امام مالک اور امام لیث بن سعد کی طرح صف اول کے محدث اور فقیہ ہیں، ابن فرحون کی روایت
کے مطابق امام مالک نے ابن وہب کے علاوہ کسی کو کبھی فقیہ نہیں لکھا، ان کے کمال کا یہ حال تھا کہ
لاکھوں حدیثوں کے حافظ ہونے کے باوجود ایک بھی منکر حدیث ان سے منقول نہیں، متقی اس درجہ کے
تھے کہ قرأت حدیث کے دوران قیامت کی ہولناکیوں کے ذکر سے ایسا خوف طاری ہوا کہ بیہوش
ہو کر گر پڑے اور اسی بے ہوشی کے عالم میں چند دنوں بعد اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گئے[5]،

---

[1] اللباب، ابن اثیر ج ۳، ص ۱۸۰، تاج العروس ج ۲ ص ۵۰۰، لسان العرب ج ۴، ص ۲۶۴، اس صورت
میں مراد سے فعال کے وزن پر مراد ہوگا، [2] تہذیب، ج ۳ ص ۲۴۶، اصلہ من مصر، [3] تہذیب التہذیب،
ج ۳ ص ۲۴۶، [4] العبر ج ۲ ص ۴۵، [5] حسن المحاضرہ، سیوطی ص ۱۲۱،

یہ امام ربیع کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں ابن وہب جیسی عالی مرتبت ذات سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، ان کے دوسرے نمایاں اساتذہ میں موطا کے راوی عبداللہ بن یوسف تینیسی ہیں، جنھیں امام بخاری شامی محدثین میں سب سے زیادہ معتبر قرار دیتے ہیں[1]، بشر بن بکر ہیں جو امام اوزاعی کے شاگرد اور امام شافعی وحمیدی کے استاد ہیں، یحییٰ بن حسان ہیں، جو امام مالک و امام لیث کے شاگرد ہیں، ان کے بارہ میں محدثین کی رائے ہے کہ وہ مصر کے جلیل القدر محدث اور مستند امام ہیں، امام ربیع کے اساتذہ کے سلسلۂ زریں میں امام لیث بن سعد کے صاحبزادے اور ممتاز فقیہ و مفتی شعیب بن لیث اور مشہور اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے پرپوتے، امام حدیث اسد بن موسیٰ کے اسماء جلیلہ بھی نمایاں ہیں[2]،

امام ربیع کے ان اساتذہ کی نمایاں خصوصیت، علوم حدیث و فقہ کی جامعیت ہے، اس سے امام ربیع کے ذوق انتخاب پر روشنی پڑنے کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروع ہی سے ایک مقصد پیش نظر رکھتے تھے،

حدیث و فقہ کی اس جامعیت نے جس میں حدیث کا رنگ غالب تھا، امام ربیع کے فکر و شعور میں ایسے رجحانات پیدا کئے جو انھیں امام شافعی کے مکتب فکر سے قریب لانے اور ان کے طرز استدلال و اجتہاد کو قبول کرنے میں زیادہ معاون و سازگار ثابت ہوئے،

امام شافعی مصر ۱۹۹-۱۹۸ھ میں تشریف لائے[3]، اس وقت امام ربیع کی عمر تقریباً ۲۵ برس کی تھی، اور اس عمر میں وہ کبار محدثین و فقہاء سے اکتساب علم، خاصی حد تک کر چکے تھے، علمی ذوق کی پختگی کی وجہ سے فقہ شافعی سے انھیں کافی مناسبت ہو گئی، امام شافعی کے علم، تقویٰ اور تفقہ کی شہرت و قبولیت سے متاثر ہو کر وہ دوسرے نوعمر ساتھیوں کی طرح امام شافعی

---

[1] حسن المحاضرہ، سیوطی ص ۱۴۵، [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۴۵، [3] وفیات ۱۔ ابن خلکان ج ۲، ص ۲۱۶،

کی خدمت میں حاضر ہوئے، امام شافعی کو قاسم ازل نے اور نعمتوں کے ساتھ صالح اور ذہین شاگردوں کی نعمت خاص ایسی عطا فرمائی تھی کہ باید وشاید، ان کا ہر شاگرد علم عمیق، ذہن ثاقب اور صلاح وتقویٰ میں ممتاز تھا، ان کے مصری تلامذہ میں ابویعلی کے سوا سب نوجوان اور تقریباً ہم عمر تھے، اور یہی لوگ ہیں جو جدید فقہ شافعی کے حامل وناقل ہیں[1]،

امام ربیع نے، امام شافعی سے باضابطہ فیض تو مصر میں حاصل کیا، لیکن بعض روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ مصر میں ان کی آمد سے پہلے ہی بغداد میں ان سے مستفید ہو چکے تھے،، وہ خود بیان کرتے ہیں کہ امام شافعی نے ان سے بغداد میں اہل مصر کے دینی وفقہی رجحانات کے بارہ میں سوال کیا تو انھوں نے عرض کیا کہ وہاں دو طبقے ہیں، ایک تو امام ابوحنیفہ کے مسلک سے قریب تر ہے، اور دوسرا طبقہ اس کے برعکس امام مالک کی آرا، وافکار سے متاثر ہے، امام شافعی نے یہ سن کر فرمایا میں ان کے سامنے ایسا نقطۂ نظر پیش کر دوں گا، جو انھیں ان دونوں سے بے نیاز کر دے گا[2]،

ارجوان اقدم مصران شاء	مجھے امید ہے کہ جب مصر آؤں گا تو ان کے
اللہ فآتیھم بشیٔ اشغلھم	سامنے ایسی چیز پیش کروں گا جو انھیں
بہ عن القولین جمیعاً،	دونوں سے بے نیاز کر دے گی،

امام شافعی کے اس دعویٰ کی تائید میں امام ربیع فرماتے ہیں کہ پھر ایسا ہی ہوا[3]، مصر آنے سے قبل امام شافعی چند مہینوں کے لئے بغداد سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، اس سفر میں امام ربیع بھی ان کے ہمرکاب رہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم مکہ سے منیٰ کی جانب نکلے، راستہ میں جب کوئی وادی اور گھاٹی ملتی تو امام شافعی ان اشعار سے حدی خوانی کرتے[4]،

---

[1] طبقات الفقہاء، شیرازی ص ۷۹، ۸۰، [2] معجم المصنفین ص ۲۹۸، [3] توالی التاسیس، ص ۷۷، [4] طبقات کبریٰ، سبکی ج ۱ ص ۱۵۸،

یا راکبا قف بالمحصب من منی | واھتف بقاعد خیفھا والناھض
سحرا اذا فاض الحجیج الی منی | فیضا کملتطم الفرات الفائض
ان کان رفضا حب آل محمد | فلیشھد الثقلان انی رافض

"اے ہمراہیو! منی و محصب کے نشیب و فراز میں رکو، صبح کے وقت جب حاجی منیٰ کی جانب بڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دریائے فرات موج در موج بہتا جا رہا ہے، اگر آل محمدؐ کی محبت کا نام رفض ہے تو سب گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں"۔

مصر میں امام ربیع، امام شافعی کے سایہ کی طرح ان کے رفیق و قریب رہے، امام شافعی کی محبوبیت و دلنوازی نے امام ربیع کو جذبۂ اخلاص و عقیدت سے سرشار کر رکھا تھا، ان کی یہ عقیدت امام شافعی کی ہر خدمت کے لئے ان کو تیار رکھتی تھی، امام شافعی ان کی خدمتوں کے معترف تھے فرماتے تھے، میری جتنی خدمت ربیع نے کی، اتنی کسی اور نے نہیں کی[1]، اسی بے لوث خدمت نے ان کو مقام محبوبیت پر فائز کیا، امام شافعی کے بے شمار شاگردوں میں وہ تنہا ہیں جنھیں "محبوب شافعی" کا لقب ملا، امام شافعی غایت درجہ شفقت سے ان سے فرماتے "تم مجھے کتنے محبوب ہو"[2] بلاشبہ محبت کی یہ سند ایسی ہے جو ان کے لئے باعث شکر و امتنان اور سرمایۂ فخر و ناز ہے۔

محبت اور اپنائیت کا ایک اور واقعہ لائق ذکر ہے، ایک بار امام شافعی نے ایک دعوت کا اہتمام کیا، لوگ فارغ ہو گئے تو امام بویطی نے امام ربیع سے کہا، چلو اب ہم بھی فارغ ہو لیں امام ربیع نے جواب دیا ہمیں کھانے کی اجازت کس نے دی؟ امام شافعی نے یہ بات سنی تو فرمایا، سبحان اللہ! انت فی حل من مالی کلہ، تمہیں تو میرے سارے مال میں اختیار ہے،

ایسے ہی ایک موقع پر جب امام ربیع نے بازار سے سامان لا کر حساب پیش کرنا چاہا تو امام شافعی

---

[1] وفیات: ابن خلکان ص ۲۲۶، تہذیب الاسماء: نووی ص ۱۸۸،

فرمایا، وقت مت ضائع کرو، میں تم سے حساب نہیں مانگتا، امام ربیع نے عرض کیا کہ ام ابی الحسن (بہ امام شافعی) تو حساب مانگتی ہیں، اس پر امام شافعی نے فرمایا[۱]

یاطویل الساقاد انت فی حل من	ارے نیند کے ماتے، تمھیں تو میرے سارے
مالی کلہ،	مال میں اختیار ہے،

امام ربیع کی شادی ہوئی تو امام شافعی نے دریافت فرمایا کہ مہر کتنا مقرر ہوا، جواب دیا تیس دینار، امام شافعی نے پھر پوچھا کہ کتنا ادا کیا، انھوں نے کہا چھ دینار، یہ سن کر امام شافعی گھر تشریف لے گئے، وہاں سے ایک تھیلی بھیجی جس میں چوبیس[۲] دینار موجود تھے،

امام ربیع کو اپنے عالی مرتبت استاد کے صرف مال ہی میں نہیں، علم کے حصول میں بھی اختیار کلی حاصل تھا، ایک موقع پر امام شافعی نے فرمایا، اے ربیع، اگر علم کھلانے والی چیز ہوتی تو میں تمہیں سے کھلا کر رہتا[۳]، اس قول سے بعض لوگوں کو ان کے بطئی الفہم ہونے کا شبہ ہوا، قفال مروزی نے اپنے فتاویٰ میں اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے، لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ امام شافعی ان کی صلاحیت حفظ، حسن فہم اور نافعیت کی بناء پر یہ خواہش کرتے تھے، کہ انھیں گویا علم کھلا دیا جائے[۴]، ابن خلکان کی ایک روایت سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، وہ امام ربیع کے بارہ میں امام شافعی کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اماد اللہ ما فی القوم انفع	بخدا لوگوں میں ان سے (ربیع) زیادہ
لی منہ ولو ددت انی حشوتہ	میرے لئے اور کوئی مفید نہیں، میں
العلم حشوا ۔	چاہتا ہوں کہ انھیں علم سے بھر دوں[۵]

امام ربیع کے حفظ و اتقان کی صلاحیت ہی کی وجہ سے امام شافعی فرمایا کرتے تھے، کہ الربیع

---

[۱] معجم المصنفین ص ۲۹۳ ، [۲] انتقاء ابن عبد البر ص ۹۴، [۳] وفیات، ابن خلکان ج ۱ ص ۱۳۲۶

[۴] مرآۃ الجنان، یافعی ج ۲، ص ۱۱۴، [۵] وفیات الاعیان، ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲،

راویتی[۱]، انہ احفظ اصحابی، ربیع میرے راوی اور سب شاگردوں سے زیادہ حافظہ والے ہیں،

وہ امام شافعی کے ذاتی سفیر کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، ایک مرتبہ امام شافعی نے انھیں امام احمد بن حنبل کی خدمت میں، ایک مکتوب کے ساتھ بغداد بھیجا، جب امام ابن حنبل نے خط پڑھنا شروع کیا تو ایک جگہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، امام ربیع نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ امام شافعی نے خواب دیکھا کہ آنحضرتؐ تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اس نوجوان (احمد بن حنبل) کو خوشخبری دو کہ عنقریب اسے اللہ کے دین کے بارے میں آزمائشوں سے گذرنا ہوگا، اس سے کہا جائے گا کہ قرآن کو مخلوق کہو، پھر اس کے انکار پر اسے سخت سزائیں دی جائیں گی اور انہی سزاؤں کی جزا میں اللہ تعالیٰ قیامت تک اس کے ذکر کو عام کرے گا، یہ سن کر امام ربیع نے فرمایا کہ بشارت ہو اور پھر بے تکلفی سے فرمائش کی، خاص شیٔ جائزۃ علیھا، اس بشارت پر کیا انعام دیں گے؟ وہ فرماتے ہیں کہ اس وقت امام احمد بن حنبل کے جسم مبارک پر دو کپڑے تھے ان میں سے ایک انھیں عنایت کیا،[۲]

امام ربیع ایسے موقعوں پر جب واپسی کے بعد امام شافعی کی خدمت میں حاضر ہوتے تو امام شافعی خاص طور سے وقت نکال کر مجلس میں زیر بحث ان مسائل کو جو امام ربیع سے چھوٹ گئے تھے، دوبارہ ان کے سامنے دہراتے، تاکہ ان کے سرچشمۂ فیض کی کسی بوند سے امام ربیع محروم نہ رہیں،[۳]

اور یہ واقعہ تو بہت مشہور اور امام شافعی کی فراست ایمانی کا شاہد ہے کہ ان کے مرض الموت میں جب چاروں مشہور تلامذہ، مزنی، بویطی، ابن عبد الحکم، اور ربیع ان کے پاس تھے تو انھوں نے فرداً فرداً ہر ایک کے بارہ میں پیشین گوئی فرمائی کہ ایک وقت آئے گا جب مزنی اپنے دور کے سب سے بڑے فقیہ ہوں گے، بویطی قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوں گے، اور اسی حالت میں ان کا

---

۱ طبقات کبریٰ: سبکی ج ۱ ص، طبقات الفقہاء: شیرازی ص ۹۸، ۲ طبقات: مصنف ص ۶، ۳ طبقات: سبکی

طائر روح قفسِ عنصری سے آزاد ہو جائے گا، ابن عبد الحکم اپنے سابقہ فقہی مسلک کو اختیار کر لیں گے اور ربیع، انت انفعھم لی فی نشر الکتب، تم ان لوگوں میں میری کتابوں کی نشر و اشاعت میں سب سے زیادہ مفید ہو گے،[۱]

امام ربیع فرماتے ہیں کہ جب امام شافعی کا انتقال ہوا تو ہر ایک کا حال اس پیشین گوئی کے مطابق ہوا،

حتی کانہ ینظر الی الغیب	ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان چھپی حقیقتوں
من ستر رقیق ،	کو ایک باریک پردہ کے پیچھے سے دیکھ رہے تھے،[۲]

امام شافعی کا انتقال ہوا تو غسل دینے کی سعادت میں وہ امام مزنی کے شریک رہے،[۳]

جامع فسطاط جو تاج الجوامع[۴] اور جامع عمرو بن عاص بھی کہلاتی ہے اور جو مصر میں مسلمانوں کی پہلی مسجد تھی، اسی کے ایک گوشہ میں امام شافعی جلوہ افروز مسند تدریس ہوتے تھے، امام ربیع جو خوش آوازی و خوش لحنی میں بھی ممتاز تھے،[۵] اسی مسجد کے موذن تھے، اسی وجہ سے وہ موذن شافعی اور موذن فسطاط کے لقب سے مشہور ہوئے، امام شافعی کے بعد جامع فسطاط میں مسند تدریس پر امام بویطی رونق افروز ہوئے، لیکن فتنہ خلقِ قرآن کی وجہ سے وہ زیادہ عرصہ یہ خدمت انجام نہ دے سکے،[۶] اور وہ امام احمد بن حنبل کے ساتھ پس دیوار زنداں جانے پر مجبور ہوئے، تو پھر امام ربیع کو اس مسند پر آنا پڑا جسے کبھی امام شافعی کی جائے نشست ہونے کا شرف حاصل تھا، لیکن امام ربیع

---

[۱] طبقات سبکی ج ۱، وفیات: ابن خلکان ج ۱ ص ۵۷، [۲] وفیات، ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲، [۳] مرأۃ الجنان، یافعی ص ۱۰۸، [۴] امام لیث بن سعد نے اسی مسجد کے بارہ میں فرمایا تھا، کان مسجدنا حدائق واعنابا، خطط: مقریزی ج ۴ ص ۴، [۵] طبقات، سبکی ج ۱ ص ۲۴۹، [۶] تاریخ بغداد خطیب بغدادی ج ۱۴، ص ۳۰۲،

فرطِ محبت و عقیدت سے کبھی امام شافعی کی جائے نشست پر نہیں بیٹھے، امام شافعی قبلہ رخ تشریف رکھتے تھے، لیکن امام ربیع کی پشت جانب قبلہ رہتی تھی، اس طرح گویا وہ عالم تصور میں امام شافعی کے روبرو ہوتے تھے[1]،

کچھ عرصہ بعد جب مصر کے علم پرور، حوصلہ مند اور نامور امیر احمد بن طولون نے ایک عظیم الشان مسجد جامع ابن طولون تعمیر کی تو اہل علم و فضل سے اس مسجد کو آباد کرنے کی درخواست کی، چنانچہ قاضی بکار نے اس میں سب سے پہلے نماز پڑھائی، ابو یعقوب بلخی نے خطبہ دیا، اور امام ربیع نے اس میں درس کے ساتھ حدیث کا املا کرایا، انھوں نے مسجد کے لئے ایک خوبصورت تختی بھی تیار کرائی جس میں حدیث کے یہ الفاظ نقش تھے[2]،

من بنى لله مسجدا ولو كمفحص قطاة بنى الله له بيتا في الجنة ،

جو اللہ کے لئے مسجد بنائے گا، خواہ وہ بلیوں کے گھروندوں جیسی کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لئے ایک گھر بنائے گا،

اس موقع پر ابن طولون نے امام ربیع کی خدمت میں ایک کیسۂ زر پیش کیا، جس میں ایک ہزار سرخ دینار تھے،

وقت کے ساتھ ساتھ امام ربیع کا حلقۂ درس اور ان کی شہرت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، امام مزنی اپنی تالیفات سے اور امام ربیع اپنے درس سے فقہ شافعی کی ترویج میں روز افزوں اضافہ کرنے لگے، امام نووی فرماتے ہیں کہ،

صارت اليه الرواحل تشد

لوگ دور دور سے امام شافعی کی کتابو

---

۱ توالی التاسیس، عسقلانی ص ۸۴، ۲ حسن المحاضرہ، سیوطی ص ۱۳۰،

الیہ من اقطار الارض | کی سماعت کے لئے ان کے پاس کاروان
سماع کتب الشافعی[1] | در کاروان آنے لگے،

محمد بن احمد طرائفی بغدادی کا بیان ہے کہ ایک روز ہم امام ربیع کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے دروازے پر تقریباً نو سو مسافر ایسے تھے جو دور دور سے امام شافعی کی کتابوں کی سماعت کے لئے آئے ہوئے تھے،[2]

امام بیہقی کی روایت ہے کہ ۲۴۰ھ میں امام ربیع نے حج کیا، وہیں ان کی ملاقات امام شافعی کے ایک اور ممتاز عراقی شاگرد اور ان کی فقہ قدیم کے سب سے بڑے راوی امام زعفرانی سے ہوئی اثنائے گفتگو میں امام ربیع نے فرمایا، اے ابو علی (زعفرانی) تم مشرق میں اور میں مغرب میں اس علم (علم شافعی) کو عام کر کے رہیں گے،[3] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محبوب استاد کے علم کو عام کرنے میں وہ کس قدر سنجیدہ پرجوش اور مخلص تھے، امام سبکی کے الفاظ میں امام ربیع کے شاگردوں کی کثرت سے امام شافعی کے اس قول کی صداقت کہ میرے راوی تو ربیع ہیں، اظہر من الشمس ہے،[4]

(باقی)

---

[1] تہذیب الاسماء، نووی ص ۱۸۸، تاریخ التشریع الاسلامی: حضری ص ۲۶۱، [2] تہذیب الاسماء: نووی ج ۱ ص ۱۸۸ [3] ایضاً ص ۱۸۸، ۱۸۹، [4] طبقات: ج ۱ ص ۲۵۹،

تبع تابعین حصہ دوم

اس میں ۴۰ صاحب تصنیف وصاحب دعوت تابعین عظام کے سوانح اور حالات اور ان کے علمی و دینی خدمات اور کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

"از ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی رفیق دارالمصنفین"

ادبیات

غزل

از جناب بسنت کمار بسنت ایڈوکیٹ، رکاب گنج لکھنؤ

مرادِ درِ عشق بھی خوب ہے، ہے عجیب کچھ مری داستاں
کوئی خار جیسے چھپا چھپا، نہاں نہاں
کئی دن سے ہیں وہ خفا خفا، کئی دن ہیں وہ کشاں کشاں
کوئی شمع جیسے بجھی بجھی، کوئی شام جیسے
یہ ادائے گیسوئے عنبریں کہ ہو چھائی جیسے گھٹا کہیں
یہ خرام نازک و دلنشیں، یہ نسیم صبح ر
وہ ادائے حسن سخن کہ ہم جو سنیں تو بھول لیں جہاں کے غم
وہ نگاہ ملتفت و کرم جو بنی پیام
ملے خلد بھی تو نہ لیں گے ہم، کوئی کچھ کہے نہ سنیں گے ہم
ہمیں ہیں عزیز تو ایک وہ، نہ تو ماہ و گ
کبھی عشرتوں میں جہاں کے ہم گئے بھول تیرے غم و الم
کبھی تیری زلفوں کے پیچ و خم نے بھلا د
وہ جمالِ حسنِ مجاز تھا کہ خیالِ زلفِ دراز تھا
کوئی سوزِ نغمۂ ساز تھا، کبھی تھا کو
وہ پیامِ حسنِ بتاں سہی، وہ حکایتِ دل و جاں سہی
وہ یقیں سہی کہ گماں سہی، میرا ذوق گم تھ
نہ وہ خضرِ راہ کی رہبری نہ ایاز ہے نہ وہ غزنوی
نہ وہ کیف ہے نہ وہ زندگی، نہ وہ دل ر
انھیں جانِ درد و رحِ چمن کہیں کہ بسنت حسنِ سخن کہیں
انھیں کیسے وعدہ شکن کہیں نہ نہیں ہے ان کی نہ انکی ہاں

مطبوعات جدیدہ

بوارق الغیب ۔ از مولانا محمد منظور نعمانی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت عمدہ صفحات ۲۸۰۔ مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپیے۔
پتہ: الفرقان بکڈپو، ۱۳۱۔ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ۔

ماضی قریب میں جو مسائل مسلمانوں کے درمیان ما بہ النزاع اور انکی تحریر و تقریر اور بحث و مناظرہ کا خاص موضوع رہے ہیں، ان میں ایک علم غیب کا مسئلہ بھی ہے، اس کی تائید و تردید میں متعدد کتابیں اور رسالے لکھے گئے ہیں، ایک زمانہ میں مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان کو بھی ان بحثوں سے بہت دلچسپی تھی، زیر نظر کتاب ان کے اسی دور کی یادگار ہے لیکن اب نہ مولانا کا یہ ذوق ہی رہا اور نہ وہ اس طرح کی بحثوں کو مفید سمجھتے ہیں، مگر ادھر کئی برسوں سے ان فرسودہ بحثوں کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، جن سے عام مسلمانوں میں انتشار و افتراق بڑھتا جا رہا ہے اس لیے مولانا کو اپنے عزیزوں اور احباب کے اصرار خواہش پر اس نایاب اور پرانی کتاب کو دوبارہ شائع کرنے کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔ اس کے دو حصے ہیں، ابھی صرف پہلا حصہ شائع ہوا ہے، اس میں قرآن پاک کی ایسی چالیس آیتیں نقل کرکے ان کی تشریح ترجمہ کے ساتھ کی گئی ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ غیب کا علم صرف خدائے تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، مولانا نے یہ احتیاط بھی کی ہے کہ آیتوں کے متعلق

اپنا خیال اور نقطۂ نظر نہیں پیش کیا بلکہ پہلے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی اور شاہ عبد القادرؒ کے اردو ترجمے نقل کیے ہیں، پھر آیتوں کے مفہوم کی وضاحت کے لیے دوسرے قرآنی نظائر یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور صحابہ کرامؓ کے اقوال پیش کئے ہیں اور مزید توضیح و تائید کے لیے تابعین عظام اور کبار مفسرین کی رائیں نقل کی ہیں، آخر میں ان آیتوں کی غلط تاویل و توجیہ کرنے والوں کے شبہات کا ازالہ کیا ہے، اس طرح یہ کتاب بہت مدلل ہے، اور اس سے غیر اللہ کے لیے علم غیب ثابت کرنے والوں کی مکمل تردید ہوگئی ہے، لیکن یہ مولانا کے ابتدائی اور مناظرانہ دور کی تصنیف ہے اس لیے اس میں یہی رنگ نمایاں ہے، مولانا نے جس مقصد اور جذبہ سے یہ کتاب اب دوبارہ شائع کی ہے امید کہ اس کی قدر کیجائے گی، آخر مسلمان کب تک باہم سر بگریباں رہ کر اپنی صلاحیت اور قوت ضائع کرتے رہیں گے؟

قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ ۔ از مولانا عبد الحق صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰۰۔ قیمت تحریر نہیں، ناشر موتمر المصنفین دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ، خٹک (پشاور) پاکستان۔

شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا اصل میدان درس و تدریس اور علم دین کی خدمت و اشاعت ہے، دار العلوم حقانیہ کا قیام انکا بڑا کارنامہ ہے، جس کو پاکستان میں دار العلوم دیوبند کا مثنیٰ خیال کیا جاتا ہے، ان مفید خدمات کے ساتھ وہ ملک و ملت کی اصلاح، پاکستان میں صالح معاشرہ اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے بھی برابر جدوجہد کرتے رہتے ہیں، پاکستان کے گذشتہ عام انتخابات کے بعد جب وہ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا اور بچے کھچے حصہ کی قیادت و سربراہی ذو الفقار علی بھٹو

کے حصہ میں آئی تو اس زمانہ میں وہ بھی جمعیۃ علمائے اسلام کے ٹکٹ پر پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے، اپنی رکنیت کے زمانہ میں انھوں نے قومی اسمبلی میں جو تقریریں کیں اور پاکستان کے آئین و دستور میں اصلاح و ترمیم کے لیے جو سفارشیں اور تجویزیں پیش کیں ان کا ایک حصہ اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے، مولانا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا اسلئے یہاں اسلام ہی کا بول بالا ہو اور ان ساری چیزوں کو ختم ہونا چاہیے جو اسلام اور نظریۂ پاکستان کے منافی ہیں، اس مقصد سے انھوں نے قومی اسمبلی میں شراب، جوا، رقص، سرود، عریاں فلموں، فحش ثقافتی سرگرمیوں، ملحدانہ اور لادینی لٹریچر اور دوسرے منکرات کے انسداد کی تجویزیں پیش کی تھیں اور سوشلزم کے بجائے اسلام کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے اور اوقاف، صدقات و زکوٰۃ کی بہتر تنظیم کرنے پر زور دیا ہے، اسی طرح نصابِ تعلیم میں اصلاح، عربی زبان کو فروغ دینے، اسلام کے عائلی قوانین اور دوسرے احکام میں رد و بدل نہ کرنے، اسلامی آئین نافذ کرنے، قوم کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل اور عام لوگوں کی مشکلات حل کرنے کے بارہ میں بھی سفارشات پیش کی ہیں اور اور عیسائی مشنریوں کی تبلیغ و اشاعت پر پابندی عائد کرنے اور اس زمانہ کے حالات کے مطابق قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ مولانا کی تجویزوں کی تائید و تردید میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے، گو مولانا کی یہ تجویزیں رد کر دی گئیں اور بعض کو پیش کرنے کا بھی موقع نہیں دیا گیا، تاہم ان سے جہاں مولانا اور ان کے ہم خیال لوگوں کی دینی حمیت اور ملی غیرت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں پاکستان کے عام ذہنی رجحانات خصوصاً اس زمانہ کے برسر اقتدار طبقہ کے مذہب سے فرار اور اسلامی نظام کے بارہ میں لیت و لعل کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اردو کے مسائل ۔ مرتبہ ڈاکٹر حکم چند نیر، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۹۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت بارہ روپئے ۔ پتے :۔

(۱) شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی (۲) ادارۂ فروغ اردو، امین الدولہ پارک لکھنؤ

زیر نظر کتاب بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر حکم چند نیر کے چھ مضامین کا مجموعہ ہے، شروع کے چار مضامین میں ہندوستان کی گذشتہ سیاسی وسماجی تاریخ بیان کی گئی ہے، اس کا مقصد انگریزوں کی اس حکمت عملی اور سازش کو بے نقاب کرنا ہے جو انھوں نے سیاسی مفاد اور ہندوستان پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لیے کی تھی، جیسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے لسانی، سماجی اور تہذیبی اتحاد کو ختم کرنے اور قومی سالمیت کو پاش پاش کرنے کے لیے عدالتوں اور دفتروں سے فارسی کے اخراج، ہندی واردو زبان اور فارسی، دیوناگری اور رومن رسم خط کے جھگڑے، اوپری سطح کے لیے انگریزی اور نیچے کی سطح کے لیے تعلیمی اور سرکاری حیثیت سے مختلف علاقائی زبانوں کے رواج، اردو کے ساتھ دیوناگری کو عدالتی اور سرکاری رسم خط بنانے کے فیصلہ وغیرہ پر بڑی مفید بحث کی ہے، ایک مضمون ہندی روزنامہ بھارت (الہ آباد) کے سوالات کا جواب ہے، اس میں دلائل کے ساتھ مذہب سے زبان کے تعلق کی نفی کی ہے اور اردو کو ایک جمہوری زبان بتایا ہے، جو مختلف النسل، مختلف المذہب اور مختلف اللسان لوگوں کے باہمی ارتباط واختلاط سے ہندوستان میں پیدا ہوئی اور کہیں باہر سے نہیں آئی، اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ عربی وفارسی الفاظ ترک کرنے کے بعد اردو کا اچھا اور بلند پایہ ادب وجود میں نہیں آسکتا، رسم الخط اور زبان کا تعلق جسم وجان کی طرح ہے، اس کے بغیر زبان باقی نہیں رہ سکتی، ان کے نزدیک اردو کے لیے دیوناگری

رسم الخط کی تجویز عمل ہے۔ آخری مضمون میں اردو تعلیم کے مسائل پر گفتگو کی ہے، اس میں اردو کی ابتدائی تعلیم پر اس کے بقاء، ترویج و ترقی کا دارومدار بتایا ہے، جس پر بقول ان کے آزادی کے بعد سب سے پہلا اور کاری وار کیا گیا، ان کے خیال میں قومی حکومتوں کے بجائے سامراجی حکومتیں مادری زبان کی تعلیم سے محروم کرنے کا طرز عمل اختیار کرتی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بنیادی تعلیم کا مسئلہ اردو بورڈ اور بعض صوبوں میں اردو اکیڈمیاں قائم کرنے یا سہ لسانی یا دس اور چالیس کے فارمولوں سے حل نہیں ہو سکتا بلکہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے سے حل ہوگا اور اس سے ہندی کی اہمیت کم نہ ہوگی، مصنف نے بنیادی و ثانوی تعلیم کے لیے درسی کتابوں کی اہمیت اور ان کو جدید طرز پر مرتب کرنے کی ضرورت بھی واضح کی ہے اور اس بارہ میں مفید مشورے دیے ہیں، امید ہے کہ یہ مضامین علمی حلقے میں دلچسپی سے پڑھے جائیں گے، اور جو آواز ڈاکٹر حکم چند نیر نے بلند کی ہے وہ ہر گوشہ میں بلند کی جائے گی، یہ مضامین اردو کو جائز حقوق دلانے میں موثر ثابت ہوں گے۔

نوائے سحر۔ از جناب سحر اعظمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۴۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵ روپئے، پتہ: سحر کلینک لمبقرا، روڈ ضلع لمپا- یو-پی

ڈاکٹر مقبول احمد سحر اعظمی ایک کہنہ سال شاعر اور حضرت سیماب اکبر آبادی کے شاگرد ہیں، "نوائے سحر" ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے، اس مجموعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو غزل سے زیادہ مناسبت ہے، اور نظم کی طرح غزل کو بھی انھوں نے زندگی کے موجودہ مسائل و حقائق اور عہد حاضر کے حالات و رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے، گو سحر صاحب کے کلام میں اس دور کی شدتوں، تلخیوں اور بے راہ روی کا ذکر ہے لیکن ان کا عزم و حوصلہ بلند ہے اس لیے وہ موانع و مشکلات کے باوجود مایوس اور ہراساں نظر نہیں آتے، امید ہے کہ انکے کلام کی پختگی اور زبان و بیان کی دلکشی قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرے گی۔

العلم والعلماء - مرتبہ مولانا عبدالرؤف رحمانی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۰۴، قیمت دو روپے پتہ از مصنف پوسٹ و مقام بڑھنی بازار ضلع بستی۔

اس میں تاریخ و تذکرہ کی مستند کتابوں سے علمائے سلف کے علمی شوق و انہماک ذوق مطالعہ، طلب علم کے لئے محنت و مشقت، اساتذہ کے احترام اور طلبہ کی ہمت افزائی شاہان اسلام کی علم دوستی اور علما نوازی کے ایسے موثر اور سبق آموز واقعات جمع کئے گئے ہیں جن سے علم کی عظمت و اہمیت بھی ظاہر ہوتی ہے، اور اس کی طلب و جستجو کا داعیہ بھی پیدا ہوتا ہے یہ کتابچہ اس زمانے کے تن آسان علماء اور سہولت پسند طلبہ کے لیے عبرت خیز ہے۔

التوحید - مترجمہ مولانا مختار احمد ندوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۲۵، قیمت تحریر نہیں، پتہ: الدار السلفیہ حامد بلڈنگ، مومن پورہ، مولانا آزاد روڈ، بمبئی ۱۱

الدار السلفیہ بمبئی نے اصلاحی و دینی کتابوں کی اشاعت کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس سے پہلے معارف میں اس کی بعض مطبوعات کا ذکر آچکا ہے زیر نظر رسالہ قاضی قطر شیخ احمد بن حجر ال بوطامی کی تصنیف "تطہیر الجنان والارکان عن درن الشرک والکفران" کا عام فہم اردو ترجمہ ہے، اس میں توحید کا مفہوم اور اس کی قسمیں بیان کرکے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ہر قسم کی دعا، عبادت اور استعانت صرف اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہیئے، اس ضمن میں اسلام کے عقیدہ توحید کے منافی اُن اعمال و اشغال کا ذکر بھی آگیا ہے جو اس وقت مسلمانوں میں رائج ہیں۔

"ض"

دارالمصنفین کی تین نئی کتابیں

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

دارالمصنفین کا سلسلۂ تاریخ ہند ۵ کتابوں پر مشتمل ہے، اسی کے تحت عہد بعہد کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کے کئی حصے ہوں گے، حصہ اول میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، انسان دوستی، مردم پروری کی تفصیل مستند علمی و تاریخی ماخذ کے حوالے سے پیش کی گئی ہے، اس کے بعد کے حصوں میں دوسرے مسلمان فرمانروا خاندانوں خصوصاً مغل فرمانرواؤں جن کا عہد حکومت سب سے طویل رہا ہے اُن کی مذہبی رواداری، انسان دوستی، اور مردم نوازی کی تفصیل پیش کی جائے گی، قیمت ۔۔ ۷/ (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن)

تبع تابعین حصہ دوم

یہ سلسلہ تبع تابعین دو حصوں پر مشتمل ہو، پہلے حصہ میں امام ابوحنیفہ کے تین جلیل القدر تلامذہ کے علاوہ اور دوسرے مشہور تبع تابعین کے سوانح اور اُن کی علمی و دینی خدمات کی تفصیل ہے، اور حصہ دوم میں امام کبیر امام شافعی، امام حمیدی، قاضی شریک نخعی، امام کاظم، امام یحییٰ مسعودی، اور امام عبدالرزاق کے علاوہ اور دوسرے اہم، صاحب تصنیف اور صاحب دعوت تبع تابعین کے حالات لکھے ہیں،

مرتبہ محمد نعیم صدیقی ندوی علیگ رفیق دارالمصنفین،

مرزا مظہر جانجاناں

(اور اُن کا اردو کلام)

مرزا مظہر جانجاناں اردو و فارسی کے ایک صاحب کمال صوفی شاعر ہیں، اس کتاب میں اُن ہی کے سوانح و حالات، اور اُن کا تمام اردو کلام پیش کیا گیا ہے، شروع میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین کے قلم سے پیش لفظ اور جناب سید شہاب الدین دسنوی کے قلم سے مصنف کے مختصر حالات ہیں،

مرتبہ عبدالرزاق قریشی اعظمی،

قیمت ۱۔ ۔۔ ۱۲

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

عہدِ رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں احادیثِ نبوی کی نقل و روایت کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہ احادیث عرب و حجاز ہی میں نہیں پوری دنیائے اسلام میں بکھری پڑی ہوئی تھیں، محدثین کرام کا امت پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ایسے زمانہ میں جب کہ آج کل کی طرح سفر کی سہولتیں میسر تھیں اور نہ نشر و اشاعت کے اتنے وسیع ذرائع و وسائل موجود تھے، دنیائے اسلام کا ایک ایک چپہ چھان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و ارشادات کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع کیا، اُن کے مجموعے مرتب کئے، سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے مقدس سلسلوں کے مکمل ہونے کے بعد حضرت سید صاحب علیہ الرحمۃ کو ان محدثین کرام کے حالات مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، امام بخاری پر ایک مضمون، اور صاحبِ موطا امام مالک کی سوانح عمری وہ لکھ بھی چکے تھے، یہ کام اُن کی وفات کے بعد بیان کے رفیق مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد کیا گیا جس کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، اور دو حصے اور شائع ہوں گے، ان میں سے ایک حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات پر مشتمل ہوگا، اور یہ حصہ زیرِ ترتیب بھی ہے،

حصہ اول میں امام مالک اور ائمۂ صحاح کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحبِ تصنیف محدثین کرام مثلاً عبدالرزاق، امام حمیدی، امام احمد بن حنبل، امام طحاوی وغیرہ کے حالات و سوانح اور فنِ حدیث سے متعلق اُن کی شاندار خدمات کو مستند حوالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، حصہ دوم میں چوتھی صدی ہجری کے نصفِ آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحبِ تصنیف محدثین کرام کے حالات و سوانح اور اُن کی حدیثی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے تیسرے حصہ میں آٹھویں صدی ہجری کے بقیہ اور اس کے بعد کے تمام قابلِ ذکر محدثین کے حالات ہوں گے، مرتبہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی۔

قیمت حصہ اوّل :- ۱۲-۵۰ قیمت حصہ دوم :- ۱۳-۵۰ "منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ نومبر ۱۹۷۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت پندرہ ۱۵ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد

جلد ۱۲۴ ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۹ء عدد ۵

مضامین

شذرات

۲۶ ر ۲۷ ر اکتوبر ۱۹۷۹ء کو مغربی بنگال کی حکومت کی طرف سے کلکتہ میں علامہ محمد اقبال کی صدسالہ سالگرہ کی تقریب بڑے اہتمام اور سلیقہ سے منائی گئی۔ اس میں حکومت کی فیاضی اور کلکتہ کے لوگوں کی مہمان نوازی کو دیکھ کر دہلی میں امیر خسرو اور اقبال کے بین الاقوامی سمینار یاد آئے جن میں ہندوستان کے اسکالروں کی بے دقعتی ہر طرف دکھائی دیتی تھی۔

۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء میں ان دونوں سمینار کے موقع پر بیرونی نمایندے تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرائے گئے، لیکن ہندوستانی نمایندوں کو تین روز کے لئے ایک بہت ہی حقیر رقم دے دی گئی کہ وہ جہاں چاہیں ٹھہریں اور کھائیں، پھر تو ان کے لئے دہلی کے کوچے مصور نظر آنے کے بجائے تنگ ہی دکھائی دئے، کلکتہ میں کوئی بین الاقوامی اجتماع نہ تھا، سو دیشی مقالہ نگار اور شاعر ہی مدعو تھے، مگر ان کو کلکتہ کے شاندار اور مشہور ہوٹل گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں ٹھہرایا گیا، مجلس استقبالیہ کے اہم ارکین کے ساتھ رضا کار ہر وقت ان کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو پوری کرتے رہے۔

مغربی بنگال کے گورنر جناب ٹی۔ این۔ سنگھ اس کے وزیر اعلیٰ جناب جیوتی باسو وہاں کی اسمبلی کے اسپیکر جناب منصور حبیب اللہ اور ڈپٹی اسپیکر جناب کلیم الدین شمس کی طرف سے ڈنر، لنچ اور چائے کی پارٹی ہوئی جن میں یہ تمام میزبان جناب محمد امین وزیر ٹرانسپورٹ کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے اپنے مہمانوں سے ملے، بنگال کا سحر اور وہاں کی زلف مشہور رہے، اس تقریب کے مہمان وہاں کے

اخلاق کی سحر آمیز زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہے۔

جلسے رابندر سدن میں ہوتے رہے، اس کے ڈائس پر اقبال کی ایک بڑی تصویر نمایاں کر کے رکھی گئی تھی، رسم افتتاح اقبال کے ترانۂ ہندی سے ہوئی، جناب باسو نے افتتاحیہ تقریر کی، جناب منصور حبیب اللہ نے صدارتی خطبہ پڑھا، جس میں انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اقبال کو صرف اسلامی شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا صحیح نہیں، ان کی شاعری کی عالمگیریت اور آفاقیت کو بھی روشن کرنے کی ضرورت ہے۔

اس میں ایک سمینار اور مشاعرہ بھی تھا، سمینار کی صدارت کے لئے راقم کے نام کا پہلے سے اعلان کر دیا گیا تھا، میرے انگریزی خطبہ میں اتفاق سے وہ ساری باتیں تھیں جو جناب حبیب اللہ منصور صاحب چاہتے تھے، یعنی اقبال کی شاعری میں سب کچھ ہے، جلوۂ حسن بھی ہے، حقیقتِ حسن بھی، تسخیرِ فطرت بھی، جلال و جمال بھی، منظر نگاری بھی، فصلِ بہار کی رعنائی بھی، دردِ عشق بھی، فلسفۂ عشق بھی، اسرار خودی بھی، زمان و مکان کے حقائق بھی، سرگذشتِ آدم بھی، احترام آدمی بھی، سیاسی بصیرت بھی، پیامِ مشرق بھی، جمہوریت، اشتراکیت اور اجتماعیت پر تبصرہ بھی، یورپ کی مادی تہذیب سے بیزاری بھی اور فرنگی فلسفیوں پر نکتہ چینی بھی۔

مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) نے اقبال کو اُن کے خطوط کے آئینہ میں پیش کیا، پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں یونیورسٹی) اس وقت تک اقبالیات کے بہت بڑے اجارہ دار ہو چکے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اقبال کی فکر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اب ان کے فن شعری کا گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کے اس فن کے کمالات ہی سے ان کی فکر نمایاں ہوئی، اس لئے انھوں نے اپنے مقالہ میں اقبال کی منظر نگاری کی خوبیاں دکھائیں، ڈاکٹر محمد حسن (جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی) نے اقبال کے مختلف پہلوؤں پر ایک بہت ہی دل آویز تقریر کی،

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے فصیح اور بلیغ انگریزی میں اقبال کے فکری پہلوؤں پر اپنا مقالہ پڑھا، پروفیسر ہیرالال چوپڑا (کلکتہ یونیورسٹی) نے اقبال پر ایسی پُر جوش تقریر کی کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی بانگِ درا سے سامعین کے ذہن پر ضرب کلیم لگا رہے ہیں، سیمنار میں حاضرین کی بہت بڑی تعداد تھی، مقالے اور تقریریں بڑی متانت اور سنجیدگی سے سنی گئیں، کلکتہ کے لوگوں کا بیان ہے کہ ایسا کامیاب سیمنار یہاں پہلے کبھی نہیں ہوا۔

مشاعرہ کی صدارت ملک کے مشہور شاعر جناب علی سردار جعفری نے کی، شعراء کو سننے کے لئے بڑا ہجوم تھا، رات بھر مشاعرہ جاری رہا، جس سے اردو شعر و شاعری سے کلکتہ کے لوگوں کی غیر معمولی شیفتگی کا اظہار ہوا۔

اس تقریب کو کامیاب بنانے میں یوں تو اس کے تمام عہدیدار پیش پیش تھے، مگر مجھ کو جناب خواجہ محمد یوسف سینیر اڈوکیٹ کلکتہ ہائی کورٹ، جناب احمد سعید ملیح آبادی، اور جناب سالک لکھنوی بہت زیادہ متحرک اور نمایاں نظر آئے، خواجہ صاحب کلکتہ ہائی کورٹ کے کامیاب اڈوکیٹ ہیں، کیا عجب کہ بہت جلد وہاں کے جج کے عہدہ پر فائز ہوجائیں، انگریزی اچھی بولتے اور لکھتے ہیں، وہاں کے علمی حلقہ کے لئے ناگزیر سمجھے جاتے ہیں، اپنی جسمانی ضخامت کے باوجود اپنی فعالیت میں نوجوانوں کو مات کرتے ہیں، ملیح آبادی صاحب اپنے نامور صحافی باپ جناب عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم کے نامور صحافی فرزند ہیں، روزنامہ آزاد ہند کے اڈیٹر کی حیثیت سے ہر حلقہ میں روشناس ہیں، اپنی فطری صلاحیتوں سے ہر حلقہ میں اثر انداز ہوکر موثر اور مقبول ہوجاتے ہیں، سالک لکھنوی صاحب معلوم ہوا کہ کلکتہ میں کاروبار کرتے ہیں، مگر یہاں کی علمی سرگرمیوں میں پورا حصہ لیتے ہیں، دجیہ شکل پائی ہے، مہمانوں کی پذیرائی میں بڑے اخلاق سے پیش پیش رہے، اس تقریب کے جنرل سکریٹری تھے۔

اس موقع پر بنگال اردو اکیڈمی بھی قائم ہوئی، بنگال کے گورنر جناب ٹی۔ این۔ سنگھ نے جو
...ارس کے رہنے والے ہیں، اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ اردو ایک شیریں خوبصورت اور مقبول زبان ہے،
...ن کے والد اور دادا نے بھی اردو میں کچھ کتابیں لکھیں، جن کے مسودے ان کے گھر میں کچھ دنوں
...ک موجود تھے، جناب جیوتی باسو نے اردو اکیڈمی کے صدر کی حیثیت سے کہا کہ اردو کے فروغ میں
بنگالی ہندوؤں کا بھی حصہ ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں بھرت چندر رائے، راجہ اپوربو کرشن
بہادر کنور، راجہ رام موہن رائے، جنمے جے مترا رمان، امیناش چندر چٹرجی اور تارانی چرن متر کے
نام خاص طور پر لئے، اپنے سامعین کی توجہ اس طرف بھی دلائی کہ اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما"
ہری دت کی ادارت میں کلکتہ ہی سے نکلا، پھر تالیوں کی گونج میں یہ بھی کہا کہ جن ریاستوں میں اردو
بولنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہو، وہاں اردو کو ثانوی زبان ضرور قرار دینا چاہئے، ان تقریروں
کو سن کر یہ خیال ہو رہا تھا کہ حکومت کی طرف سے ایسی دلپذیر اور مصلحت آمیز تقریریں ہی اردو
بولنے والوں کے حصے میں آتی ہیں، مگر جب مغربی بنگال کے وزیر تعلیم نے اس موقع پر یہ اعلان
کیا کہ کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیر قائم ہو رہی ہے تو پھر خوشی ہوئی۔

کلکتہ کے ۳۶ گھنٹے کے قیام میں بڑی مشغولیتیں رہیں، وہاں کی ایران سوسائٹی اپنے
علمی کارناموں کی وجہ سے ملک سے باہر شہرت حاصل کر رہی ہے، اس کے بانی ڈاکٹر محمد اسحاق
مرحوم کے اخلاص کی برکت سے اس کے مخلص خدمت گذار اس کو مزید ترقی دینے میں لگے ہوئے ہیں،
اس کے موجودہ سکریٹری جناب ایم۔ اے۔ مجید ہیں جو خاموشی سے ٹھوس اور مفید علمی کام انجام دینے
میں مشہور ہیں، یہاں سے انگریزی میں سہ ماہی رسالہ انڈو ایرانیکا نکلتا ہے جو اپنے سنجیدہ اور
تحقیقی مضامین کی وجہ سے بہت ہی وقیع رسالہ ہے، اس کے روح رواں خواجہ محمد یوسف ہیں،
ان دونوں حضرات نے اپنی غایت محبت میں میرے لئے ایران سوسائٹی میں ایک

نشست بھی رکھی، جس میں وہاں کے اور عہدیدار بھی شریک ہوئے، یہاں پروفیسر جگدیش نرائن سرکار بھی موجود تھے، جو کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے مایۂ ناز استاد رہ چکے ہیں، بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، ان سے پرانی ملاقات ہے، میں نے ان سے اثنائے گفتگو میں کہا کہ سرجدوناتھ سرکار نے مغلیہ دور پر کتابیں لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی، مگر ان کی تحریروں میں بڑا تضاد ہے، انھوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ وہ لکھتے وقت جس نتیجہ پر پہونچتے اس کا برملا اظہار کر دیتے، مثلاً وہ شیواجی کو ایک قومی ہیرو قرار دیتے ہیں، مگر اس کو ڈاکو (روبر) بھی لکھ گئے ہیں۔

اس نشست میں ڈاکٹر عطا کریم برق سے بھی ملاقات رہی، جو کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی و عربی کے بڑے لائق استاد سمجھے جاتے ہیں، بڑی روانی اور بے تکلفی سے فارسی نثر لکھتے ہیں، ایسی مہارت کسی ہندوستانی اہل قلم کو کم ہوگی، اسی سال ان کو حکومت کی طرف سے فارسی کے عالم کی سند بھی ملی ہے، ایران کے قاچاری دور میں شیخ صفی علی شاہ بڑے مشہور اہل دل بزرگ گذرے ہیں، جو بڑے اچھے شاعر اور نثر نگار بھی تھے، ڈاکٹر عطا کریم برق نے ان پر جستجو در آثار صفی علی شاہ کے نام سے فارسی میں جو ایک کتاب لکھی ہے، وہ تہران سے شائع کی گئی ہے، فارسی میں ان کی نثر نگاری کی یہ بہت بڑی سند ہے۔

مولانا محفوظ کریم معصومی (مدرسۃ العالیہ کلکتہ) سے عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تو لپٹ کر ملے اور بڑی اپنائیت دکھائی، عربی بھی بولتے اور لکھتے ہیں، اردو میں بھی برابر اچھے مضامین لکھا کرتے ہیں، اس وقت مدرسۃ العالیہ کے روح رواں بنے ہوئے ہیں۔

جناب شمس کلیم کی چائے کی دعوت میں ڈاکٹر محمد صابر خاں سے بھی ملاقات ہوئی، بنگال کے مشہور اہل قلم ہیں، انھی عربی کی ایک کتاب التاجی ایڈیٹ کی ہے، زیادہ تر انگریزی میں لکھا کرتے تھے، اب اردو میں بھی لکھنے لگے ہیں، بنگال پبلک سروس کمیشن کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔

اس قیام میں ڈاکٹر مجیب الرحمٰن صدر شعبۂ فارسی مولانا آزاد کالج بہت ہی اخلاق و اخلاص سے برابر ملتے رہے، انگریزی میں اپنی ایک تصنیف ہسٹری آف مدرسہ ایجوکیشن اور اردو میں تاریخ بارہ گانواں

دی، وہ بنگال کے مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں، اس لئے وہاں کے مدرسوں پر ایک پُر از معلومات کتاب لکھنے میں ان کو ہر قسم کی مدد حاصل ہوئی، ان ہی کے ہونہار صاحبزادے جناب رئیس انور رحمان نے بچنے جئے میر ارمان کے تذکرہ نسخۂ دل کشا کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، اس میں انھوں نے مقدمہ اور تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے اچھے علمی و ادبی مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے، اس کی جو رسم اجراء ڈاکٹر محمد حسن کی صدارت میں ایران سوسائٹی میں ہوئی، اس میں بھی شرکت کا موقع ملا، اس تذکرہ کو پڑھ کر مسرت ہوئی کہ ایک بنگالی ہندو نے اردو کی تذکرہ نگاری میں بھی حصہ لیا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے والد جناب تلوک چند محروم کے کلام کا مجموعہ نیرنگ معانی عطا کیا، انھوں نے اپنے والد پر "تلوک چند محروم" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے، وہ بھی دی، اپنی نظموں کے دو کتابچے "ماتم سالک" اور "شاعر کی آواز" بھی دئے۔

جناب ابو بکر جیلانی نے اپنی تصنیف "کنور ایک عظیم بنگالی شاعر" لا کر دی، بہت عمدہ چھپی ہے، دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی، اس میں انھوں نے اپورو کرشن چندر کنور کی شاعری کا جو تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس سے ان کی ادبی خوش مذاقی اور تصنیفی خوش سلیقگی کا اظہار ہوتا ہے، کنور کی غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ ایک بنگالی ہندو شاعر بھی اردو کے غزل گویوں میں نمایاں جگہ پا سکتا ہے۔

پرویز شاہدی میرے ہمدرس اور ہم جماعت تھے، جوانی میں وفات پا گئے، پٹنہ کے رہنے والے تھے، مگر کلکتہ پہونچ کر اپنی سخن سنجی میں ایک منفرد حیثیت حاصل کر لی تھی، وہاں بہت مقبول ہوئے ان کی نظمیں اور غزلیں اب بھی وہاں شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں، ان کے کلام کا ایک مجموعہ "تثلیث حیات" ان کی بیگم صاحبہ نے پیش کیا، جس کو ہاتھ میں لیتے ہوئے حسرت کے ساتھ پرویز شاہدی کی طالب علمی کا زمانہ یاد آ گیا۔

پروفیسر عبد الستار شاہدی صدر شعبۂ فارسی و اردو ہُگلی کالج چنسورہ نے بقا نظامی عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام "صہبائے بقا" لاکر دیا، جو بڑے اہتمام سے طبع ہوا ہے، حضرت بقا عظیم آبادے کلکتہ آئے، پھر ڈھاکہ چلے گئے، جہاں سے ۱۹۶۹ء میں پاکستان جا بسے، ان کے شعری اور نثری کارناموں کو جناب عبد الستار شاہدی نے جس طرح نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، ایسی خوش قسمتی کسی شاعر یا مصنف کو اپنی زندگی میں کم حاصل ہوئی ہوگی۔

انجمن مفید الاسلام کے جناب محمد اسحٰق صاحب عرف مولانا عزیزانہ طور پر ملے اور اپنا ایک غیر مطبوعہ مضمون "اقبال جذباتی ہم آہنگی کے آئینہ میں" دے کر اس پر رائے لکھ کر بھیجنے کو کہا، جناب آغا رشید مرزا دہلوی نے جو ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کے خاندان سے ہیں، اپنا ایک مطبوعہ مضمون "کاہے کو دینی بدیس: دلی کی شادیاں" پڑھنے کو دیا، جس کو ریل گاڑی ہی پر پڑھ کر محظوظ ہوا، ان ادبی فوائد کے ساتھ جناب منظور احمد صاحب مالک رائل ہوٹل زکریا اسٹریٹ نے ایک پُر تکلف دعوت سے تواضع کی، وہ دار المصنفین کے رکن دوامی بھی ہیں، جناب حاجی عبد القیوم صاحب مالک امینیہ ہوٹل کلکتہ کے فلاحی کاموں میں برابر حصہ لیتے رہتے ہیں جس سے ان کی ایک امتیازی حیثیت ہوگئی ہے، وہ برابر ساتھ رہے اور اپنے رس بھرے اخلاق سے گراں بار کیا، عارف کریم صاحب انجینیر ہیں، مگر جماعت اسلامی کے ہفتہ وار ریڈینس کے خصوصی نمایندے بھی ہیں، گفتگو میں اپنی مذہبی حمیت کا اظہار کرتے رہے۔

کلکتہ کے قیام میں یہ اثر ہوا کہ یہاں کے علمی میکدہ میں اردو زبان و ادب کے شیشہ و ساغر بھی خوب چھلکتے اور چھلکتے رہتے ہیں، جس پیمانہ پر اس کی بادہ خواری اور سرشاری یہاں جاری ہے اس سے اس زبان کے قوی اور صحت مند رہ کر زندہ رہنے کا ثبوت فراہم ہوا۔

مقالات

سنائی کا مذہب

از ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مشہور سنائی شناس آقائے مدرس رضوی نے دیوان سنائی کے مقدمہ میں سنائی کے مذہب کے بارے میں لکھا ہے :

"واز آثار و اشعارے کہ یادگار جوانی و آغاز شاعری اومی باشد معلوم می شود کہ حکیم در ابتدائے حال قطعاً پیرو اہل سنت و جماعت و برکیش و مذہب امام اعظم بودہ است و مدایحے کہ ابوحنیفہ را گفتہ و ہنوز در دیوانِ او باقی است دلیل آنست، از جملہ قصیدہ ایست در بطلانِ حجت دہریان (ص ۲۳۸، دیوان حاضر) کہ سرتا سرآں مدح امام اعظم است و مسلماً اگر دراں وقت حکیم شیعی می بود ہیچگاہ چنیں مدحے از ابوحنیفہ نمی کرد، بنا براین در حنفی بودن وے دراں وقت جائے شک و شبہہ نیست، اما در اواخر عمر و ہنگامِ نظمِ حدیقہ بطور قطع و یقین دیگر پیرو مذہب ابوحنیفہ نبودہ وایں ابیات حدیقہ :

اے ترا راہ گشتہ رائے وقیاس   بتر از راہ دینِ خود مشناس

راہ دین ست محکم تنزیل   شرع را مرتضیٰ دہد تاویل

جز ازیں جملہ ترہات شمر   کار خود کن، بقول کس منگر

کہ رائے و قیاس را کہ اساس و پایۂ مذہب ابوحنیفہ است بدترین راہہا خواندہ،

دلیل قطعی است کہ وے در ایں وقت بر مذہب امام اعظم نبودہ و مذہب دیگرے جز مذہب حنفی داشتہ است، ولیکن معلوم نیست کہ بعد ازاں بمذہب شافعی کہ نزدیک ترین مذاہب اہل سنت و جماعت بمذہب شیعہ است گرویدہ ویا چناں کہ جمعے ادعا کردہ اند کیش شیعہ را اختیار کردہ است۔"

اس بیان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ یہ بات یقینی ہے کہ جوانی اور شاعری کے آغاز میں وہ امام اعظم کے پیرو یعنی حنفی تھے،

۲۔ یہ بات بھی قطعی ہے کہ آخر عمر میں خصوصًا حدیقۂ سنائی کے نظم کرنے کے موقع پر وہ حنفی نہ تھے، اس لئے کہ حدیقہ کی ابیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رائے و قیاس کو بدترین راہ سمجھتے تھے، اور یہی روش امام اعظم کی تھی۔

۳۔ ممکن ہے وہ شافعی ہوں، یا یہ بھی قیاس ہو سکتا ہے کہ وہ شیعہ ہو گئے ہوں۔

دراصل آقائے مدرس رضوی کے اس بیان کی تہ میں ان کی یہ خواہش مضمر ہے کہ سنائی کسی طرح شیعہ ثابت ہو جائیں، لیکن سنائی کے کلام میں واضح طور پر ایسے دلائل و شواہد موجود ہیں جن کی بنا پر ان کو بغیر تاویل و توجیہ کے شیعہ نہیں کہہ سکتے۔ ان کے ہاں خلفاء اربعہؓ کی مدح تواتر کے ساتھ نظم، نثر، قصائد، مثنویات وغیرہ میں ملتی ہے، علاوہ بریں انھوں نے امام اعظم کی مدح بھی اسی آب و تاب سے کی ہے۔ حدیقہ میں امام اعظم کے ساتھ ہی ساتھ امام شافعی کی بھی بڑی تعریف کی گئی ہے، اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ ایسے حالات میں آقائے مدرس رضوی نے یہ توجیہ پیش کی کہ شروع میں تو وہ یقینًا حنفی تھے لیکن آخر میں شافعی ہوئے جو مذہب شیعہ کے نزدیک ہے، یا واقعی شیعہ ہو گئے تھے۔ اب میں سب سے پہلے آخری عہد کے کلام کا ایک جایزہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

سنائی کی حدیقہ ۵۲۵ کے حدود میں لکھی گئی اور اس لحاظ سے یہ مثنوی ان کے آخری ام میں سب سے زیادہ نمایاں مقام کی حامل ہے۔ اسی آخری کلام میں سنائی نے اوّل حضرت م اعظمؒ، پھر امام شافعیؒ، پھر دونوں کی ایک الگ عنوان کے تحت تعریف کی ہے۔ ذیل میں ہر نوان کے تحت کچھ اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے سنائی کے مذہب پر بخوبی روشنی پڑتی ہے:

مدح امام مسلمانان ابوحنیفہ نعمانؒ بن ثابت رضی اللہ عنہ

همه را باز رائے نعمانی | آشتی داده بر مسلمانی
آفتاب سپهر معروفی | بدر دیں بوحنیفۂ کوفی
همه را از پے صلاحِ جہاں | مغز سنت نہاده اندر جاں
از پے فطنت و ہدایتِ او | پادشاہاں بزیرِ رایتِ او
پادشاهِ ائمۂ دیں بود | علم و حلم و سخاش آئیں بود
راه دیں بر خلائق آساں کرد | همه را در اصول یکساں کرد
علم او کرده جملہ را یک رنگ | گشتہ ناچیز زرق و حیلہ و رنگ
بوده در زیرِ گنبد ازرق | حجت صدق در محجۂ حق
دیده بے واسطہ حکایت و نقل | چہرۂ سنت از دریچۂ عقل

لہ حدیقہ چاپ مدرس رضوی میں اشعار سے قبل یہ عنوان آیا ہے: "فی مناقب الامام الاعظم الزاهد مفتاح الشریعة کنوز الذریعة نظام الدین قوام الاسلام ابی حنیفة نعمان بن ثابت الکوفی رحمة الله علیه، ذکر النعمان صون عن الحرمان، قال الشافعی رضی الله عنه: الفقهاء کلهم عیال ابی حنیفة رحمه الله۔" ص ۲۷۲۔

حجت اصل و فرع نعماں بود | نعمت جان شرع نعماں بود
در رہِ بوحنیفہ کوفی | پایتاں ہمچو خرقہ صوفی
باز بہر کمال کسب دیبار | دست تاں جوں قبائے روز بہار
صدق او در قضائے قدوسی | بازگشتہ چو بالِ طاؤسی
دادہ او را برائے دولت ودیں | دل وجانش زعلم وفضل ویقیں
حجتِ اوست واضح وواثق | نکتۂ اوست لایح و لایق
بخت او چوں بہار امیر جہاں | خردش چوں شگوفہ پیر وجواں
پیروانش زما درود و سلام | بادحشرم بدو بدارسلام

(کلیات اشعار چاپ کابل ص ۹۷ بعد)

ان اشعار کی روشنی میں آقائے مدرس رضوی کا یہ قول کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ سنائی حدیقہ لکھتے وقت قطعاً امام ابو حنیفہ کے پیرو نہ تھے۔ حالانکہ خود اسی مثنوی میں امام صاحب کی تعریف کے بعد واضح طور پر وہ دعا کرتے ہیں کہ خدا! میرا حشر ان کے ساتھ کرے، اس سے زیادہ امام اعظم کی پیروی کے لئے اور کون سی دلیل درکار ہے، اس کے بعد امام شافعی کی تعریف کی ہے، اس سلسلہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مدح امام الایمہ محمد ادریس الشافعی رحمۃ اللہ علیہ

چوں فرو شد چراغِ دینِ نبی | روے بنمود ماہِ مطلبی
درسِ دیں ساخت از پئے تقدیس | صدرِ سنت محمد ادریس
نسبتِ اوست دیدہ مرجاں را | سنتِ اوست عقل وایماں را
از پے طالبانِ نورِ یقین | خویشتن وقف کردہ بر درِ دین

اودست دررہِ دیں امام بحق | کہ امامت ورا سزد مطلق
ہر حدیثے کہ بہترِ دیں گفت | شرحِ آں داد وعلمِ آں بنہفت
کلکِ اوشد خزانۂ اسرار | درسِ اورا فرستہ کرد نظار
گاہ تدریس وگاہ شرحِ علوم | حاکم او بود وعالمے محکوم
برخود و عقلِ خویش ہیچ نساخت | دررہِ شرع خویشتن درباخت
در تراجع ز حسن وخلقش دیں | باترفع ز علم وحلمش دیں
مصطفےٰ گفتہ او شنیدہ بجاں | زاں نمودہ بشرعِ او برہاں
تا حدیثِ پیامبراں خواندہ | برخودش اعتماد ناماندہ
راکبانِ درش اثیر فرس | ہمرہانِ دمش عبیر نفس
جو دِ او ہمچو کعبہ آینہ جوے | خلقِ او چوں بہارِ خنداں روے
یافتہ حلّہٗ صفا ومصاف | دست وکلکش چو طبع دیباباف
بود کوتہ ز بہر شرع وشعار | دست او ہمچو زیر پوش بہار

(کلیات اشعار ص ۸۰ - ۸۱)

واضح رہے کہ امام اعظم کے پیرو کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایمۂ اربعہ کے بارے میں نہ صرف حسن ظن بلکہ ان سے محبت وعقیدت رکھے، اس اعتبار سے سنائی کی حضرت امام شافعی کی مدح سرائی ان کے حنفی ہونے میں مانع نہیں، آپ ملاحظہ کریں گے کہ شاعر نے جس طرح امام اعظم کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے، ویسی وابستگی امام شافعی کے اشعار میں نہیں ملتی۔

اب ذیل میں دونوں اماموں کی ساتھ ساتھ مدح سرائی کی جاتی ہے:

در مناقبِ ہر دو امام گوید

ہر دو ہمراہِ راہِ دیں بودند　　ہر دو ہم کاسۂ یقیں بودند
آں[1] یکے آفتابِ محفل و صدر　　واں[2] دگر بدرِ لیک درشبِ قدر
آں بفرقد نہادہ مرقدِ خویش　　وایں ز اسناد کردہ مسندِ خویش
آں بحجت گرفتہ سرمایہ　　وایں ز سنت بہ بستہ پیرایہ
آں بدل تیغِ حجۃ الوسطیٰ　　وایں چراغِ محجۃ الوثقیٰ
آں یکے پیشوائے راہِ صواب　　وایں دگر مہتدی بگاہِ جواب
آں یکے آفتاب دین افزائے　　وایں دگر رہنمائے دین خدائے
آں امامِ مدرسِ زاہد　　وایں دگر با دیانت و عابد
آں بسان ستارۂ کیواں　　وایں چو جوزا بنور خود درخشاں
آں بکردار قلزمِ اخضر　　وایں بگفتار حیدرِ صفدر
آں بمعنی مثالِ بحرِ محیط　　وایں مدعوے جہانِ علم بسیط
آں شدہ حکمِ شرع را حاکم　　وایں بُدہ علمِ محض را عالم
آں یکے شرع را چو ارکانست　　وایں مر اسلام را تن و جانست
آں بحجت چراغِ دینِ رسولؐ　　وایں بسنت جمالِ آلِ بتولؓ
کوفی اندر طریقِ دیں کافی　　شافعی در دو جہل را شافی
لطفِ ایں دادہ بیخ دیں را آب　　قہرِ آں کردہ قصرِ کفر خراب
ہر دو بودہ ز اجتہاد و تقوی　　ساز گارِ ستانۂ نبویؐ

---

[1] یعنی امام اعظم　[2] یعنی امام شافعی

ہر دو را دل بشرع حاذق بود   ہر دو را صبح شرعِ صادق بود
جانِ من ہر دو را فدا بادا   عقل را قولِ شاں غذا بادا
باد یزداں ز ہر دو آں خوشنود   کہ بسے خلق یافت زایشاں سود
توکہ اندر خلافِ ہر دو بوی   از بد و نیک ہر دو تن تو گوی
توکہ دیں را بکیں بدل کردی   تو چہ دانی حدیث یک دردی
خائن و خاسر آں کسے را داں   کہ ز گفتار شاں بتافت عناں
تا نہ گردد تباہِ کار و سفیہ   ندرد پوستینِ مردِ فقیہ
توکہ یک مسئلہ را ندانی حل   با سخن داں چرا کنی تو جدل
قامتت شد دوتا ز بد خوئی   کہ چرا قامتِ تو یکتوئی
قامتِ آں دوتا ز زشتی خو   کہ چرا قامتِ فلان یکتو
ایں دوتا کردہ باز قامت راست   کہ چرا قامت فلان یکتاست
دور دور است ساسی از شاہی   ہمچو راز الٰہی از لاہی

اندر پند و نصیحت ہر دو اصحاب گوید

اے ہوا کردہ زیر بار ترا   با چنیں ترّہات چہ کار ترا
از برائے سگان و گرگاں را   ایں چنینہا مگو بزرگاں را
ایں ہمہ داعیانِ اللہ اند   نہ از آنہا کہ داعیٔ جاہ اند
دیں طلب کن گرت غم اینست   کہ کلید در دل از دین است
ہیچ را در جہاں ز جہل و ز ظن   بے خبر وار پائے پشت مزن
از پے شاخ و بیخ شرع مکن   وز پے جاہ راہ خلق مزن

یک جهانند زیر این افلاک کام پر زهر و خانه بی تریاک
همه خود را گرفته اندر چنگ همه با سایهٔ خود اندر جنگ
همه از آب این دو روزه نهاد تازه و تر چو رودهٔ پر باد
تو هوس دانی و هوا و جدل ور پی عامه گاو و گرد خیل
جز هوا و هوس نیارد کین شافعی آن و بو حنیفه چنین
تو چه دانی که بو حنیفه که بود چه شناسی که شافعی چه شنود
گر ترا بو حنیفه دیو نمود او سوی حق بجز فرشته نبود
شافعی ار سوی تو بولهب است بسوی حق امین و حق نسب است
همه نیک اند بی حکومت تو تو بدی و آن سگ خصومت تو
سگ کین از بغل برون انداز سگ بزیر بغل میا بنماز
مده از دست خود بشهوت و کین پس تحصیل عامه داران دین
کم کن این گفت و گوی بهر خدای گنگ شو ساعتی و ژاژ مخای
حسد و جهل کرد آلت جنگ دیو حقدت گرفته اندر چنگ
هر کرا چشم عقل کور بود نبود آدمی ستور بود
زین چنین ترهات دست بدار کار کن بگذر از ره گفتار
ناصحم قول من نکو بشنو ورنه کم کن سخن بدوزخ شو
بنده ام بنده ام امامان را نشنوم قول خام خامان را
کاشف شبهت تو قرآنست واضح حجت تو قرآنست
من بگفتم نصیحتی در دین گر بهی ور بدی تو دو دم ازین

گر نہ بد گیر بر من کیں | در چنینی چنیں مکن در دیں
من اگر جمع یا پریشانم | ہر چہ ہستم از آن ایشانم
من نمودم ترا طریقِ نجات | در نخواہی سر تو در سی تات

(کلیات اشعار ص ۸۱ - ۸۴)

اوپر جو اشعار نقل کیے گئے ہیں ان سے واقعہ کی صحیح حقیقت معلوم ہو جاتی ہے سنائی کے دور میں حنفیوں اور شافعیوں میں بڑا اختلاف تھا، اس کے نتیجے میں احناف اور شوافع نہ محض ایک دوسرے پر رکیک حملے کرتے، بلکہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ امام اعظم اور امام شافعی بھی ان کے حملے کی زد میں آ گئے، سنائی اس سے بے حد متاثر اور دلگیر تھے، چنانچہ انھوں نے ان دونوں ائمہ کے موقف کی پوری وضاحت کی اور ثابت کیا کہ دونوں حق پر تھے اور اس لحاظ سے دونوں کے پیرو راہ راست پر ہیں، نہ کسی کے پیرووں کو اور نہ ان حضرات کو ہدفِ ملامت بنایا جائے. جو لوگ محض حسد و کینہ کی وجہ سے عوام میں اپنا اقتدار بڑھانے کی بنا پر امام اعظم یا امام شافعی کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں، وہ جاہل محض ہیں، علم سے ان کا کوئی سروکار نہیں، دونوں امام حق پر ہیں، ان کی پیروی درست ہے، کسی کو برا کہنے سے خود اپنا ایمان معرضِ خطر میں ہے. خود سنائی اگرچہ حنفی تھے، مگر جس طرح وہ امام اعظم کو محترم جانتے اسی طرح ان کے نزدیک امام شافعی بھی ہر طرح کے احترام کے مستحق تھے، وہ دونوں اماموں کے بندہ تھے. اور ان کے نزدیک یہی راہ درست تھی، دراصل دونوں میں فرق کرنا خامی اور جہل کی دلیل ہے، یہ اشعار حدیقہ کے ہیں، ان اشعار کی روشنی میں آقائے مدرس رضوی کے قول کو پرکھا جاتا ہے تو ان کے خیالات ہیچ و پوچ اور بے بنیاد ٹھہرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"لیکن وہ (سنائی) اپنی حیات کے آخری دور میں خصوصاً حدیقہ نظم کرتے وقت قطعی اور یقینی طور پر وہ ابو حنیفہ کے مذہب کے پیرو نہ تھے، اور حدیقہ کے یہ اشعار:

اے وہ شخص کہ تو نے رائے و قیاس کو اختیار کر رکھا ہے، یہ بدترین راہِ دین ہے، جو تو نے اختیار کر رکھی ہے، راہِ دین محکم تنزیل ہے، در اصل شرع کی تاویل حضرت علیؓ کے وجود سے ہے۔ اس کے علاوہ بقیہ سب بکواس ہے، تو اپنا کام کر اور دوسرے کی بات نہ سن۔

رائے و قیاس کو جو مذہب ابو حنیفہ کی اساس ہے، بدترین راہ بتاتے ہیں، اس بات کی دلیل ہیں کہ سنائی امام اعظم کے مذہب پر نہ تھے۔"

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک مشہور "سنائی شناس" حدیقہ میں مندرج سیکڑوں اشعار جن میں شاعر امام اعظم اور پھر امام شافعی سے اپنی وابستگی نہایت واضح طور پر ظاہر کرتا ہے، یہ کیونکر کہہ سکتا ہے کہ وہ امام اعظم کے پیرو نہ تھے۔ لطف یہ ہے کہ جن تین اشعار کی روشنی میں انھوں نے رائے و قیاس کی راہ کو بدترین راہِ دین لکھا ہے، ان کی نوعیت اس لحاظ سے مشتبہ ہے کہ وہ کلیات اشعار حکیم سنائی (نسخۂ کابل) سے خارج ہیں، ثانیاً خود سنائی اپنے آپ کو واضح طور پر امام اعظم کا پیرو قرار دیتے ہیں، اور حدیقہ کے پچاسوں اشعار میں اپنے اس عقیدے کا اظہار کرتے ہیں، ایسی صورت میں آقائے مدرس رضوی کا حدیقہ کے تین شعر سے جن میں رائے و قیاس کی مذمت کی گئی ہے، یہ استدلال کہ ان کی نسبت امام اعظم کی طرف ہے، اور اس بنا پر سنائی امام اعظم سے بیزار ہیں، لغو اور مہمل توجیہ ہے، اس لئے کہ سنائی کے بیان کا یہ تضاد کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

اب تک حدیقہ سنائی سے جو ان کی آخر عمر کی تالیف ہے استشہاد ہوا ہے کہ سنائی

آخر عمر تک حنفی تھے، اب دیوان سے ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو حضرت ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کی بزرگی و احترام پر دلالت کرتے ہیں:

قاضی عبدالودود کی مدح اس طرح شروع ہوتی ہے:

اے چو نعمان بن ثابت در شریعت مقتدا — وے بحجت پیشوائے شرع و دینِ مصطفےٰ

از تو دشمن راہِ حجت ہمچو گردون از نجوم — وز شاداں اہلِ سنت ہمچو بیمار از شفا

یہ ابیات ۵۰۹ھ سے قبل لکھے گئے ہوں گے، اس لئے کہ قاضی مذکور سلطان مسعود شاہ غزنوی متوفی ۵۰۹ھ کے دور میں قاضی غزنین تھے، قاضی کا سنی اور حنفی ہونا اظہر من الشمس ہے،

قاضی محمد بن منصور سرخسی کی مدح میں یہ ابیات آئے ہیں:

آفتابِ عقل و جاں اقضی القضاۃ دیں کہ ہست

چوں قضائے آسماں اندر زمیں فرماں روا

آں سر اصحابِ نعمان کز پے کسب و شرف

ہر زمانے قبلہ بر پایش دہد قبلہ دعا

رفت سید از جہاں و چیت مشکل کرد حل

بوحنیفہ رفت و زود در گرد عالم قال ماند

دختر خود بتوشہ دادم زیرا کہ توئی — مصطفےٰ سیرت و حیدر دل و نعمان مذہب

(مظاہر مصفا، ص ۴۴)

بوحنیفہ گرچہ بود اندر شریعت مقتدا — کس نہ شست از آبِ مسوخی سخنہائے زنا

(ص ۸۰)

لہ یہ اصحاب ابوحنیفہ میں تھے۔

دررہِ دیں چو بوحنیفہ زعلم چوں چراغے بجز منیر مباش

(ص ۳۲۳)

بوحنیفہ وار پاے شرع بر دنیا نہیم بوہریرہ وار دست صدق در انباں کنیم

(ص ۴۱۳)

چوں بدار الملک عباسی امامی آمدیم تازہ رخ چوں برگ وشاخ از نطرۂ باراں شویم

از برائے حقِ صاحب مذہب اندر تہنیت سرقدم سازیم وسوے تربتِ نعماں شویم

(ص ۴۱۶)

ذیل میں اس منظومہ کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جو امام اعظم اور ایک دہری کے مناظرے سے متعلق ہے (دیوان ص ۲۳۸ بعد)

اے خرد مند موحد پاک دیں ہوشیار از امامِ دینِ حق یک حجت از من گوش دار

آں امامے کو زحجت بیخ بدعت را بکند نخلِ دیں در بوستانِ علم زو آمد ببار

آنکہ در پیشِ صحاباں فضلِ او گفتے رسول تا قیامت داد علمش کارِ خلقاں را قرار

شمعِ جنت خواند عمر را نبی یکبار و بس بوحنیفہ را چراغِ امتاں گفت او سہ بار

چوں بدیاء آمد بکوفہ بوحنیفہ تاجِ دیں آنکہ شد از علم او دینِ محمد آشکار

گفت گردد امتم ہفتاد و سہ فرقت بہم ہست یک زاں اہلِ جنت را مرجع دیگر نار

بوحنیفہ سر و راں قوم اہل جنت است ملحد و اہل ہوا از وے شود مقہور و خوار

دہرے آمد نبز دیک خلیفہ ناگہاں بعض دیے منغضے شوخے پلیدے نابکار

ایں چہ بنداست از شریعت بر تنت گفت اے امیر یا فتنی پادشاہی خوش حوز دبے غم گذار

می چنیں گوید کہ زرق است ایں مسلمانی و فن دیں شریعت چوں روا ای کش بپوست و ننمار

لمومنیں تا حاضر آید پیشِ او | دینِ ایزد را و شرعِ مصطفیٰ را پشت و یار
سد را امامِ دیں چوں بگذارم نماز | پیشِ میر المومنیں آیم و را گو چشم دار
ام نامد بو حنیفه پیشِ شاه | چهره گشته دهری آنجا شاه بُد در انتظار
بودند تا گه کاں در آمد مردِ دیں | شاد گشت از وے خلیفه دهریک درمانده وار
از خجلت که اے نعماں چرا دیر آمدی | داد نعمانش جوابے پُر معانی مرد وار
حالے چوں شنیدم امر شه برخاستم | رخ نهادم سوے قصر و تخت شاهِ تاجدار
رسیدم بر کرانِ دجله کشتی رفته بود | بود نخلے منکر آنجا تخته ها شد بر قطار
ر آمد کشتے شد در زمانش ناپدید | خود بخود بنشست آنجا بر کرانِ رود بار
ن آنگه پیش آمد من نشستم اندرو | زیں سبب تاخیرم افتاد اے پسر معذور دار
ت ملحد شرم دار اے بوحنیفه زیں دروغ | حجتے آورده کیں کس ندارد استوار
ت آنگه بوحنیفه آں امامِ دینِ حق | مر امیر المومنیں را کاے امیرِ با وقار
هم فی گوید که صانع نیست عالم بُد قدیم | ایں ز طبعت و هیولیٰ نیست ایں کردگار
نگے منکر همی گردد که مصنوعات را | صانعے باید مگر دیوانه است ایں گوش دار
بگردد اے ملحد بقرآں قل هو الله یاد گیر | چند باشد بر سرت از جهل و کفر و شک غبار
چوں شنید ایں حجت از وے دهریک خاموش گشت | کرد هر یک خوار او را پس بکردندش بدار
گفت نعماں اے خلیفه بعد ازیں چونیں مکن | ملحداں را پیشِ خود منشاں ازیں پس زینهار
هر چه فرماید ترا قرآن و اخبارِ رسول | اندرو آویز و ملحد را ز مجلس دور دار
گفت پذرفتم ز تو اے حجتِ دینِ خدائے | شاد باش اے بوحنیفه اے امامِ بردبار
اے سنائی شکر ایں دانی که بتوانی گزار | دینِ اسلام و امامِ عالم و پرهیزگار

گر سنائی مستجب گردد بآتش بے گماں زیں مناقب رستہ گردد اے بہادر گوش دار

ان اشعار کی روشنی میں یہ تصور کہ سنائی امام ابوحنیفہ کی پیروی ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کر چکے تھے، سراسر بے بنیاد اور بعید از قیاس ہے۔

دراصل سنائی کے مذہب کے بارے میں غلط فہمی کی بنیاد اس امر پہ ہے کہ وہ آل سفیان کے مثالب کے قائل تھے جیسا کہ ان کے مختلف بیانات سے ظاہر ہے، مثلاً بہرام شاہ غزنوی (۵۱۱ - ۵۴۷ھ) کے نام جو خط ہے، اس میں لکھتے ہیں:

ودلیل برآنکہ بجہل تصرف می کنند آنست
کہ می گویند آل مروان رانکوہیدہ است
وتفضیل امیر المومنین علیؓ را بر دیگر صحابہ رضؓ
نہادہ است، وآں نمی بینند کہ او را
فرود صدیق الاکبرؓ بلکہ فرود از فاروقؓ و
ذی النورینؓ نہادہ چنانکہ ایمۂ سلف نہادہ اند
واز سید کائنات مرتبت محمد مصطفےٰ صلوات اللہ
علیہ اخبار صحیح مروی است وسلف صالحین
برآں اند ومناقب آل رسول صلوات اللہ علیہ
ومثالب آل سفیان اگر دروغ است
وکافۃ الناس نہ برآں ہستند، عقلاً
دانند کہ چنین است وکلمۃ الحق است
لا کلام فیہ۔

اور اس بات کی دلیل کہ وہ جہل سے
کام لیتے ہیں، یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ آل مروان
کی نکوہش کی ہے اور امیر المومنین علیؓ کو دیگر
صحابہ رضؓ سے افضل ٹھہرایا ہے لیکن وہ یہ نہیں
دیکھتے کہ حضرت علیؓ کو حضرت صدیق اکبرؓ
سے کم درجہ پر بلکہ حضرت فاروقؓ اور حضرت
عثمان ذی النورینؓ سے نیچے جیسا کہ اسلاف
کا قاعدہ تھا، رکھا ہے، اور سید کائنات
محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخبار صحیح
مروی ہے، اور سلف صالحین کی بھی یہی
روش رہی ہے، اور آل رسولؐ کے مناقب
اور آلِ سفیان کی نکوہش اگر غلط ہے
اور عوام الناس کا یہ عقیدہ نہیں ہے تو

نہ ہو، اہلِ دانش جانتے ہیں کہ ایسا ہی ہے
اور یہی کلمۂ حق ہے، اور اس بات میں
کوئی کلام نہیں۔

حدیقۂ سنائی کے مطبوعہ نسخے کے ان اشعار میں یہی خیال ملتا ہے:

شادمان مصطفیٰ و یارانش — وآنکہ ہستند دوستدارانش
چار یار گزیدہ اہلِ ثنا — بر تن و جانِ شان زبندہ دعا
مرتضیٰ و بتولؓ و دو پسرش — وانکہ سوگند من بود بسرش
نخورم غم گر آلِ بوسفیان — نشنوند از حدیثِ من شادان
... مرا مدحِ مصطفیٰ ست غذا — جان من باد جانش را بفدا

... ...

در دیوان کے بعض نسخوں میں یہ قطعہ بھی ملتا ہے:

داستانِ پسر ہند مگر نشنیدی — کہ از و بر سر اولادِ پیمبرؐ چہ رسید
پدرِ او لب و دندانِ پیمبرؐ بشکست — مادرِ او جگرِ عمِ پیمبرؐ بمکید
خود بناحق حقِ داماد پیمبرؐ بگرفت — پسرِ او سرِ فرزندِ پیمبرؐ ببرید
بر چنیں قوم چرا لعنت و نفریں نکنم — لعنت اللہ یزیدا و علی حبِ یزید

(ص ۱۰۷۲)

اس کے علاوہ ایک جگہ یہ بیت آئی ہے:

پیشتر زیں چہ کرد با سادات — شمر یا ہند زادہ یا ملجم

(ص ۳۷۹)

اس سلسلہ میں یہ ابیات بھی قابلِ غور ہیں :

دینِ حسین تست آزو آرزو خوک وسگ است ۔ تشنہ ایں رامی کشی واں ہر دو رامی پروری

بر یزید و شمرِ ملعوں چوں ہمی لعنت کنی ۔ چوں حسین خویش را شمر و یزید دیگری

(دیوان ص ۶۵۵)

گویا یزید و شمر ملعون پر لعنت کا حق انہی کو ہے جن کو اپنے دین کا صحیح پاس و لحاظ ہو، بد دین و بے دین تو خود یزید و شمر کی ردیف میں ہے، ان پر لعنت کا کیا موقع ہے۔

آلِ مروان اور آلِ زیاد واجب القتل ہیں، حدیقہ میں آیا ہے :

آنکہ جز ابلہ و منافق نیست ۔ مر ورا شرم خلق و خالق نیست

کردہ خصمانِ او چہ بندہ چہ حُر ۔ مطبخ اینجا و دوزخ آنجا پُر

آلِ مروان و آلِ سفلہ زیاد ۔ کہ نہ رفتند جز براہ عناد

ہر کہ باشد خوارج و ملعون، ۔ واجب آنست کش بریزی خون

(ص ۷۸)

لیکن ان امور کے باوجود سنائی کا تسنن ہر طرح کے شبہہ سے پاک ہے۔ ان کا دیوان خلفائے اربعہ کی مدح سے پُر ہے اور ان کا نام اسی ترتیب سے لیا گیا جو سلف صالحین میں رائج تھا، حدیقہ کا پانچواں باب فضائل اصحاب النبی کے عنوان سے ہے، اس میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کا، پھر حضرت عمرؓ کا، پھر حضرت عثمانؓ کا اور آخر میں حضرت علیؓ کا ذکر ہوا ہے، ہر ایک کے ذیل کے چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں :

کرامۃ النبوۃ

ہر کجا او شراب دیں پالود ۔ پسر بو قحافہ تحفش بود

بود خود را رسول پیش از بیک — صدقِ صدیق را سلام علیک
جانِ او با دلش بعلیین — تنِ او با تنش رفیق و قرین

باب الرابع فی فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہم اجمعین

فضیلت امیر المومنین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

آفتاب کرم چو در در بست — قمر تابانش بو بکر است
چون نہفت آفتاب دین مغرب — کرد ماہِ خلافت آخر حرب
بودہ از پاشنہ طریقت سای — پیش جان رسول مار افسای
ہمہ خویش کرد در کارش — ہمہ او گشتہ بہر دیدارش
بودہ با ذات عشق پر دردش — ہم رہ و ہم مزاج و ہم دردش
صدقِ او از پی سلامت راہ — بودہ ساحر شناس و کاہن کاہ
بردہ بر شہ رہِ امانت صدق — قدمِ صدق را بمقعدِ صدق
برفشاندہ بعشق عقلِ نوی — بر قدومِ رکابِ مصطفوی
در مشورت وزیر پیغامبر — روز خلوت دبیر پیغامبر
قابلِ صدق و قابلِ ایمان — عاقلِ علم و حاملِ قرآن
در سرای سریر مونس و یار — ثانی اثنین اذ ہما فی الغار
صور صدر قیامتش خواند — رافضی قدر او کجا داند
ای ندانستہ صدق بوبکری — تو چہ دانی صلاح بی بکری
رافضی را محل آن نبود — وانچہ او ظن برد چنان نبود
آنکہ جان بہر خاندان خواہد — کی علی را بجان زیان خواہد

آنکہ نستد ز حق جلال فدک — کے بخود رہ دہد حرام فدک
گر نہ جانش اضافتے بودی — ورنہ صد قرش خلافتے بودی
مصطفیٰؐ کے بود سپردی ملک — یا ز حیدرؓ چگونہ بردی ملک
علیؓ کو کشد ز دشمن پوست — با چنیں دشمنے نباشد دوست
تو بدیں ترہات وہزل وفضول — مر علی را ہمی کنی معزول
گر مداہن بود روا نہ بود — بخلافت تنش سزانہ بود
ور بود عاجز وخبیر بود — پس منافق بود نہ میر بود
مصلحت بود آنچہ کرد علیؓ — تو چرا سال وماہ در جدلی
مکر وکبر وہوا برون انداز — تا دہد جانش مر ترا آواز
زیں بدو نیک بہ گزیں کردن — زشت باشد حدیث دیں کردن
رافضی را بماندہ در گردن — جیجک ومرگ وجنگ وجاں کردن
بر براقے کہ مصطفیٰؐ پرورد — رافضی را یقیں چہ داند کرد
بود بوبکرؓ با علیؓ ہمراہ — تو زبان فضول کن کوتاہ
آفرین خدائے بے ہمتا — بر ابو بکرؓ باد وشیر خدا
صورت صدق از دریچۂ فضل — دیدہ فاروقؓ را بعلم وبعدل
بود عدل عمرؓ ز بے مکری — آینہ روئے صدق بوبکری
کان ز اسلام دایں ز ایماں بود — عدل او عقل وصدق ایں جاں بود
دیں بوقت عتیق بود بلال — پس بفاروق یافت عز وجلال

فضیلت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

آنکه طٰهٰ طهارتش داده ‌‌ وآنکه یٰسین امارتش داده
شاهدِ حق روانش در خفتن ‌‌ نائبِ حق زبانش در گفتن
کرده بهرِ رسول یزدانش ‌‌ حسبک الله ردیفِ ایمانش
در رهِ دین و ملک باغ ازوے ‌‌ باغِ فردوس را چراغ ازوے
از پےِ مومناں به تیغ و کمند ‌‌ خارِ شبهت ز راه ایماں کند
امرِ حق درّه داده در دستش ‌‌ روح کرده ز راه سرمستش
درّه را برائے مستوری ‌‌ نزده درّه جز بدستوری
خانهٔ مے خراب گشته ازو ‌‌ زهرهٔ زهره آب گشته ازو
سعدِ وقاص و عمرِ معدی را ‌‌ آں دو آزاده و دو هادی را
بعجم بهرِ دیں فرستاد او ‌‌ بدل ظلم داد بنهاد او
در نهادند چوں قوی شد حرب ‌‌ کفر و اسلام در شدند بضرب
در پسِ کوه کرد ناگاهے ‌‌ لشکرِ کافراں کمیں گاهے
او بخورشے که داشت در رهِ درد ‌‌ خدعهٔ دشمناں بجائے آورد
ایں کمیں گاه را بدید از دور ‌‌ بفراست از آں دلِ پُر نور
روز آدینه بر سرِ منبر ‌‌ گفت یا ساریه ز خصم حذر
الجبل الجبل که لشکرِ خصم ‌‌ حیله کردست حمله بر دیِ کفر
سعدِ وقاص لفظِ او بشنید ‌‌ وآں کمیں گاهِ اهلِ کفر بدید
کوه بشگافت وآں همه آواز ‌‌ بشنیدند و فاش گشت آں راز
کافراں زاں سبب شکسته شدند ‌‌ همه حیراں و زار خسته شدند

بُعمرؓ گشت عمر ملک دراز بعمرؓ شد در شریعت باز
ملک را در امان و در ایمان بودہ فرزند عدل او عثمان

فضیلت امیرالمومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

آنکہ بر جائے مصطفےٰؐ بنشست بر لبش شرم راہ خطبہ ببست
آں زلکنت نبود بود از شرم زانکہ دانست جانش را آزرم
عین ایماں کہ بود جز عثمانؓ حجت ایں کہ الحیاء من الایمان
شرم او را خدائے کردہ قبول شدہ خوشنود از و خدا و رسول
علم تنزیل مر ورا حاصل دل او سرِ وحی را محمل
بدل و غدہ سرو آزادش بدو چشم و چراغ دامادش
کردہ در راہِ مُلک و ملت ملک دُرِ قرآں کشیدہ اندر سلک

فضیلت امیرالمومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

اے سنائی بقوتِ ایماں مدحِ حیدرؓ بگو پس از عثمانؓ
آں زفضل آفت سرائے فضول آں علم دار و علم دار رسول
آں فدی کردہ در رہِ تسلیم ہم پدر ہم پسر چو ابراہیمؑ
آنکہ در شرع تاجِ دیں او بود آنکہ تاراج کفر و کیں او بود
آل لیس شرت بدد دیدہ ایزد او را بعلم بگزیدہ
سترِ قرآن پاک خواندہ بدل علم کونین مر ورا حاصل
ہم نبی را وصی و ہم داماد چشم پیغمبر از جانش شاد
مصطفےٰؐ را مطیع و فرماں بر ہمہ بشنیدہ رمز او یکسر

راز دارِ خدا ے پیغمبر — راز دار پیامبرش حیدر رضہ
شرف ملک و مایۂ دین او — صدفِ دُرِّ آل یٰسین او
محرم او بودہ کعبۂ جاں را — محرم او بودہ سرِ قرآں را
کاتبِ نقش نامۂ تنزیل — خازنِ گنج خانۂ تاویل
کردہ خصمانِ او چہ بندہ چہ حُر — مطبخ اینجا و دوزخ آنجا پُر
آل مروان و آل سفلہ زیاد — کہ نرفتند جز براہ عناد
ہرکہ باشد خوارج و ملعون — واجب است کشش بریزی خون

(باقی)

دارالمصنفین اعظم گڈھ کی ادبی خدمات

دارالمصنفین (شبلی اکاڈیمی) کو اپنے شاندار علمی کارناموں کی وجہ سے بہت جلد عالمگیر شہرت حاصل ہوگئی اور اس کا آوازہ ہندوستان کے حدود سے گذر کر ایشیا کے دوسرے ملکوں اور یورپ و امریکہ تک پہونچ گیا، لیکن بے خودستائی کے احساس کی بنا پر قدردانوں کے اصرار و تقاضا کے باوجود اس کے خدمت گذاروں نے اس کی کوئی مبسوط تاریخ لکھ کر نہیں پیش کی، اس کمی کو ڈاکٹر خورشید نعمانی نے جو دارالمصنفین سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، اور جن کی تمام تعلیم و تربیت دارالمصنفین کے ماحول ہی میں ہوئی ہے، دارالمصنفین کی ادبی خدمات پر ایک مبسوط مقالہ لکھ کر پورا کیا ہے جس پر ان کو بمبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے، یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، مقالہ نگار کا اصل مقصد تو دارالمصنفین کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالنا تھا، لیکن ضمناً اس میں دارالمصنفین کی اس کے آغاز تاسیس سے لے کر [illegible] تک کی مجمل تاریخ بھی آگئی ہے کتاب بہت محققانہ، دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

"ض"

مطالعۂ ملفوظات خواجگان چشت کے مبادیات

(خواجگانِ چشت کے ملفوظات کی روشنی میں)

از

مولانا اخلاق حسین دہلوی بستی نظام الدین دہلی

(۴)

<u>خیر المجالس کے بیانات</u> خیر المجالس کے جامع مولانا حمید الدین قلندرؒ ہیں، جو شیخ برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات کے بھی جامع ہیں، خیر المجالس کی زبان شستہ و رفتہ ہے، البتہ اتنی قلیل کہیں کہیں بیان میں گنجلک اور بے ربطی ہے، ایسا لگتا ہے کہ کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند ہے اگر وہ بیان اُن ہی کا ہے، تو محل استعجاب ہے، ورنہ مجموعی طور پر کتاب دلچسپ ہے،

(۱) گیارھویں مجلس میں ہے کہ کسی شخص نے مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے ایک ملفوظ کے متعلق دریافت کیا، (جس کا ذکر آئندہ آئے گا،) تو آپ نے فرمایا،

ایں ملفوظ ایشاں نیست، ایں نسخہ ہا برمن ہم رسیدہ است و دراں بسیار الفاظ است، کہ مناسب اقوال ایشاں نیست (خیر المجالس ص ۵۲)	یہ ملفوظ ان کا نہیں ہے، یہ نسخے مجھے بھی پہنچے ہیں، اور اُن میں بہت سے لفظ ہیں، کہ جو اُن کے اقوال کے مطابق نہیں ہیں۔

اس بیان میں مجموعۂ ملفوظات کے وجود سے انکار نہیں ہے، البتہ تحریف و الحاق کی شان دہی ہے، جو امکانی ہے، اس بیان میں حرف عطف بھی بلا ضرورت ہے، غالباً اس بیان کی روشنی میں مولانا حامد جمالی (المتوفی ۹۴۲ھ) نے لکھا ہے:۔

نقل است از حمید قلندر، کاتب ملفوظ	کتاب خیرالمجالس کے کاتب حمید
خیرالمجالس ...... فرمودند	قلندر سے نقل ہے، ....
کہ ایں نسخہ ہا بہ من رسیدہ اند ھاشا کہ	انھوں نے فرمایا کہ یہ نسخے مجھے پہنچے
از ایشاں باشد، در آں جا بسیار	ہیں، جو ہرگز ان کے نہیں ہیں (کیونکہ)
کلمات مجاوراں و معتقداں با وقوف	ان میں بہت سے کلمات مجاوروں
نوشتہ اند، کہ ہرگز موافق احوال و	اور معتقدوں نے جان بوجھ کر
اعمالِ ایشاں نیست،	لکھ دئے ہیں، جو ہرگز ان کے اقوال
(سیرالعارفین ص ۹۵)	و اعمال کے مطابق نہیں ہیں،

مولانا حامد جمالی نے اگرچہ بات کو بڑھاوا یا ہے، اور معتقدوں اور مجاوروں کو الحاق و تحریف سے متہم گردانا ہے، جو مخدوم نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے بیان میں نہیں ہے اگر قرین قیاس ہے تاہم ان کے بیان میں بھی مجموعۂ ملفوظات کے وجود سے انکار نہیں ہے، مولانا حامد جمالی کے بیان کی یہ بھی خصوصیت ہے، کہ وہ بے جان اشیاء کی جمع کے لئے فعل جمع لاتے ہیں، جو خلاف فصاحت اور مولانا حمید قلندرؒ کی روش سے ممیز ہے،

سوال کا جواب تو ختم ہو چکا ہے، تشنۂ تکمیل نہیں ہے، لیکن بعد ازاں کے بعد یہ لکھا ملتا ہے،

فرمودند کہ خدمت شیخ نظام الدینؒ	انھوں نے فرمایا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ

می فرمود کہ من ہیچ کتابے نہ نوشتہ ام	نے فرمایا ہے کہ میں نے کوئی کتاب
زیراکہ خدمت شیخ الاسلام فریدالدین	نہیں لکھی ہے ، اس لئے کہ شیخ الاسلام
و شیخ الاسلام قطب الدین و خواجگان	قطب الدین نے اور خواجگان چشت
چشت قدس اللہ ارواحہم و از مشائخ	قدس اللہ ارواحہم نے ، اور ہمارے
شجرۂ ما ہیچ شیخے تصنیف نکردہ اند	شجرے کے مشائخ میں سے کسی شیخ
(خیرالمجالس ص ۵۲)	نے تصنیف نہیں کی ہے ،

اس بیان کا آخری جملہ از مشائخ شجرۂ ما الخ میرے ذوق پر گراں گزرتا تھا جو حشو قبیح ہے ، حاشیہ کتاب مذکور دیکھنے سے پتہ چلا کہ معلومہ ایک قدیم نسخے میں یہ جملہ نہیں ہے اس سے خیال کو تقویت اور ذوق کو طمانیت ہوئی ، اور یہ بات کھل گئی کہ یہ جملہ بیان کی تقویت کے لئے بعد میں اضافہ کیا گیا ہے جس نے بیان کو گنجلک اور مشتبہ کر دیا ہے ، اور جو حشو قبیح ہے ،

وہ جملہ جو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منقول اور بیان کے آغاز میں ہے ، فوائد الفواد (ص ۵۴) میں بھی ہے ، جس کے فعل نہ نوشتہ ام کی وضاحت کی جا چکی ہے ، کہ اس سے مراد مخصوص کتاب سے انکار ہے ، جملہ تحریرات سے انکار نہیں ہے ، اسے کسی اور تحریر کے لئے بنا بنانا ، اور نوشتہ کے مفہوم کو تصنیف کے لئے مخصوص گردانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے ؟

کسی بیان سے وہ معنی مراد لینے جو قائل کا مدعا نہیں تفنن طبع کے بطور تو بیشک روا ہے ورنہ اس کی گنجایش کہاں ہے ، پھر اسے عبارتِ مابعد کے لئے دلیل بنانا اور عبارتِ مابعد کو جملہ مذکورہ سے مربوط ظاہر کرنا جو فوائد الفواد میں بھی نہیں ہے ، ہرگز صحیح نہیں ہے ، یہ عبارت جو گوناگوں معائب سے ہم آغوش ہے ، کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا حمید قلندرؒ جیسے شایستہ نگا

اہل قلم کے قلم سے نکلی ہے، یا نکل سکتی ہے، یا مخدوم نصیرالدین چراغ دہلی کی فرمودہ ہوسکتی ہے؟ جو متضاد ہے، اور ادبی اسقام کی حامل ہے،

یہ دونوں بیان باہم متضاد ہیں، پہلے بیان میں ہے"

"دراں بسیار الفاظ است کہ مناسب اقوال ایشاں نیست"

دراں بسیار الخ سے کوئی نسخہ جعلی نہیں قرار پاسکتا، نہ کسی کے وجود سے انکار مانا جاسکتا ہے، مگر دوسرے میں صریحاً انکار ہے، لطیفہ یہ ہے کہ مضمون ملفوظات سے متعلق ہے، مگر انکار ہے تصنیف سے، یہ نثر نگار کیا اتنا بھی نہیں جانتا کہ مجموعۂ ملفوظات میں اور تصنیف میں زمین آسمان کا فرق ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ اس بیان کا تعلق محض تصنیف سے ہے تو بھی تسلیم کرنے کی بے تکلف ہی گنجایش نکلے گی، کیونکہ معتبر ماخذات میں خواجہ حسن بصریؒ کی تفسیر، اور رسالہ ابراہیمؒ کا، اور رسالہ شیخ علو دینوریؒ کا ذکر ملتا ہے، اگر یہ روش ناپسندیدہ ہوتی، تو شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی تصنیفات کا ذکر کیوں ملتا،

اگر کتب ملفوظات کے وجود سے انکار ہی مقصود تھا تو ایک کے بعد دوسرے بیان کی، اور دراں بسیار الفاظ الخ کے کھڑاک میں پھنسنے کی ضرورت ہی کیا تھی، ایک ہی جملے میں کام تمام تھا، کہہ دیا ہوتا کہ "کتب ملفوظات کہ از مشائخ منسوب کردہ اند، از ایشاں نیست" نہ تو حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان کو دلیل بنانے کی ضرورت تھی، اور مشائخ شجرہ ہا، تا بدنما پیوند لگانے کی ضرورت تھی، نہ بے امتیازی سے مجموعۂ ملفوظات کو تصنیف کہنے کی ضرورت تھی، جو عجز معلومات کا بدنما داغ ہے، یہ کھڑاک غماز ہے کسی اعدہی کارستانی کا ع

شب کی خبر دیتی ہے آنکھ شرمائی ہوئی

اس بیان کو میرے نزدیک مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے منسوب سمجھنا یا منسوب بتانا نافہمی کی علامت ہے، مولانا حمید قلندرؒ کو بھی متہم نہیں کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اُن کی کتاب میں عموماً یہ گنجلک اور ناہموار ی نہیں ہے، حضرت مخدومؒ کو صاف دلی سے جو بات کہنی تھی، کہہ دی تھی کہ دراں بسیار الفاظ است الخ اُن کے بیان سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کتب ملفوظات کے وہ کتب ملفوظات کے وجود کے قائل نہ تھے،

مشائخ چشت رحمہم اللہ کی کتب ملفوظات سے انکار متقدمین سے ہرگز بھی ثابت نہیں، بلکہ اس کے برعکس اقرار ثابت ہے،

مشائخ چشت کی کتب ملفوظات سے انکار ہرگز قرین قیاس نہیں اور جعلی بتانا کھلی نادانی ہے اگر یہ کوئی حقیقت ہوتی تو شمائل الاتقیا جو شیخ برہان الدین غریبؒ کے ایما سے تصنیف ہوئی، اس کی فہرست ماخذات میں ان میں سے اکثر کا ذکر کیوں ہوتا، شیخ برہان الدین غریبؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ خلفاء میں سے تھے جن کی عمر کا طویل زمانہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت و صحبت میں گذرا تھا، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ بھی انھیں عزیز و محترم جانتے تھے ان کی وفات کے بعد تادم آخر ان کا عرس کرتے رہے، وہ اپنے شیخ کے نظریات سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتے تھے، اگر کتب ملفوظات جعلی ہوتیں تو ہرگز ان سے منسوب کرنا گوارا نہ کرتے۔

امیر خورد کرمانیؒ نے اسی خوشگوار روحانی ماحول میں پرورش پائی تھی، اگر اس عہد میں کتب ملفوظات کو جعلی یا مشتبہ خیال کیا جاتا تو بعض ملفوظات کا ذکر ان کے زبان قلم پر کیوں آتا، اسی عہد میں مخدوم نصیر الدینؒ چراغ دہلی کے معتقد و مرید مولانا محمد مجیر وجیہ ادیبؒ نے مفتاح الجنان تصنیف فرمائی جس میں ملفوظات مشائخ چشت سے بھی استفادہ کیا ہے ان کے ماخذات میں خیر المجالس بھی ہے، مفتاح الجنان کو بنظر اصلاح شیخ کمال الدین علامہؒ نے بھی دیکھا تھا،

اگر خیر المجالس میں یہ از کار رفتہ بیان ہوتا تو اس سے وہ ضرور متاثر ہوتے اور اپنے شیخ کے نظریہ کو ہرگز نظر انداز نہ کرتے، تواتر سے ثابت ہے کہ عہد بہ عہد ثقہ اہل قلم کتب ملفوظات سے استفادہ کرتے رہے ہیں، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں :

"حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا ابتدائی زمانہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ہی کا تھا، ان کی وفات ۷۸۲ھ میں یعنی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے وصال ۵۷ سال بعد ہوئی، ان کے مجموعۂ ملفوظات "خوانِ پُر نعمت" میں صاف طور پر ذکر ہے کہ شیخ عثمان ہارونیؒ کے ملفوظات کو حضرت خواجہ معین الدینؒ نے جمع کیا ہے' (ص ۸۰) اسی طرح ان کے مجموعۂ ملفوظات "مخ المعانی" میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات کے حوالے ہیں (ص ۲۹-۵۱) ان سے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے استفادہ بھی کیا، پھر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مطالعہ میں بھی یہ ملفوظات رہے، انھوں نے واضح طور پر اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ خواجہ بختیار اوشیؒ نے حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کے ملفوظات جمع کئے[1] (ص ۲۲-۲۵) اور حضرت گنج شکرؒ کے ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے مکتوب کئے[2] (ص ۵۲)

(معارف اعظم گڈھ مارچ ۱۹۷۹ء)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مطالعہ میں بھی خیر المجالس تھی، انھوں نے تین صفحے سے زیادہ اس سے استفادہ کیا ہے' پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی بھی خیر المجالس کے مذکورہ بیان سے متاثر نہیں' نیز مشایخ چشت کی

---

[1] در دلیل العارفین کہ خواجہ قطب الدین بختیار اوشی از ملفوظات خواجہ قدس سرہٗ جمع کردہ [2] بعضے از ملفوظات گنج شکر بخط شیخ نظام الدین اولیاءؒ یافتہ اند مکتوب می گردد ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے بھی جمع کئے تھے، وے را رسالہ ایست مسمی اسرار الاولیاء در وے ملفوظات گنج شکرؒ را جمع کردہ (اخبار الاخیار ص ۶۷)

کتب ملفوظات سے متواتر آج تک استفادہ کیا جا رہا ہے، اور کوئی بھی جعلی مان کر انھیں نظرانداز نہیں کرتا، دراں حالیکہ مذکورہ بیان کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب اور مخدوم نصیرالدینؒ چراغ دہلی سے منقول بتایا گیا ہے، پھر بے اعتنائی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ دو باتوں میں سے ایک بات ماننی ہوگی، یا تو یہ بیان خیرالمجالس کے قدیم نسخوں میں نہیں ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے، یا اگر ہے تو جیسا بتایا جا چکا ہے کہ یہ وہ اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں، ثقہ اہل قلم نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا اور نظرانداز فرماتے رہے، اگر ایسا کیا ہے تو یہ ان کی نکتہ دانی اور بصیرت باطنی کی دلیل ہے۔ البتہ چودھویں صدی کے تنقید نگاروں کو یہ شگوفہ ہاتھ لگا ہے،

بہرحال خیرالمجالس کی زیر بحث عبارت ہرگز لائق اعتنا نہیں اور اس کے پیش نظر مشایخ چشت رحمہم اللہ تعالیٰ کی کتب ملفوظات کو جعلی قرار دینا درست نہیں۔

جعلی کے واہمہ کو ذہن نشین کرانا اس واہمہ کو کہ کتب ملفوظات جعلی ہیں، ذہن نشین کرانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی ہے، فوائدالفواد ہی کے بیان کو جس کا ایک جملہ اس سے پہلے بیان میں نقل ہو چکا ہے مسخ شدہ صورت میں دہرایا اور لکھا ہے:

> بندہ عرض داشت کرد کہ در فوائدالفواد آمدہ است کہ شخصے بخدمت شیخ الاسلام شیخ نظام الدین قدس اللہ سرہ العزیز عرض داشت کرد کہ من بر شخصے کتابے دیدہ ام از تصنیف شیخ۔ خدمت شیخ فرمودند۔ او تفاوت گفتہ است، من ہیچ کتابے تصنیف نہ کردہ ام، دخواجگانِ ما نیز نہ کردہ اند، خواجہ سلمہ فرمودند، آرے خدمت شیخ ہیچ کتابے تصنیف نہ کردہ است، باز بندہ عرض داشت کرد کہ ایں نسخہا دریں وقت پیدا شدہ است، ملفوظات شیخ قطب الدینؒ و شیخ عثمان ہارونی ''در حیات خدمت شیخ نہ بود؟ خواجہ فرمودند، نہ بود۔ اگر بودے خدمت شیخ فرمودے و پیدا شدے'' (خیرالمجالس ص ۵۳)

قطع نظر اس سے کہ فوائد الفواد کے حوالے سے جو عبارت منقول ہے، بعینہ وہ فوائد الفواد میں
یں ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پہلے ہی بیان میں یہ موجود ہے کہ خواجگان چشت ......
ازمشایخ شجرۂ ما ہیچ شخصے تصنیف نکردہ است (ص ۵۲) تو اس سے تسلی کیوں نہیں ہوئی، کیا
ای رہ گئی تھی جس کو رفع کرنے کے لئے مکرر دریافت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی؟ ہے کوئی جو یہ
ہہ سکے کہ یہ سات سطری بیان تحصیل حاصل نہیں ہے جس سے کتاب کا اعتبار مجروح ہوتا ہے، یہی دلیل ہے
اور روشن دلیل ہے کہ جعلی کے واہمہ کو تقویت دینے اور ذہن نشین کرانے کی بے جا کوشش کی گئی ہے
جس نے حقیقت کے چہرے سے نقاب الٹ دیا ہے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ جو عبارت اس بیان میں فوائد الفواد کے حوالہ سے نقل ہے وہ بعینہٖ
فوائد الفواد کی عبارت نہیں ہے، بلکہ مسخ شدہ ہے، اَنمل، بے جوڑ اور اغلاط کی دلدل ہے،
جس کا تجزیہ مناسب ہوگا۔

متکلم کا بیان ہے "من بر شخصے کتابے دیدہ ام از تصنیف شیخ" متکلم نے کہیں کسی کے پاس کتاب
دیکھی، غالباً کسی مماثلت سے اس کو شبہہ ہوا اور وہ سمجھا کہ یہ شیخ کی تصنیف ہے، یہ رائے دیکھنے والے
نے خود قائم کی ہے، یہ بات اسے کسی نے سکھائی یا بتائی نہیں ہے کہ یہ شیخ کی تصنیف ہے، اس
جزو کے متعلق اتنا ہی ذہن نشین رکھنا کافی ہے۔

جملہ کا آخری حصہ ہے "از تصنیف شیخ" یہ مبہم ہے، لفظ شیخ وضاحت چاہتا ہے کہ شیخ سے
مراد کون بزرگ ہیں، یہ جملہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے روبرو بولا گیا ہے، قرینہ یہ بتاتا ہے کہ شیخ سے مراد
متکلم کی حضرت محبوب الٰہیؒ ہیں، محل گفتگو اور آداب مجلس کا اقتضا یہ ہے کہ شیخ کے ساتھ تعظیمی
الفاظ کا اضافہ بھی ہوتا، تاکہ دلالت تشنۂ تکمیل نہ رہتی، خصوصاً اس لئے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی
مجلس وہ مجلس تھی جہاں اچھے اچھے بکمال عجز و نیاز سے سر بہ خم رہتے تھے، صرف شیخ کہنا اور حضرت

محبوب الٰہیؒ کے رو برو کہنا ہرگز مقتضائے حال کے مطابق نہیں ہے۔

اس کے بعد اس بیان کا جواب ہے، جو حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی نقل کیا ہے، یہ بھی فوائد الفواد کی مسخ شدہ عبارت ہے، جس میں ایک جملہ کا اضافہ بھی ہے، یہ عبارت اغلاط سے پُر، بے محل، اور کسی ایسے شخص کی مسخ کردہ ہے جو بالکل ہی مبتدی ہے، بلکہ مبتدی سے بھی گیا گذرا ہے جو ہرگز مذکورہ بیان کا جواب نہیں، اسے بطور جواب کے حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کرنا درست نہیں ہے، وہ مبتدی جسے فارسی میں ذرا بھی شُدبُد ہے، وہ بھی مذکورہ بیان کا یہ جواب نہیں دے سکتا، جو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کر دکھایا ہے جو عالم و عارف زبان دان داہل زبان اور برگزیدہ و عمر رسیدہ بزرگ کے جواب یہ ہے:

"او تفاوت گفتہ است، من ہیچ کتابے تصنیف نکردہ ام، و خواجگانِ ما نیز نکردہ اند۔"

متکلم، مخاطب وموجود ہے، پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ "او تفاوت گفتہ است" فعل بھی بصیغہ غائب اور ضمیر بھی بصیغہ غائب، متکلم نے جو کچھ کہا ہے، اپنے صوابدید سے کہا ہے، اس سے کسی نے کچھ کہا سنا نہیں ہے، ضمیر و فعل دونوں بصیغہ حاضر ہونے چاہئیں، افعال و ضمائر کی ایسی غلطیاں تو مبتدیوں سے بھی کم ہی ہوتی ہیں، چہ جائیکہ کسی پڑھے لکھے سے صادر ہوں، حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے تو کچھ اس طرح فرماتے:

"تفاوت دیدہ" - "تفاوت می گوئی"

بلاشبہہ بہ تفاوت کثیرہ بعض جملے فوائد الفواد سے منقول ہیں، ناقل پہلے جملے کے محل استعمال سے ناواقف ہے، دوسرے جملے میں "نہ نوشتہ ام" کو "تصنیف نہ کردہ ام" کر دیا ہے، تیسرے جملے کا اضافہ کیا ہے، جو حشو قبیح ہے، بلکہ افترا ہے، یہ ہے وہ ساری کائنات جو کتب ملفوظات کو جعلی بتانے کی بنیاد ہے، مولانا حمید قلندرؒ سے تو یہ ہرگز توقع نہیں کہ وہ یہ بے سرو پا عبارت لکھتے۔

لا یہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھی ہے، جواب دینے والا کہتا ہے کہ وہ غلط کہتا ہے، یہ کیسا ہے، کہنا تھا: تم نے غلط کہا ہے۔ ان دانشوروں پر جو اس بے ربط عبارت کو بنیاد تب ملفوظات کو جعلی بتا رہے ہیں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا یہ فرمانا سا ہے:

"یہ وہ لوگ ہیں جو ہماری مذہبی، روحانی اور ثقافتی وراثت کا تمسخر کر کے ہم کو اپنے ماضی کی عظمت سے بیگانہ کرنا چاہتے ہیں۔"

(معارف، اعظم گڑھ، ص ۳۶۳، ۳۶۴، مئی ۱۹۶۹ء)

رخالی الذہن ہو کے مادی قدروں کو آسانی سے قبول کر لیا جائے، جو قومیں تنزل کے گڑھے میں رنے لگتی ہیں، یا گر چکی ہوتی ہیں، ان کے اسلاف کو اسی طرح ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔

تراجم کی کیفیت | مشایخ چشتؒ کے ملفوظات کے جو تراجم دستیاب ہوتے ہیں، وہ فارسی متن سے بھی زیادہ مخدوش اور غلط ہیں، وہ روایت جو حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کے مجموعۂ ملفوظات میں ہے، وہ متن میں کس طرح ہے اور ترجمے میں اس کا کیا رنگ روپ ہے، دیکھنے کے لائق ہے:

فارسی متن میں ہے:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت	عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اللہ صلی اللہ
کرد از رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کہ	علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جو چالیس
چہل بارہ گاو بسمل کند خون یک گناہ	گائیں زخمی یا ذبح کرتا ہے تو اس کے
در نامۂ اعمال او بنویسند، و ہر کہ دہ	نامۂ اعمال میں ایک خون کا گناہ لکھتے ہیں
گوسفند بسمل کند یک خون بنام او بنویسند	اور جو دس بھیڑیں زخمی یا ذبح کرتا ہے
ہر کہ جانورے را بہوائے نفس بسمل کند	اس کے نام ایک خون لکھتے ہیں، جو کوئی

ہمچناں باشد کہ ویراں کردن خانۂ کعبہ یاری کردہ باشد، مگر بہ مجلسے کہ دراں روا باشد۔	کسی ایک جانور کو نفسانی خواہش سے زخمی یا ذبح کرتا ہے، وہ ایسا ہے کہ اس نے خانۂ کعبہ کو ویران کرنے میں مدد کی ہے مگر جس کسی مجلس میں روا ہے (روا ہے)
(انیس الارواح، ص ۲۷)	

اس روایت میں "خونِ یک گناہ" کی ترکیب محل نظر ہے، "گناہِ یک خون" مناسب ہوتی۔

یہ روایت بطور حدیث مروی ہے، صوفیائے کرام کا حدیث کے باب میں مسلک یہ ہے کہ حالت اطلاق میں رہنے دیا جائے، حضرت محبوب الٰہی کا ارشاد ہے:

حدیثے کہ مردم بشنوند نتواں گفت کہ ایں حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نیست، اما ایں تواں گفت کہ در کتبے کہ ایں احادیث جمع کردہ اند و اعتبار یافتہ اند، نیامدہ است۔	جو حدیث سنیں تو یہ نہ کہنا چاہئے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں ہے، مگر یہ کہہ سکتا ہے کہ جن کتابوں میں انھوں نے (محدثین نے) حدیثیں جمع کی ہیں، اور وہ معتبر مانی گئی ہیں، (ان میں یہ حدیث) نہیں آئی ہے۔
(فوائد الفواد، ص ۲۳۳)	

لہٰذا اس حدیث کو حالت اطلاق میں رہنے دیا جائے گا، البتہ یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس مجموعۂ ملفوظات میں صحت کے ساتھ نقل نہ ہو سکی ہو، اس روایت کا ترجمہ مولوی غلام احمد بریاں مرحوم نے کیا ہے:

عبداللہ ابن مسعودؓ نے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جو شخص چالیس گایوں کو ذبح کرے ایک خون اس کے نام لکھا جاتا ہے اور جو شخص سو بکریاں ذبح کرے اس کے نام بھی ایک خون تحریر کرتے ہیں، اور جو شخص جانور کو ہوائے نفس سے ذبح کرتا ہے، اس کا حال

ایسا ہے جیسا کہ اس نے خانۂ کعبہ کے ڈھانے میں مدد کی، مگر ان کا ذبح کرنا اس محل میں روا ہے جہاں ان کا ذبح کرنا درست ہے۔ (مجموعۂ ملفوظات خواجگان چشت ترجمۂ انیس الارواح ص ۳۰)

خون یک گناہ کا ترجمہ ایک خون کیا ہے، نامۂ اعمال کا ذکر ہی نہیں، دہ (دس) بھیڑوں کا ترجمہ سو (صد) بکریاں کیا ہے، بھیڑ بکری میں باعتبار لغت مضایقہ نہیں، 'بھی' کا اضافہ ہے، 'جانورے' کی یاے وحدانی یا تنکیری کا ترجمہ محذوف ہے، ویران کا ترجمہ ڈھانے کیا ہے، ویران لغت میں اجاڑ اور غیر آباد کو کہتے ہیں' ڈھانے کو نہیں کہتے، متن میں مجلسے ہے' جو غالباً کاتب کا سہو ہے، اس کا ترجمہ محل' قرین قیاس ہے، اصل اور ترجمہ میں جو فرق ہے' وہ ظاہر ہے، اسی روایت کا ذکر بقول مولانا حمید قلندر مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی مجلس میں آیا تھا اور اس طرح آیا تھا:

ایشاں (خواجہ عثمان ہرونیؒ) فرمودہ اند ہر کہ	انھوں نے (خواجہ عثمان ہرونیؒ نے) فرمایا ہے
دو مادہ گاؤ ذبح کند یک خون کردہ باشد'	جو کوئی دو گائیں ذبح کرے اس نے
و ہر کہ چہار مادہ گاؤ ذبح کند دو خون کردہ	ایک خون کیا اور جو چار گائیں ذبح کرے
باشد' و ہر کہ دہ گوسفند ذبح کند یک خون کردہ	اس نے دو خون کیے، جو دس بھیڑیں
باشد، و ہر کہ بست گوسفند ذبح کند دو خون	ذبح کرے اس نے ایک خون کیا، جو بیس
کردہ باشد (خیر المجالس ص ۵۲)	بھیڑیں ذبح کرے اس نے دو خون کیے'

انیس الارواح میں چہل مادہ گاؤ ہے، خیر المجالس میں دو مادہ گاؤ ہے' زمین آسمان کا فرق ہے' لطف یہ ہے جو صلہ چالیس کا ہے وہی دو کا ہے، پھر دوگنی تعداد بیان کی ہے' اسی کے مطابق صلہ بتایا ہے، اس کی ضرورت کیا تھی، البتہ دہ گوسفند بدستور ہے، بکریاں کی طرح سو (صد) نہیں بنایا گیا' مگر دوگنی تعداد اس کی بھی بیان کی ہے' جو بالکل بے مصرف ہے، میں حیران ہوں کہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی جناب میں ایسی گفتگو بھی ہوتی تھی، پھر مولانا حمید قلندرؒ جو اچھے انشا پرداز تھے انھوں نے

کیسے گوارا کر لیا، اور جوں کا توں نقل کر دیا، جو بیان کا بھی نقص ہے اور انتشار کا بھی، البتہ یہ ممکن ہے کہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی جناب میں نہ یہ ذکر آیا ہو اور نہ مولانا حمید قلندرؒ نے اسے قلمبند کیا ہو اور یہ کسی اور ہی کی کارستانی ہو۔

خیر المجالس کی روایت از اول تا آخر ناتمام ہے، یہ ذکر ہی نہیں کہ بطور حدیث اسے ذکر کیا ہے، ورنہ ممکن تھا حضرت مخدومؒ کا جواب کچھ اور ہوتا اور بصیرت افروز ہوتا، اس سے تو یہ بیان مشتبہ ہو جاتا ہے کہ "ایں نسخہ با برمن رسیدہ است"، اگر یہ صحیح ہے تو جواب ایسا ہوتا جس سے پوری روایت متاثر ہوتی، البتہ جس طرح بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ "ایں ملفوظِ ایشاں نیست" کچھ بھی سہی یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خیر المجالس کی یہ روایت مخدوش ہے، واقعہ کی صحیح عکاسی نہیں ہے، اور خواجہ عثمان ہرونیؒ سے مطلقاً منسوب بنانا دروغ بیانی ہے، خیر المجالس کے مترجم مولوی احمد علی ٹونکی مرحوم نے یہ ترجمہ کیا ہے:

> ایک عزیز نے اہل محفل سے عرض کی کہ ملفوظ حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ قدس اللہ سرہٗ العزیز میں لکھا ہوا ہے کہ درویشوں کا مقولہ ہے کہ جو دو گائے ذبح کرے اس نے گویا دو خون کیے، جو چار ذبح کرے، گویا چار خون کیے اور جو چار گوسفند ذبح کرے اس نے گویا ایک خون کیا.....
>
> (سراج المجالس ص ۳۵)

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسی عبارت کا ترجمہ ہے جو خیر المجالس میں ہے، خیر المجالس میں دو گائیں ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے جو اس ترجمہ میں دو خون ہو گیا ہے، اور چار کے عوض دو خون کی بجائے چار خون ترجمہ فرمایا ہے، خیر المجالس میں دس بھیڑوں کے ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے، ترجمہ میں چار کے ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے، فوائد السالکین میں مثل حدیث مروی، خیر المجالس میں خواجہ عثمان ہرونیؒ کا مقولہ ہیں، مترجم نے درویشوں کا مقولہ بتایا ہے، غرضکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

اس ایک ہی روایت سے ترجمہ کی کیفیت آئینہ ہو جاتی ہے، وہ کیسے دانشور ہیں جو ایسے ترجموں کو تنقید کی بنیاد قرار دیتے اور لکھتے ہیں:

> اس وقت میرے سامنے کوئی فارسی متن نہیں ہے، اس مضمون میں جتنے حوالے دیئے گئے ہیں، وہ اس اردو ترجمہ کے ہیں جو 'ہشت بہشت' کے نام سے ۱۹۵۷ء میں لاہور سے چھپا تھا ... ... اگر مترجم نے کہیں فارسی متن سے انحراف کیا ہو تو میں فی الوقت اس کی تصحیح سے قاصر ہوں.
>
> (منادی دہلی ص ۱۶۰، حاشیہ بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴ - ۵ - ۶ ۱۹۷۴ء)

> اصل فارسی کتاب میں نے دیکھی ہے، مگر یہ مضمون لکھتے وقت میری دسترس میں نہیں ہے، اگر مترجم نے کہیں ترجمہ میں غلطی کی ہو تو میں اس کی نشاندہی سے قاصر ہوں۔ (منادی دہلی، ص ۱۷۷ (حاشیہ) بابا فرید نمبر جلد ۴۹ ۱۹۷۴ء)

کتب ملفوظات کے فارسی متن کمیاب تو ہیں مگر نایاب نہیں، لائبریریوں سے بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں، یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کام کرنے میں کتنا وقت لگا، اور کن حالات میں کیا گیا ہے بلکہ دیکھتے یہ ہیں کہ کیا کیا ہے اور کیسا کیا ہے؟ تنقید نگار لکھتے ہیں:

> جعلی ملفوظات کے تمام ذخیرے کے انداز اور ترتیب میں حیرت انگیز یکسانی پائی جاتی ہے چنانچہ انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب، اسرار الاولیاء، افضل الفوائد سب کا ایک سا ہی انداز ہے۔ (منادی دہلی ص ۱۶۳ بابا فرید نمبر ۱۹۷۴ء)

شاید اردو تراجم کو پڑھ کر انھوں نے یہ رائے قائم کی ہوگی۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ تراجم کی حالت فارسی متن سے بھی گئی گذری ہے، تراجم کے مطالعہ سے رائے قائم کرنا ہرگز درست نہیں، اور تراجم کی روشنی میں یہ رویہ جائز بھی نہیں کہا جا سکتا۔

کیسے گوارا کر لیا، اور جوں کا توں نقل کر دیا جو بیان کا بھی نقص ہے اور انتشار کا بھی، البتہ یہ ممکن ہے کہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی جناب میں نہ یہ ذکر آیا ہو اور نہ مولانا حمید قلندرؒ نے اسے قلمبند کیا ہو اور یہ کسی اور ہی کی کارستانی ہو۔

خیر المجالس کی روایت از اول تا آخر نا تمام ہے، یہ ذکر ہی نہیں کہ بطور حدیث اسے ذکر کیا ہے ورنہ ممکن تھا حضرت مخدومؒ کا جواب کچھ اور ہوتا اور بصیرت افروز ہوتا، اس سے تو یہ بیان مشتبہ ہو جاتا ہے کہ ایں نسخہ با برمن رسیدہ است، اگر یہ صحیح ہے تو جواب ایسا ہوتا جس سے پوری روایت متاثر ہوتی، البتہ جس طرح بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ ایں ملفوظِ ایشاں نیست کچھ بھی سہی یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خیر المجالس کی یہ روایت مخدوش ہے، واقعہ کی صحیح عکاسی نہیں ہے، اور خواجہ عثمان ہرونیؒ سے مطلقاً منسوب بنانا دروغ بیانی ہے خیر المجالس کے مترجم مولوی احمد علی ٹونکی مرحوم نے یہ ترجمہ کیا ہے:

> ایک عزیز نے اہلِ محفل سے عرض کی کہ ملفوظ حضرت خواجہ عثمان ہارونی قدس اللہ سرہٗ العزیز میں لکھا ہوا ہے کہ درویشوں کا مقولہ ہے کہ جو دو گائے ذبح کرے اس نے گویا دو خون کیے، جو چار ذبح کرے گویا چار خون کیے اور جو چار گوسفند ذبح کرے اس نے گویا ایک خون کیا .....
>
> (سراج المجالس ص ۳۵)

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسی عبارت کا ترجمہ ہے جو خیر المجالس میں ہے، خیر المجالس میں دو گائیں ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے جو اس ترجمہ میں دو خون ہو گیا ہے اور چار کے عوض دو خون کی بجائے چار خون ترجمہ فرمایا ہے، خیر المجالس میں دس بھیڑوں کے ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے، ترجمہ میں چار کے ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے، فوائد السالکین میں مثل حدیث مروی، خیر المجالس میں خواجہ عثمان ہرونیؒ کا مقولہ نہیں، مترجم نے درویشوں کا مقولہ بتایا ہے، غرضکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

اس ایک ہی روایت سے ترجمہ کی کیفیت آئینہ ہو جاتی ہے، وہ کیسے دانشور ہیں جو ایسے ترجموں کو تنقید کی بنیاد قرار دیتے اور لکھتے ہیں:

> اس وقت میرے سامنے کوئی فارسی متن نہیں ہے، اس مضمون میں جتنے حوالے دیئے گئے ہیں، وہ اس اردو ترجمہ کے ہیں جو 'ہشت بہشت' کے نام سے ۱۹۵۶ء میں لاہور سے چھپا تھا ... ... اگر مترجم نے کہیں فارسی متن سے انحراف کیا ہو تو میں فی الوقت اس کی تصحیح سے قاصر ہوں۔
>
> (منادی دہلی ص ۱۶۰، حاشیہ بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶ ۱۹۷۴ء)
>
> اصل فارسی کتاب میں نے دیکھی ہے، مگر یہ مضمون لکھتے وقت میری دسترس میں نہیں ہے، اگر مترجم نے کہیں ترجمہ میں غلطی کی ہو تو میں اس کی نشاندہی کر قاصر ہوں۔ (منادی دہلی، ص ۱۷۷ (حاشیہ) بابا فرید نمبر جلد ۴۹ ۱۹۷۴ء)

کتب ملفوظات کے فارسی متن کمیاب تو ہیں مگر نایاب نہیں، لائبریریوں سے بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں، یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کام کرنے میں کتنا وقت لگا، اور کن حالات میں کیا گیا ہے، بلکہ دیکھتے یہ ہیں کہ کیا کیا ہے اور کیسا کیا ہے؟ تنقید نگار لکھتے ہیں:

> جعلی ملفوظات کے تمام ذخیرے کے انداز اور ترتیب میں حیرت انگیز یکسانی پائی جاتی ہے چنانچہ انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب، اسرار الاولیاء، افضل الفوائد سب کا ایک سا تعارف ہے' (منادی دہلی ص ۱۶۳ بابا فرید نمبر ۱۹۷۴ء)

شاید اردو تراجم کو پڑھ کر انھوں نے یہ رائے قائم کی ہوگی، کہنے کا مدعا یہ ہے کہ تراجم کی حالت فارسی متن سے بھی گئی گزری ہے، تراجم کے مطالعہ سے رائے قائم کرنا ہرگز درست نہیں، اور تراجم کی روشنی میں صحیح رائے بھی نہیں کہا جا سکتا۔

وقت کا تقاضا وقت کا تقاضا یہ ہے کہ بزرگان دین کے سب ہی عقیدتمند اس ضرورت کو محسوس کریں، اور مل کے بیٹھیں اور غور کریں کہ ملفوظات کے خلاف جو محاذ قائم کیا جارہا ہے، یہ کیوں؟ غور و فکر سے بات کی تہہ کو پہونچ جائیں گے، اور تدارک کے لئے لائحۂ عمل تجویز کرلیا جائے گا، جو بالاتفاق طے ہو، اس پر عمل کیا جائے تو خاطر خواہ یہ فتنہ فرو ہوسکتا ہے۔

ہلکی سی تدبیر یہ ہے کہ قدیم ملفوظات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں فراہم کی جائیں، جو آسانی سے دستیاب ہوسکتی ہیں، ان کے باہمی مقابلے سے ان کی تصحیح کی جائے اور انھیں شائع کرایا جائے، اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم بھی شائع کئے جائیں، اردو، ہندی، پنجابی، پوربی، بنگالی، گجراتی، راجستھانی، تامل، تلنگی، مہاراشٹری، غرض کہ ہندوستان کی ہر زبان میں اور انگریزی میں بھی، نہایت استقلال اور حزم و احتیاط سے اور کامل اخلاص سے اس کام کو کیا جائے، اور نشر و اشاعت کی بھی کوشش کی جائے۔

ہر کتاب پر سیر حاصل مقدمہ لکھا جائے اور پوری صحت سے اعتراضات کے جواب دئے جائیں، اور غلط بیانیوں کو سلیقہ سے رفع کیا جائے، اگر کامل استقلال سے کام کیا جائے گا، تو یہ فتنہ رفع ہو جائے گا، اور اچھا معاشرہ رواج پائے گا جو مقصود اصلی ہے ان ملفوظات کا، لیکن اس کے لئے باہمی اتحاد اشد ضروری ہے، مجھے توقع ہے کہ اولیاء اللہ کے عقیدتمند اس ضرورت کو محسوس کریں گے اور اپنے اپنے حلقے میں کام شروع کردیں گے، پہلا قدم یہی ہے کہ ملفوظات کے فارسی نسخوں کو صحت کے ساتھ شائع کیا جائے، اگر مستعدی سے کام لیا جائے گا تو اشاعت بھی آسان ہو جائے گی، یہ تحریک ہے، جب عمل کا آغاز ہوگا تو جو موانع حائل ہوں گے، رفع ہوتے رہیں گے۔

بنہ گام و خواہی بیاب

راجہ جے سنگھ کی رصدگاہیں

از

جناب شبیر احمد خاں غوری ایم. اے. ایل. ایل. بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۱۳)

جے سنگھ کا مسلم ماخذ

مسلم علم الہیئت سے راجہ جے سنگھ کی اثر پذیری کا مسئلہ

چنانچہ فاضل مصنف (جی. آر. کے) موکد الفاظ میں اس اثر پذیری کا اعلان کرتا ہے ؛

"ان عوامل و موثرات کے باب میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے، جنھوں نے اس کی (راجہ جے سنگھ کی) ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا، یہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کے اثرات تھے[1]"

خود راجہ کو اس کا اعتراف ہے، حالانکہ جس وجہ سے بھی ہو اُس نے ان ہندو جوتش اور یورپی ہیئت کی کتابوں کی جو اس کے مطالعہ میں رہی تھیں، تفصیل نہیں بتائی، مگر مسلم علم الہیئت کے ان شاہکاروں کا جن سے اس نے استفادہ کیا تھا" بڑے فخر و ابتہاج کے ساتھ نام بہ نام

[1] G.R. Kaye, Ph. 69

ذکر کیا ہے، چنانچہ کتابہائے ہندی" اور "زیج زنگی" سے پہلے وہ مسلم علم الہیئت کے چار شاہکاروں کا نام لیتا ہے، جو اس زمانہ میں مشہور و متداول "متعارف" تھے :

"زیجہائے متعارف مثل زیج جدید سعید گورگانی و خاقانی و تسہیلات ملا چند اکبر شاہی و ملا فرید شاہجہانی[1]"

مگر فاضل مصنف (جی. آر. کے) نے جس وجہ سے بھی ہو ان میں سے صرف پہلے تین کا ذکر کیا ہے اور اس میں بھی افسوسناک تسامح ہوئے ہیں، تفصیل آگے آرہی ہے،

مسلم (یونانی، عربی) علم الہیئت سے راجہ کے تاثر کے سلسلہ میں فاضل مصنف نے مندرجۂ ذیل ہیئت دانوں کا نام لیا ہے :۔ اقلیدس، ابرخس، بطلیوس، عبدالرحمٰن بن عمر ابوالحسین الصوفی، نصیرالدین طوسی، علی بن محمد السید الشریف، جمشید بن مسعود "جبات" (غیاث الدین؟) الکاشی، الغ بیگ، مولانا چند (چاند)

اقلیدس کی چار کتابیں مشہور تھیں : "اصول الہندسہ والحساب" علم ہندسہ میں اور "کتاب المناظر" "ظاہریات الفلک" اور "کتاب المعطیات" "متوسطات" میں، اصول الہندسہ والحساب : اصول اقلیدس کوئی دو ہزار سال تک متمدن دنیا میں ہندسہ کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی رہی تھی اور ریاضی و ہندسہ کے فضلاء اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے، خود راجہ کے زمانہ میں درباری طبیب میر محمد ہاشم نے اس کی مبسوط شرح لکھی تھی، راجہ کے ایماء سے سنسکرت زبان میں "چھیتر درس" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا گیا تھا، مگر "زیج محمد شاہی" میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس سے تعرض کا کوئی محل بھی نہیں تھا، کتاب المعطیات بھی ہندسہ ہی میں ہے، اس کا بھی محل نہ تھا، "ظاہریات الفلک" (Phaeno mena) نہ صرف ہندسہ کردی گئی ہیں

---

[1] زیج محمد شاہی : ص اب .

بلکہ ریاضیاتی (ہندسی) ہیئت کے اہم مسائل پر بھی مشتمل ہے، مگر راجہ نے "زیج محمد شاہی" میں اس سے کہیں تعرض نہیں کیا۔ "المناظر" بصریات (Optics) میں ہے، مگر راجہ نے ان مسائل سے بھی تعرض نہیں کیا۔

"زیج محمد شاہی" میں جے سنگھ نے اقلیدس کا ذکر صرف دیباچہ میں بطور "براعت استہلال" کیا ہے:۔

"براہین اقلیدس در بیان اشکال صنائع او حرفے ناتمام"[1]

ابرخس (Hipparchus) یونانی علم الہیئت کے آخری اور چوتھے دور "ریاضیاتی علم الہیئت" کا بانی و مفتتح ہے، بدقسمتی سے اس کی کوئی تصنیف دستبرد حوادث سے محفوظ نہ رہ سکی، اس کی دریافتوں تک رسائی کا واحد ذریعہ بطلیوس کی کتاب "المجسطی" ہے، جیسا کہ البیرونی "قانون مسعودی" میں کہتا ہے:

"ولم یقع الینا شیئ من کتب ابرخس یشف به الحال فعد لنا ضرورۃ الی اعمال بطلمیوس لانه تولاھا واحتاط فیھا۔"[2]

جے سنگھ نے اجرام سماوی کی حرکت کے سلسلے میں "گردش دوری" (Circular motion) کا انتساب بطلیوس کے ساتھ ساتھ ابرخس کی جانب بھی کیا ہے:۔

"چوں راصدان پیشین مانند ابرخس و بطلیوس مدار تعادیل و اوساط بر شکلہائے فلکی کہ قرار داد ایشان است داشتہ اند ... الخ"[3]

لیکن غالباً فاضل مصنف (اور اسی طرح راجہ جے سنگھ کے دوسرے تبصرہ نگاروں) کے پیش نظر

---

[1] زیج محمد شاہی: ص اب ۔ [2] ابوریحان البیرونی: القانون المسعودی
[3] زیج محمد شاہی: ص ۴۶ ظ ۔

یہ حوالہ نہ تھا، اس کے سامنے تو دیباچہ کا وہ جملہ تھا جو جے سنگھ نے بطور براعت استہلال اور "خس" (بمعنی ناچیز) کی مناسبت سے بطور "صنعت تجنیس ناقص" لکھا ہے:

"از نارسائی غور محیط قدرتش ابر خس خس است بر ہم زدہ دست افسوس"[1]

بطلیموس کی کتاب المجسطی سے راجہ کے تاثر کا تفصیلی ذکر اوپر آچکا ہے، لیکن فاضل مصنف کے سامنے "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ کا اگلا جملہ تھا:

"دور اندیشہ ارتفاع قدرتش بطلیوس خفاشے از رسیدن بآفتاب حقیقت مایوس"[2]

عبدالرحمٰن الصوفی چوتھی صدی ہجری میں عضد الدولہ دیلمی کے دربار کا ایک عظیم ہیئت داں تھا، علم الثوابت کے باب میں اس کی کتاب "صور الکواکب" علم ہیئت کی عالمی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے۔ الغ بیگ نے اپنی زیج میں ثوابت کی جو مبسوط فہرست دی ہے، وہ الصوفی کی "صور الکواکب" سے متاثر ہو کر مرتب کی گئی تھی، اس نے اس کتاب کا ایک مصور نسخہ اپنے یہاں تیار کرایا تھا اور دائرۃ المعارف حیدر آباد نے "صور الکواکب" کی تیاری میں اس نسخہ سے بھی مدد لی ہے، راجہ جے سنگھ نے اپنی "زیج" کی آخری فصل میں کچھ اوپر سو آٹھ ستاروں کا طول و عرض دیا ہے، اس کے پیش نظر الغ بیگ کی مبسوط فہرست تھی جس سے اس نے استفادہ بھی کیا تھا، اس استفادہ کا بدیں طور حوالہ دیتا ہے:

"چوں جدول الغ بیگی کافی بود، بآں قناعت کردہ شد"[3]

اور الغ بیگ الصوفی کی عظمت فن کی تعریف میں رطب اللسان ہے، چنانچہ تیسرے مقالہ کے تیرہویں باب میں کہتا ہے:

"و عبدالرحمٰن صوفی کتابے در معرفۃ ثوابت نوشتہ است کہ ہمہ فضلاء آں را تلقی بہ قبول

---

[1] زیج محمد شاہی ص اب [2] زیج محمد شاہی ص اب [3] زیج محمد شاہی ص ۸۲ ب۔

کردہ اند[1]"

اس لئے راجہ جے سنگھ جس کی زیچ "زیچ الغ بیگ" کی زیچ کا چربہ ہے، اس سے اور اس کی کتاب "صور الکواکب" سے ضرور واقف ہوگا، اگرچہ اس کی لائبریری میں ہنوز اس کی موجودگی کی تصدیق نہیں ہوئی۔

محقق طوسی (نصیر الدین طوسی) کی اہمیت و عظمت اسلامی علم الہیئت کی تاریخ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، وہ "زیچوں" کے اس سلسلہ کا بانی ہے، جس کا اختتام راجہ کی "زیچ محمد شاہی" پر ہوا، اور اگرچہ "زیچ الغ بیگ" کی اشاعت کے بعد اس کی پہلے کی سی مقبولیت نہیں رہی تھی، پھر بھی اکثر علمائے نجاریہ زائچہ سازی میں اول الذکر کے بجائے اسی پر اعتماد کرتے تھے، چنانچہ مولانا الیاس اردبیلی نے جو بادشاہ ہمایوں کے اساتذہ میں سے تھے، اکبر کا زائچہ محقق طوسی کی مرتبہ "زیچ ایلخانی" ہی کے ذریعہ تیار کیا تھا، چنانچہ ابوالفضل "اکبر نامہ" میں اس کا عنوان بدیں طور دیتا ہے:

"صورت زائچہ واقدس منقول از خط مولانا الیاس اردبیلی موافق زیچ ایلخانی"[2]

لہٰذا قیاس مقتضی ہے کہ راجہ نے اس سے بھی استفادہ کیا ہو، یا علی الاقل اس کے کتب خانہ میں رہی ہو، اگرچہ قدر ناشناسوں کی بے اعتنائی کے بعد جے پور کی لائبریریوں میں اس کا پتہ نہیں چل سکا۔

نصیر الدین طوسی کے دوسرے ہیئتی مصنفات میں 'تحریر المجسطی' 'تذکرہ فی الہیئۃ' 'رسالہ ہیئتیہ' 'بست باب' خصوصیت سے مشہور ہیں، ممکن ہے یہ بھی راجہ کے پیش نظر رہے ہوں، بالخصوص آخرالذکر جو اپنے موضوع پر انتہائی اہم شاہکار ہے، اور راجہ کو اس کی تیاری اور استعمال سے خصوصی

---

[1] زیچ الغ بیگ، [2] اکبر نامہ ج ۱ ص ۲۰۔

دلچسپی تھی۔

علی بن محمد السید الشریف (میر سید شریف جُرجانی) کا زیج محمد شاہی میں کہیں مذکور نہیں ہے، وہ اپنے وقت کے عظیم عبقری ضرور تھے مگر اتنے عظیم المرتبت ہیئت داں نہیں تھے کہ ان سے عظیم تر ماہرین علم الہیئۃ کو نظر انداز کر کے راجہ ان کا ذکر کرتا، ان سے عظیم تر اور مقبول تر قاضی زادہ رومی تھے، جن کی شرح چغمینی آج کے دن تک ریاضی و ہیئت کے اعلیٰ نصاب میں داخل ہے، اور جنھوں نے میر سید شریف کے ریاضیات میں کمتر معیار کا اعلان کیا تھا[1]

ممکن ہے تذکرہ طوسی کی دوسری شروح کی طرح ان کی شرح تذکرہ بھی راجہ کے کتب خانہ میں رہی ہو، مگر اس کی تصدیق کا کوئی امکان نہیں ہے، ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ نام ان کے رہنماؤں کی ستم ظریفی کا نتیجہ ہو، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

جمشید بن مسعود جیات (غیاث الدین) الکاشی کا ذکر اوپر آچکا ہے، الغ بیگ نے سمر قند میں جو عہد حاضر کی سب سے پہلی سائنٹفک اکیڈمی قائم کی تھی، وہ اس کے ارکان اربعہ میں سے تھے[2] اور اس کی تعمیر کردہ رصدگاہ کے پہلے سربراہ[3] مگر وہ اس سے کوئی آٹھ سال پہلے 'زیج ایلخانی' کی تکمیل و تتمیم کے لئے 'زیج خاقانی' کے نام سے ایک 'زیج' لکھ کر بادشاہ الغ بیگ کے نام معنون کر چکے تھے، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

مولانا چند (چاند) کا ذکر بھی آگے آرہا ہے۔

---

[1] الشقائق النعمانیہ: الجزء الاول، ص ۱۸: قال السید الشریف فی حقہ غلب علی طبعہ الریاضیات وقال ہو فی حق السید الشریف ہو لایقدر علی الافادۃ لی فی العلوم الریاضیۃ۔ (میر سید شریف قاضی زادہ کے بارے میں کہتے تھے کہ ان کے مزاج پر ریاضیات کا غلبہ ہے، اور قاضی زادہ کہتے تھے کہ میر سید شریف مجھے ریاضیات نہیں پڑھا سکتے) [2] مطلع السعدین، ص ۲۳۸۔ [3] الشقائق النعمانیہ، ص ۱۷۸۔

اسلامی علم الہیئۃ کے مشہور و متعارف شاہکاروں میں سے راجہ جے سنگھ نے خصوصیت کے ساتھ چار کتابوں سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے

"زیجہائے متعارف زیج جدید سعید گورگانی و خاقانی و تسہیلات ملا چند اکبر شاہی و ملا فرید شاہجہانی"[1]

مگر فاضل مصنف نے ان چار کو تین میں بدل دیا ہے، لکھتے ہیں:

"He found that the Calculations of the stars as obtained from the tables in Common Use such as the new tables of SAID GURGANI (and KHAQANI) and the Tashilat-i-Mulla Chand Akbar Shahi and the Hindu books, and the European tables, in very many Cases give them widely different from those determined by Observation"

(G. R. Kaye, p. 11)

مگر انتہائی افسوسناک تعجب ہے کہ انھوں نے اول الذکر کا مصنف میر سید شریف کو سمجھ لیا، چنانچہ پایان حواشی میں لکھتے ہیں؛

"Possibly Ali b M. al Saiyed al-Sharif al-Gurgani

---

[1] زیج محمد شاہی اص اب .

who lived from A.D. 1339 to 1404 in Shiraz and wrote a Commentary on Nasir at Tusis' Tadkira'

[بہت ممکن ہے اس سے مراد علی بن ایم (محمد) السید الشریف الگرگانی ہوں جو ۱۳۳۹ء سے ۱۴۱۴ء تک شیراز میں رہے، اور جنھوں نے نصیر الدین طوسی کے "تذکرہ" پر شرح لکھی۔]

اس کے بعد موسیو سدیو کے حوالے سے لکھا ہے کہ Curgani الغ بیگ کے خاندان کو ظاہر کرتا ہے اور الغ بیگ کی جداول کو کبھی گورگانی قانون (زیج گورگانی) سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس تذبذب اور کوہ کندن وکاہ برآوردن کا باعث یہ ہے کہ فاضل مصنف نے "زیج محمد شاہی" کی فارسی اصل کے بجائے اس کے دیباچہ کے انگریزی ترجمہ پر اکتفا کر لیا۔ لہٰذا انھوں نے

۱. SA'EED 'سعید' کو SAID اور اس طرح Sayid اور
۲. Goorgani 'گورگانی' کو گرگانی سمجھا جس کا معرب 'جرجانی' ہے۔
اس طرح 'سعید گورگانی' کو 'سید گرگانی' سمجھ بیٹھے۔

اس قیاس آرائی کی تکمیل کے لئے 'سید' سے پہلے علی بن ایم (محمد) کا اور الگرگانی سے پہلے 'الشریف' کا اضافہ کر کے اسے 'علی بن ایم السید الشریف الگرگانی' بنا دیا، جلد ہی انہیں اس کے لئے سند بھی مل گئی، کیونکہ سوٹر نے عرب ریاضی دانوں کا جو تذکرہ لکھا ہے، اس کے صفحہ ۱۷۲ پر انھیں علی بن ایم السید الشریف کا نام مل گیا جن کے لئے سوٹر نے لکھا ہے کہ وہ شیراز میں ۱۳۳۹ء سے ۱۴۱۴ء تک بقید حیات تھے اور انھوں نے نصیر الدین طوسی کی 'التذکرہ' کی

شرح بھی لکھی تھی۔

مگر فاضل مصنف نے اس تحقیق انیق پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی، میر سید شریف بے شک ایک عالم المعی و فاضل لوذعی تھے، بیشک وہ متداول درسی کتابوں کے ضمن میں علم ہیئت کے درسی متون بھی پڑھاتے تھے اور ان پر شروح بھی لکھی ہیں، چنانچہ

۱۔ طاشکبری زادہ نے قاضی زادہ رومی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ موخر الذکر نے ان سے ریاضیات پڑھی تھی، مگر استاد شاگرد کو مطمئن نہ کر سکے۔

"قال السید الشریف فی حقه غلب علی طبعه الریاضیات وقال هو فی حق السید الشریف هو لا یقدر علی الافادة لی فی العلوم الریاضیة"[1]

(میر سید شریف قاضی زادہ کے بارے میں کہتے تھے کہ ان کے مزاج پر ریاضیات کا غلبہ ہے، اور قاضی زادہ کہتے تھے کہ میر سید شریف مجھے ریاضیات نہیں پڑھا سکتے)

۲۔ سخاوی نے الضوء اللامع میں ان کی تصانیف کی ایک مبسوط فہرست دی ہے، ان میں دو کتابیں علم ہیئت میں ہیں، شرح تذکرہ اور شرح ملخص فی الہیئة[2] خوش قسمتی سے دونوں کے مخطوطے ہنوز موجود ہیں، پہلے کے کثیر تعداد میں اور دوسرے کے کم۔

غرض وہ علم ہیئت کے عالم ضرور تھے، مگر ہیئت داں نہیں تھے، نہ انھوں نے کوئی فلکیاتی مشاہدات کئے اور نہ کوئی زیج مرتب کی، رہی ان کی شرح "تذکرہ" اور شرح "چغمینی" تو یہ دونوں علم الہیئة کے درسی متون ہیں جو اس فن کے اصول و مبادی پر مشتمل ہیں، ان میں فلکیاتی جدول کوئی نہیں ہے اور اس لئے ان پر "زیج" کا اطلاق نہیں ہو سکتا، ان کے علاوہ انھوں نے کوئی زیج مرتب نہیں کی، چہ جائیکہ ایسی زیج جس پر "زیج متعارف" کا

[1] الشقائق النعمانیہ الجزء الاول، ص ۱۸ [2] الضوء اللامع الجزء الخامس، ص ۳۲۹۔

اطلاق ہو سکے، حالانکہ راجہ جے سنگھ کو اپنے مخصوص مقصد کے لئے زیچ کی ضرورت تھی، درسی متون کی نہیں۔

رہا دوسرا احتمال جو انھوں نے سدیو کے "مقدمۂ زیچ الغ بیگ" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "الغ بیگ کی زیچ کو اکثر "زیچ گورگانی" کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا۔ اسے انھوں نے اپنی پہلی تحقیق کی دھن میں زیادہ قابلِ اعتنا، نہ سمجھا اور جو دور کی کوڑی لائے تھے اسی پر مصر رہے اسی لئے انھوں نے اپنی فاضلانہ تصنیف کے آخری باب میں جہاں جے سنگھ کی تصنیفات کے اشخاص کی فہرست دی ہے، اس میں علی بن محمد السید الشریف (۱۳۳۹ء سے ۱۴۱۴ء) کا نمایاں طور پر ذکر کیا ہے، اسی طرح صفحہ ۴۴ پر نصیر الدین طوسی کے ساتھ اس کے شارح کی حیثیت سے ان کا بھی ذکر کیا ہے بلکہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ میر سید شریف کا نام خود راجہ جے سنگھ نے اپنی زیچ میں لیا ہے[1]

"In the preface to his own catalogue — he not only mentions Nasir al-Din al-Tusi, ... but also his Commentator (Ali b. M) al-Gurgani"

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جے سنگھ نے کہیں بھی میر سید شریف کے نام یا کام سے تعرض نہیں کیا اس نے تو یونانی، عربی ہیئت کے اساطین کبار ابلونیوس وارشمیدس، ارسطرخس، واوطولوقیوس، ثاؤذوسیوس، ومانالاؤس، یحییٰ بن ابی منصور، عباس بن سعید الجوہری، بنو موسیٰ، ثابت بن قرہ حتیٰ کہ البتانی، ابو الوفا، ابو ریحان البیرونی، ابن الہیثم اور ابن یونس تک کو درخور ذکر نہیں سمجھا۔

غالباً یہ سارا خلط مبحث لفظ "سعید" سے پیدا ہوا ہے، مگر یہ الغ بیگ کا خطاب ہے

[1] G. R. Kaye, P.88.

جو مرنے کے بعد اسے دیا گیا تھا، چنانچہ دولت شاہ "تذکرۃ الشعراء" میں اس کا ذکر بدیں طور کرتا ہے:

"اما شان مغفور سعید الغ بیگ گورگان سقی اللہ روضتہٗ وانار اللہ برہانہ ... الخ"[1]

واضح رہے کہ الغ بیگ نے اپنی زیج کا کوئی نام نہیں رکھا، وہ اسے صرف "کتاب" کہتا ہے، جو گویا اس کے فلکیاتی مشاہدات کی ایک یادداشت ہے، جیسا کہ دیباچہ میں لکھتا ہے:

"آنچہ از روش سیارگان برصد وامتحان معلوم شد، دریں کتاب ثبت افتاد"[2]

دولت شاہ کہتا ہے کہ اس نے اسے اپنے نام سے موسوم کیا تھا:

"و زیج سلطانی اخراج نمودہ وخطبہ بنام خود نوشتہ"[3]

عبدالرزاق کاشی نے اس کا نام "زیج سلطانی گورگانی" بتایا ہے۔

"آں زیج تصحیح یافتہ با تمام رسید و بزیج سلطانی گورگانی موسوم شد"[4]

حسن رو ملو نے اس کا نام زیج جدید سلطانی گورگانی لکھا ہے، احسن التواریخ میں کہتے ہیں

"شاہزادہ بہ تصحیح آں زیج موفق گردیدہ باتمام رسید و بزیج جدید سلطانی گورگانی موسوم شد"[5]

صاحب "روضۃ الصفاء" نے اس کا نام "زیج جدید گورگانی" بتایا ہے، زیادہ قابل اعتماد قول علامہ برجندی کا ہے، جنھوں نے اس کی ایک مبسوط شرح لکھی ہے، انھوں نے اس کا نام "زیج جدید سلطانی" بتایا ہے[6]،

متاخرین میں یہ زیج الغ بیگی کے نام سے مشہور تھی، چنانچہ محمد صالح کنبو نے "عمل صالح" میں

---

[1] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۶۱، [2] زیج الغ بیگ ص ۲ ظ [3] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۶۳ [4] مطلع السعدین، ص ۲۳۹، [5] احسن التواریخ ص ۱۱۸ (وقائع سال ۸۲۲ھ واقعات متنوعہ) [6] ورق ۱ ب۔

ملا فرید منجم کے تذکرہ میں ان کی مرتبہ "زیج شاہجہانی" کی تعریف میں لکھا ہے:

"بالفعل اہل ایں فن از زیج الغ بیگی مستغنی شدہ"[1]

بہرحال راجہ جے سنگھ نے اسے "زیج جدید سعید گورگانی" لکھا ہے۔

خاقانی (زیج خاقانی) کے مصداق کے تعین میں بھی فاضل مصنف نے "زیج جدید سعید گورگانی" جیسے تذبذب کا اظہار کیا ہے۔ اس کے سلسلہ میں بھی دو رائیں دی ہیں، پہلے حسب سابق سوئر کا سہارا لیا ہے اور بڑی دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"سوئر (ص ۹۵) ایک ہیئت داں اور نجومی الخاقانی کا ذکر کرتا ہے جس نے ۱۱۳۰ء میں وفات پائی اور جس نے ہیئتی جداول کی اصلاح پر کام کیا"

سوئر کا ماخذ ابن القفطی کی "تاریخ الحکماء" ہے، جس میں اس نے لکھا ہے:

الخاقانی المنجم، وکان موصوفاً	خاقانی منجم، علم نجوم، اس کی تسیر نیز زیجوں کے
بعلم النجوم وتسیرھا وحل	حل کرنے، ان کے طبائع پر بحث کرنے
ازیاجھا والکلام علی طبائعھا	اور ان سے جو حوادث کے احکام صادر
واحکام الحوادث الصادرۃ	ہوتے ہیں ان میں تبحر کے لئے مشہور تھا
عنھا. ولہ اشتھار بذلک،	اسی میں اس کی شہرت ہے، اس نے
توفی فی العشر الثالث من سنی	پانچویں صدی ہجری کی تیسری دہائی میں
المائۃ الخامسۃ للھجرۃ.	وفات پائی۔

(تاریخ الحکماء لابن القفطی ص ۱۸۱)

مگر اس حوالہ کو درخور اعتناء سمجھنے سے پہلے انھیں چند باتوں پر غور کر لینا چاہئے۔

---

[1] عمل صالح، ص ۳۶۲،

اولاً: حسب تصریح ابن القفطی خاقانی نے ۴۲۰ھ (جو سوٹر کے حساب سے ۱۰۳۰ء کے مطابق ہے) کے قریب وفات پائی، بالفاظ دیگر وہ ابوریحان البیرونی، ابن الہیثم اور ابن یونس کا ہمعصر تھا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر راجہ جے سنگھ خاقانی جیسے غیر معروف منجم کی مزعومہ زیچ سے استفادہ کرسکتا تھا تو اسے اس کے معاصرین (جو علم ہیئت کی عالمی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں) کی ہیئتی تصانیف بالخصوص "زیچوں" کے درخور اعتنا سمجھنے میں کیا امر مانع تھا۔ البیرونی کی "قانونِ مسعودی" میں ہیئتی مباحث کے علاوہ متعدد ہیئتی جداول بھی ہیں اور ابن یونس کا شاہکار "الزیج الکبیر الحاکمی" تو ہے ہی۔

ثانیاً: خاقانی ہیئت داں سے زیادہ نجومی تھا، جیساکہ پیشین گوئیوں میں اس کی صداقت واصابت کے بارے میں ابن القفطی نے لکھا ہے:

"وکان موصوفاً..... باحکام الحوادث الصّادرۃ عنہا"

اور اسی لئے اس کی شہرت تھی (ولہ اشتہار بذالک) مگر راجہ کو صحیح نجومی پیشین گوئیوں کے اصول جاننے کی ضرورت نہ تھی، وہ تو ایسی "زیچ" اور "تقویم" چاہتا تھا جس کی مدد سے مختلف مظاہر فلکی کے وقوع کا حساب مشاہدہ اور ارصاد کے مطابق ہو۔

ثالثاً: خاقانی کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں ہے۔ زیچ کا کیا سوال، ابن القفطی کی تصریح کے مطابق وہ زیچوں کے حل کرنے میں ماہر تھا (وکان موصوفاً بعلم النجوم..... وحل ازیاجہا) خود اس نے کوئی زیچ نہیں لکھی، اور اگر کوئی یادداشت لکھی بھی ہو تو وہ مظاہر فلکی کے اوقات کے استخراج پر نہیں ہوگی، بلکہ حوادث کائنات میں ان کے اثر وتاثیر پر ہوگی، جیساکہ ابن القفطی کے الفاظ "طبائعہا واحکام الحوادث الصّادرۃ عنہا" سے ظاہر ہے۔

لہٰذا فاضل مصنف کی یہ کاوش بیش از کوہ کندن وکاہ برآوردن نہیں ہے۔

اس کے بعد انھوں نے دوسری رائے لکھی ہے :

"زیج خاقانی نصیرالدین طوسی کی زیج ایلخانی کا تکملہ تھی، جسے جمشید الکاشی نے مرتب کیا تھا، مگر انھوں نے اپنا ماخذ نہیں بتایا، ویسے ظاہر ہے یہ سوٹر کے قول کا تسلسل تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ "زیج خاقانی" کو "زیج ایلخانی" کا تکملہ بتاتے ہیں، جو ۱۲۷۱ھ کے قریب مرتب ہوئی تھی حالانکہ بقول سوٹر خاقانی نے ۱۴۳۰ء میں وفات پائی۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ زیج خاقانی غیاث الدین جمشید کاشی کی تصنیف ہے جسے انھوں نے ۸۱۶ھ میں مکمل کر کے بادشاہ الغ بیگ کے نام معنون کیا تھا، مزید تفصیل حسب ذیل ہے:

تیموری سلاطین میں الغ بیگ کو یہ امتیازی شرف حاصل ہے کہ اس نے نہ صرف عجم کی آخری اہم رصدگاہ تعمیر کرائی، بلکہ عہد حاضر میں سب سے پہلی سائنس اکیڈمی قائم کی، چنانچہ عبدالرزاق کاشی 'مطلع السعدین' میں، اس کی علم دوستی کے بارے میں لکھتا ہے :

"با خواص حکماء، و فحول عقلاء مہندسین عطارد ذکا و فیلسوفان مجسطی کشا کہ در جمیع علوم و حقائق معقول و مفہوم بتخصیص ریاضی و حکمی عجوبۂ عصر و نادرہ دہر بودند، مثل فلاطون زماں مولانا صلاح الدین موسیٰ قاضی زادہ رومی و بطلمیوس دوراں مولانا علاء الدین علی قوشجی کہ تربیت یافتہ مرزا الغ بیگ بود و بزبان عنایت ادرا فرزند خطاب فرمود، و ایں دو محقق دانشمند در سمرقند اقامت داشتند، و مولانائے اعظم غیاث الدین جمشید و مولانائے معظم معین الدین کہ مرزا الغ بیگ ایشاں را از کاشان بسمرقند بردہ بود، انجمنے ساخت[1]۔"

اس مجلس علمی کے ارکان کی بیشتر توجہ ریاضیات، بالخصوص ہیئتی تحقیقات پر مبذول رہی، چنانچہ صاحب "مطلع السعدین" نے ان کی ہیئتی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا ہے :

---

[1] مطلع السعدین، ص ۲۳۸۔

"در معرفت دقائق تنجیم وادراک غوامض تقادیم بآں دانشوراں کہ بمدد عقل کل بر کیفیت ہر جزوے از اجزاے سپہر واقف بودند وبخطوات اقدام مسافر وہم کمیت طول و عرض عالم علوی می پیمودند و در تحقیق ابعاد وسطوح اجرام ہیچ دقیقہ مہمل و ہیچ ثانیہ نامرعی نماند، و در ارتفاع درجات مرتبہ سخن بفلک الافلاک رسانده سخناں پرداخت[1]"

یہ مجلس علمی ۸۱۵ھ سے کچھ پہلے قائم ہوئی تھی، اس کے ارکان اربعہ میں سے مولانا معین الدین کاشی کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں، مولانا علاء الدین علی قوشچی ابھی حداثت سن میں تھے، البتہ باقی دو فاضلوں مولانا غیاث الدین جمشید کاشی اور قاضی زادہ رومی نے اس زمانہ (۸۱۵ھ) کے قریب ریاضی وہیئت کے لافانی شاہکار مرتب کر کے قدر دان بادشاہ کے نام معنون کئے، قاضی زادہ رومی نے "شرح چغمینی" اور "شرح اشکال التاسیس" اور مولانا غیاث الدین جمشید کاشی نے (اور علمی شہ پاروں کے علاوہ) "زیج خاقانی"۔ انھوں نے یہ زیج جیسا کہ انڈیا آفس لائبریری کے فہرست نگار نے تصریح کی ہے ۸۱۶ھ میں مکمل کی تھی، اس زیج کا واحد نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے[2]۔ (نمبر ۲۲۳۲)

البتہ فہرست نگار کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ یہ "زیج الغ بیگ" کا ابتدائی ایڈیشن ہے:

"Zij-i-Khaqani (زیج خاقانی) the first or orignal edition of the chronological and astronomical tables of Sultan Ulugh Beg bin Shahrukh bin Timur Gurganmm with a detailed description,

---

[1] مطلع السعدین ص ۲۳۸۔ [2] Catalogue of India Office Library Persian Manuscripts, Col 1220-1221

Compiled under his superintendence by Jamshed bin Masud bin Muhammad al-Talib al kashi.[۱]

کیونکہ زیج الغ بیگ رصدگاہ سمرقند کے ارصادات کے قلم بند کرنے کے لئے مرتب کی گئی تھی[۲]،
مگر یہ رصدگاہ حسب تصریح "حبیب السیر" و "احسن التواریخ" ۸۲۳ھ میں بننا شروع ہوئی تھی اور
پیش نظر "زیج خاقانی" حسب تصریح فہرست انڈیا آفس لائبریری ۸۱۶ھ میں مکمل ہوئی تھی،
لہٰذا رصدگاہ کے قیام سے پہلے اس کے ارصادات کے قلمبند کرنے کا کیا سوال، خود بادشاہ
الغ بیگ صراحت کرتا ہے کہ غیاث الدین جمشید اس قسم کے کسی کام کو انجام دینے سے پہلے ہی
وفات پا گئے[۲]، نیز زیج خاقانی کا انداز ترتیب و تبویب بھی زیج الغ بیگ سے قطعاً مختلف ہے،

زیج الغ بیگ میں چار[۳] مقالے ہیں:

۱. مقالۂ اول۔

۲. مقالۂ دوم۔

۳. مقالہ سوم۔

۴. مقالۂ چہارم۔

لیکن زیج خاقانی میں چھ مقالے ہیں بہ ترتیب ذیل:

۱. مقالۂ اول درمعرفت تواریخ مشہورہ۔

۲. درمعرفت جیب وسہم وظل ومیل ومطالع، ذکر طول وعرض بلدان۔

۳. درمعرفت مواضع کواکب در طول وعرض وتوابع آں۔

---

[۱] فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری کالم ۱۲۲۱ - ۱۲۲۰ [۲] زیج الغ بیگ ص ۲ [۳] زیج الغ بیگ ص ۲ تا -

۴. استخراج سائر قسی وخطوط مشہورہ۔

۵. در معرفت طالع از معلومات مختلفہ۔

۶. درباقی اعمال نجومی کہ آن تسیرات است الخ

لہٰذا مولانا غیاث الدین جمشید کاشی نے 'مفتاح الحساب' کے دیباچہ میں اس زیج کا جو تعارف کرایا ہے اس میں رصدگاہ سمرقند کے ارصادات کا ادنیٰ الزام بھی نہیں ہے (اور ہو بھی نہیں سکتا تھا) اس کے برخلاف وہ اسے 'زیج ایلخانی' کی اصلاح یا نظرثانی یا تکملہ بتاتے ہیں' فرماتے ہیں:

استأنفت استخراج جمیع	میں نے زیج ایلخانی کی تمام جدولوں کا
جداول الزیج الایلخانی	از سرنو بڑی دقت نظر کے ساتھ استخراج
بادق عمل ووضعت الزیج	کیا، اور اس طرح وہ زیج مرتب کی جو
المشہور بالخاقانی فی تکمیل	'زیج خاقانی در تکمیل زیج ایلخانی' کے
الزیج الایلخانی وجمعت فیہ	نام سے مشہور ہے، اس کے اندر میں نے
جمیع ما استنبطت من اعمال	سابق ہیئت دانوں کے اعمال سے
المنجمین فیما لا یأتی من زیج	جو کچھ مستنبط کیا تھا اور جو دوسری
آخر مع البراهین الهندسیة[1]۔	زیجوں میں نہیں ملیں گے، مع ان کے
	ہندسی دلائل کے جمع کیا ہے۔

(باقی)

---

[1] مفتاح الحساب مولانا جمشید کاشی مخطوط مولانا آزاد لائبریری، ذخیرہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نمبر ۱۹۰/۸ علوم ہیئت وہندسہ جبر ومقابلہ وحساب۔

امام ربیع بن سلیمان مرادی

از

حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی، رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

(۲)

امام ربیع کی نشستوں میں صرف کتاب الام، کتاب الحجۃ یا مبسوط کی روایت اور املا ہی محدود نہ تھا، امام شافعی کی شخصیت سے متعلق اہم، غیر اہم اور کلی وجزئی، ہر قسم کی باتوں کا ذکر ان نشستوں میں ہوتا تھا، سیرت شافعی کا تقریباً نصف حصہ امام ربیع کی یادداشتوں پر منحصر ہے سیرت ربیع کا مطالعہ کرنے والوں کو خود امام ربیع سے متعلق تفصیلات اگر کم ملتی ہیں تو یہ تعجب کی بات نہیں، ان مخلص حضرات کی ساری تگ و دو محبوب استاذ کی ذات اور تعلیمات کے لئے وقف تھی، انھیں اپنے استاذ کے علم اور تفقہ پر اعتماد کامل تھا، چنانچہ امام ربیع فرماتے ہیں کہ اصحاب حدیث تفسیر حدیث سے ناواقف تھے، یہاں تک کہ امام شافعی نے تفسیر حدیث کی بنیاد ڈالی[۱]، وہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی صحیح معنوں میں عربی النسل اور عربی اللسان تھے[۲] ایک موقع پر شاگردوں سے فرمایا کہ اگر تم لوگ امام شافعی کو دیکھتے تو کہہ اٹھتے کہ ان کی زبان کے سامنے ان کی یہ کتابیں کچھ نہیں، بخدا ان کی زبان ان کی کتابوں سے کہیں زیادہ فصیح و بلیغ تھی البتہ وہ اپنی تالیفات میں اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ وہ عوام کے لئے واضح اور سلیس

---

[۱] توالی التاسیس: عسقلانی، ص ۵۹ [۲] معجم المصنفین ص ۲۶۹۔

زبان میں ہوں[۱]۔

ایک موقع پر فرمایا کہ تمام محدثین پر امام شافعیؒ کا احسان ہے، کسی نے دریافت کیا، وہ کیسے؟ فرمایا کہ اصحاب رائے اصحاب حدیث کا مذاق اڑاتے تھے، یہاں تک کہ امام شافعیؒ نے انھیں علم سکھایا اور ان کے خلاف حجت قائم کی، وہ امام شافعی کے اس قول کی اکثر تکرار کرتے کہ کون سا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کون سی زمین مجھے پناہ دے گی، اگر میں کسی حدیث نبویؐ کی روایت کروں اور پھر اس پر فتویٰ نہ دوں[۲]۔ یہ قول بھی امام ربیع نے اکثر نقل کیا کہ اگر تم میری کتاب میں حدیث نبوی کے خلاف کچھ پاؤ تو میرے قول کو بالکل ترک کر دو اور حدیث کو اختیار کرو[۳]۔ اگر میں کسی صحیح حدیث کو نقل کروں لیکن اس پر فتویٰ نہ دوں تو تم سمجھ لو کہ میری عقل جاتی رہی[۴]۔

ان اقوال سے جہاں امام ربیع کا فکری رُخ متعین ہوتا ہے وہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعی اپنے شاگردوں کی ذہنی تربیت کس نہج پر کرتے تھے، ایک بار امام شافعی نے امام ربیع سے فرمایا میں نے تم کو اتنا سکھا دیا ہے جو تمھیں ان شاء اللہ بے نیاز کر دے گا، لیکن یہ اصول یاد رکھو کہ کسی حدیث پر عمل کو مت ترک کرو، سوائے اس کے کہ اس حدیث کے مفہوم کے خلاف کوئی دوسری حدیث بھی موجود ہو، اختلافِ احادیث کی صورت میں تطبیق کی امکانی فکر و کوشش کے بعد جو رائے قائم ہو اس پر عمل کرو[۵]۔

ایک مرتبہ فرمایا: اے ربیع! مسائل واستفسار کے جواب دو، خواہ اس میں خطا کا امکان ہو، کیونکہ بغیر خطا کیے کوئی صحیح فیصلے نہیں کر سکتا، ان کے الفاظ ہیں:

اجب یا ربیع فی المسائل فانہ	اے ربیع! مسائل کا جواب دو، کیونکہ
لا یصیب احد حتی یخطی[۶]	جب تک کوئی غلطی نہ کرے، صحیح جواب تک

---

۱ معجم المصنفین ص ۲۷۰ ۲ توالی التاسیس ص ۶۳ ۳ ایضاً ۲ ۴ ایضاً ص ۶۱ ۵ ایضاً ص ۶۲۔

نہیں پہونچ سکتا۔

تربیت کے یہ وہ حکیمانہ اصول تھے جن سے آراستہ ہوکر امام ربیع اور ان کے دوسرے تلامذہ نے ایک مختصر عرصہ میں اپنے استاذ کے مسلک کو تقریباً سارے عالم اسلام میں رائج کر دیا۔

امام ربیع شاعر تو نہیں تھے لیکن امام شافعی جیسے باکمال اہل زبان بلکہ عربی شاعری کے مزاج داں کے فیض اثر سے وہ حسن ذوق اور سخن فہمی سے محروم بھی نہیں تھے، امام شافعی کے بہت سے اشعار ان سے منقول ہیں، امام سبکی اور ابن اثیر نے ان اشعار کو تفصیل سے بیان کیا ہے، یہاں صرف چار اشعار نقل کئے جا رہے ہیں جنھیں امام شافعیؒ نے خاص طور سے امام ربیع کو سنایا تھا[1]

صدیق لیس ینفع یوم بأس — قریب من عدو فی القیاس

وما یبغی الصدیق بکل عصر — ولا الاخوان الا للتاسی

عمرت الدھر ملتمسًا بجھدی — اخا ثقة فاکداہ التماسی

تنکرت البلاد علی حتی — کان اناسھا لیسوا بناس

(ایسا دوست جو مصیبت کے وقت کام نہ آئے، سمجھو کہ وہ تقریباً دشمن ہے، ہر زمانہ میں دوستوں اور بھائیوں سے غمخواری کی آس رہتی ہے، ایک قابل اعتماد دوست کی تلاش میں زندگی گذری لیکن محرومی ہاتھ لگی، میرے لئے سارا شہر اجنبی ہے، گویا یہاں کے لوگ انسان ہی نہیں۔)

امام ربیع کے سوانح حیات میں جگہ جگہ امام شافعی سے متعلق اقوال و احوال نظر آتے ہیں، لیکن یہ امام شافعی کے سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پروئے،

[1] طبقات کبریٰ: سبکی ج ۱، ص ۱۵۰۔

امام ربیع سے متعلق تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے عالی مرتبت استاد کا ایسا اثر قبول کیا کہ ان کی ساری زندگی، استاد کے علم، فکر اور خیالات و تصورات کا پرتو ہوگئی تھی، دوشنبہ ۲۰ شوال سنہ ۲۷۰ھ ۸۸۴ء میں علم و فضل کا یہ گل سرسبد مصر کی سرزمین میں آسودۂ خاک ہوگیا[1] مشہور قبرستان قرافہ میں تدفین ہوئی[2]، اس وقت کے مصری حکمراں خمارویہ بن احمد بن طولون نے نماز جنازہ پڑھائی[3] اور اس طرح امام شافعی کے اصحاب میں وہ سب سے آخری تھے جو اپنے محبوب استاذ سے جا ملے، ابن خلکان نے حافظ منذری کے دو شعر نقل کئے ہیں جو انھوں نے امام ربیع کی وفات پر کہے تھے[4]:

صبراً جميلاً ما اسرع الفرجا   من صدق الله في الامور نجا

من خشي الله لم ينله اذى   ومن رجا الله كان حيث رجا

(صبر جمیل اختیار کرو، کشایش جلد ہی ہے، جو معاملات میں اللہ کی تصدیق کرے نجات پاتا ہے، جو اللہ سے ڈرتا ہے اسے کوئی تکلیف نہیں، اور جو اللہ سے پرامید رہتا ہے اس کی امید پوری ہوا کرتی ہے)

امام ربیع نے ورثہ میں ایک صاحبزادہ ابو المعنی محمد کے علاوہ جو ان کے بعد تین سال زندہ رہے[5]، تلامذہ و تالیفات کے گراں قدر خزانے چھوڑے، ان کے تلامذہ کی تعداد یوں تو ہزاروں سے بھی متجاوز ہے لیکن تاریخ نے جن چند جلیل القدر اور عالی مرتبت حضرات کے اسمائے گرامی محفوظ کر رکھے ہیں، ان میں ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابو زرعہ، ابو حاتم، عبد الرحمن بن ابی حاتم، ابن خزیمہ، محمد بن جریر طبری، زکریا ساجی، طحاوی، محمد بن زیاد نیشاپوری، حسن

---

[1] اعلام ج ۱، ص ۳۱۶، تہذیب التہذیب ج ۳، ص ۲۵۴ [2] وفیات: ابن خلکان ص ۳۲۷۔

[3] طبقات: سبکی ج ۱، ص ۲۶۰ [4] وفیات ابن خلکان، ص ۳۲۷۔

ابن حبیب مصایری، ابن صاعد، ابو العباس اصم، ابو الفوارس سندی، محمد بن طائف بغدادی، محمد بن ہارون رویانی، ابو نعیم عبد الملک جرجانی، عبد اللہ بن یوسف موصلی، ابن سیف ابو بکر محمود بن احمد خلالی، عبد اللہ بوشنجی، ابو الحسین اصفہانی،[۱] ابو سعید فریابی، محمد بن نصر مروزی، ابو یعقوب اسفرائنی، ابو عبد اللہ ہروی، عثمان بن سعید انماطی، کنیز، نوح بن منصور شیرازی جیسے ائمۂ حدیث و فقہ ہیں، ان میں سے ہر ایک خود صاحب تذکرہ ہے، ایسے گلہائے رنگارنگ سے خود صاحب چمن کی گلستاں بکنار شخصیت کا اندازہ ارباب ذوق و نظر بخوبی لگا سکتے ہیں

ان کی تصانیف میں علامہ سیوطی نے کتاب الام، امالی اور مختصر ربیع کا ذکر کیا ہے[۲]۔ ایک اور کتاب، اصول الفقہ کے نام سے بھی ہے جو مصر سے شائع ہو چکی ہے[۳]، لیکن جیسا کہ علامہ سبکی نے کہا ہے یہ کتابیں دراصل امام شافعی کی ہیں، ربیع صرف ان کے راوی ہیں[۴]، ان کتابوں میں کتاب الام سب سے اہم، مکمل اور متداول کتاب ہے، اس کتاب کے بارہ میں علامہ عسقلانی کا خیال ہے کہ اس کے جامع بویطی ہیں، لیکن وہ منسوب امام ربیع کی جانب ہے[۵]، صاحب کشف الظنون کے خیال کے مطابق کتاب الام کی تصنیف امام بویطی نے کی ہے لیکن ابواب کی تقسیم و تعیین امام ربیع نے کی، بعد میں تصنیف کی نسبت بھی انہی کی طرف ہو گئی[۶] لیکن ایک محقق کا یہ قول زیادہ صحیح ہے کہ کتاب الام میں امام شافعی کے اقوال کو پہلے امام بویطی نے جمع کرنا شروع کیا تھا، لیکن اس کی تکمیل امام ربیع کے ہاتھوں سے ہوئی[۷]، تعجب ہے کہ

۱۔ انھیں وراق ربیع بن سلیمان بھی کہا جاتا ہے، طبقات کبریٰ ج ۲، ص ۱۹۔ ۲۔ حسن المحاضرہ ص ۱۲۲، ۳۔ معجم المطبوعات: سرکیس ج ۱، ص ۴۶۹ ۴۔ طبقات السبکی ج ۱، ص البدایۃ والنہایۃ ج ۱۰، ص ۲۵۲، ۵۔ معجم المصنفین ۶۔ کشف الظنون ج ۲، ص ۲۶۶، ۷۔ اختلاف الفقہاء للطحاوی: معصومی ص ۱۲۔

امام الحرمین نے اسے امام شافعی کی کتاب قدیم بتلایا ہے، ابن اثیر نے اس قول پر حیرت کے اظہار کے بعد لکھا ہے کہ امام ربیع بالاتفاق اس کتاب کے راوی ہیں، چونکہ وہ مصری ہیں اس لئے یہ کتاب امام شافعی کے قدیم اقوال پر مشتمل نہیں ہو سکتی[1]

صاحب کشف الظنون نے اس کتاب کی پندرہ[15] جلدیں گنائی ہیں، لیکن ہمارے سامنے مصر سے شائع شدہ سات جلدوں میں مکمل کتاب الام موجود ہے، جس کے حاشیہ پر مختصر مزنی بھی درج ہے، اور اب یہی متداول ہے، اس کتاب پر آئندہ ایک مستقل مضمون میں بحث کی جائے گی۔

امالی و مختصر ربیع کا اب کہیں ذکر نہیں ملتا۔

ابن ندیم کی تحقیق کے مطابق امام شافعی کی اصل کتاب مبسوط ہے[2] جس کے راوی امام ربیع ہیں، امام ربیع فرماتے ہیں کہ امام شافعی نے اس کتاب کو صرف حافظہ کی مدد سے مرتب فرمایا تھا، اس کی تالیف کے وقت ان کے پاس کوئی دوسری کتاب نہ تھی[3]، ابن ندیم نے اس کتاب کے تقریباً ۱۱۲ ابواب بھی شمار کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ مبسوط کے نام سے ایک اور مجموعہ امام زعفرانی کا بھی تھا، اور یہ بالکل امام ربیع کی ترتیب کے مطابق تھا، لیکن لوگوں نے اس مجموعہ سے زیادہ رغبت کا اظہار نہیں کیا، فقہاء کا عمل بھی اس پر نہیں رہا، فقہاء کی معمول یہ کتاب امام ربیع کی مبسوط ہی رہی، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ اب ہمیں زعفرانی کی مروی کتابوں کے عناوین لکھنے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ وہ اب کمیاب ہیں، اکثر حصہ ان کا نایاب ہے، پھر بعد میں انھیں دوبارہ لکھا بھی نہیں گیا[4] لیکن حیرت ہے کہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۰، ص ۲۵۲ [2] الفہرست: ابن ندیم ص ۲۹۵ [3] معجم المصنفین ص ۲۹۸،
[4] فہرست: ابن ندیم، ص ۲۹۷۔

مبسوط کا ذکر حاجی خلیفہ نے نہیں کیا، دوسرے مورخین نے بھی مبسوط کا ذکر نہیں کیا۔ ابن ندیم اسے سب سے اہم مانتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ کتاب الام کو یا اس کے بعض اجزا مبسوط کے نام سے تعبیر کر دیا گیا ہو، مجھے بھی کتب خانوں کی فہرست میں مخطوطات و مطبوعات دونوں میں یہ کتاب نہ مل سکی۔

امام ربیع سے روایت شدہ کتابوں میں مسند شافعی بھی ہے[1] اس کے بارے میں کبھی یہ خیال تھا کہ کتاب الام کا دوسرا نام ہی مسند شافعی ہے[2]، لیکن یہ رائے صحیح نہیں تھی، چنانچہ علامہ سیوطی نے تدریب الراوی میں لکھا کہ یہ امام شافعی کی کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ ابوجعفر محمد بن مطر نیشاپوری نے محمد بن یعقوب اصم شاگرد ربیع سے کتاب الام کے بعض مباحث سنے اور نقل کیے، انہی کے مجموعہ کا نام مسند شافعی ہے[3]۔

صاحب معجم المصنفین مولانا محمود حسن ٹونکی نے اپنے استاد شیخ الحدیث حسن بن محسن انصاری یمنی بھوپالی نزیل ہند سے امام ربیع تک اپنے سلسلۂ سند کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مسند شافعی، کتاب الام کے علاوہ ایک دوسری تصنیف ہے[4]۔

لیکن شاہ عبدالعزیز دہلوی نے وضاحت سے لکھا ہے کہ مسند شافعی اصلاً ان احادیث مرفوعہ کا مجموعہ ہے جنہیں امام شافعی اپنے شاگردوں کے سامنے سند کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے، کتاب الام اور مبسوط میں واقع ان احادیث بالاسناد کو امام ربیع سے سن کر ان کے شاگرد ابوالعباس اصم نے یکجا کر دیا، ان احادیث میں سوائے چار حدیثوں کے جو امام بویطی سے مروی ہیں بقیہ کل احادیث کے راوی امام ربیع ہیں[5]۔

---

1 تاریخ التشریع الاسلامی: محمد خضری ص ۳۲۶ 2 معجم المصنفین ص ۳۰۴ 3 کشف الظنون ج ۲، ص ۱۶۸۳ 4 معجم المصنفین ص ۳۰۵

5 بستان المحدثین: شاہ عبدالعزیز دہلوی ص ۳۰۔

اب یہ مسند مصر سے شائع شدہ کتاب الام کی چھٹی جلد کے حاشیہ پر زیورِ طبع سے آراستہ ہوگئی ہے[1]، اس کے طابع احمد بک حسینی نے لکھا ہے کہ شام کے ایک قدیم نسخہ کے مطابق اس کتاب کی اشاعت ہوئی، یہ مخطوطہ ائمہ محدثین کی سماعات و اسانید سے بھی مزین ہے، سب سے آخری سماعت حدیث کا سال ۶۸۰ھ درج ہے[2]۔

اس مطبوعہ مسند کی فہرست دیکھ کر شاہ عبدالعزیز دہلوی کی راے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ یہ کوئی مرتب مسند نہیں ہے[3]، مثلاً کتاب الطلاق کے معاً بعد کتاب العتق اور پھر کتاب جراح العمد ہے، کتاب الجزیہ کے بعد کتاب اختلاف مالک والشافعی ہے، کتاب الاشربہ اور فضائل قریش کا باب ساتھ ساتھ ہے، کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب الحج اور کتاب الکسوف مکرر ہیں[4]، کتاب الام کی ساتویں جلد کے حاشیہ پر امام ربیع سے مروی ایک کتاب اختلاف الحدیث بھی موجود ہے۔

امام ربیع اپنی روایت میں اس درجہ ثقہ سمجھے جاتے ہیں کہ اگر کسی روایت کے بارہ میں ان کے اور امام مزنی کے درمیان اختلاف ہوتا ہے تو امام مزنی کی جلالت شان، اصول فقہ سے زیادہ موافقت اور درایت و قیاس سے قربت کے باوجود اصحاب شافعی امام ربیع ہی کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں[5]، علامہ سبکی نے مکاتب کے ایک مسئلہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس میں گو درایت کے لحاظ سے امام مزنی کا قول اصح ہے لیکن ابن سریج کے قول کے مطابق صحیح صورت وہی ہے جو امام ربیع سے منقول ہے، امام الحرمین نے ابن سریج کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ابن سریج نے امام ربیع کی روایت کو تفقہ کے اعتبار سے درست نہیں سمجھا بلکہ روایۃً اسے

---

[1] کتاب الام، مطبوعہ مطبعہ امیریہ ۱۳۲۲ھ [2] مسند شافعی برحاشیہ کتاب الام ج ۶، ص ۲۸۰

[3] بستان المحدثین ص ۳۰ [4] مسند شافعی مذکور ص ، [5] طبقات : سبکی ج ۱، ص ۲۵۹۔

دمعتبر و ار دیا ہے[1]

خود امام مزنی کا یہ حال تھا کہ اگر کبھی امام شافعی کی مجلس میں وہ شریک نہ ہو سکتے تو فوت شدہ مسائل کو حل کرنے میں امام ربیع کی کتاب سے ہی مدد لیتے[2]

امام بویطی جو تقویٰ و تفقہ دونوں میں سب سے نمایاں ہیں فرماتے ہیں کہ الربیع اثبت منی فی الشافعی (ربیع امام شافعی سے روایت کرنے کے بارہ میں مجھ سے زیادہ قابل اعتماد ہیں)[3] امام الائمہ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں امام ربیع سے حدیث کی تخریج کی[4]

امام بیہقی نے حاکم سے انھوں نے اصم سے اور اصم نے ربیع سے امام شافعی کی ایک روایت کو نقل کیا، اس سلسلۂ سند کو بیان کرنے کے بعد علامہ سبکی لکھتے ہیں کہ یہ ایسا سلسلۂ سند ہے کہ اگر کسی مجنون دیوانہ پر پڑھ کر دم کیا جائے تو وہ اچھا ہو جائے[5]

---

[1] طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۵۹ [2] ابن حجر عسقلانی ج ۳ ص ۲۴۶ [3] ایضاً [4] ایضاً

[5] طبقات کبریٰ ص ۲۴۰۔

صاحب المثنوی

یہ فارسی زبان کے مشہور صوفی و عارف مثنوی نگار اور فارسی کی سب سے مشہور صوفیانہ مثنوی کے مصنف مولانا جلال الدین رومی کی بہت ہی مفصل سوانح عمری ہے حضرت تبریزی کی ملاقات کے بعد ان میں جو غیر معمولی روحانی تغیرات پیدا ہوئے اور ان کے فراق میں دیوانگی کی جو کیفیت ان پر طاری ہوئی اس کو اور ان کی زندگی کے اور بہت سے واقعات کو بہت ہی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے مولانا شبلی کی سوانح مولانا روم کے بعد جس میں انھوں نے ان کو ایک متکلم کی حیثیت سے پیش کیا ہے مولانا ئے روم کے حالات میں بہت ہی مستند کتاب، از قاضی تلمذ حسین صاحب۔ قیمت ۲۱ روپے۔

مکتوب مکہ

از۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی پروفیسر ملک عبدالعزیز یونیورسٹی،

بنام سید صباح الدین عبدالرحمن

محترم و معظم سید صاحب زید مجدہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزشتہ ماہ دارالعلوم کے مہمان خانہ میں کئی دن مجھے جناب سے قریب رہنے کا موقع ملا، اس سے پہلے بھی نیاز کا شرف حاصل رہا، مگر مختصر لمحات کے لیے، الحمدللہ اس مرتبہ بہت کچھ تشنگی دور ہوئی اور بڑھی بھی، اللہ تعالےٰ آپ کو تادیر بسلامت باکرامت رکھے، استاد محترم مولانا عبدالسلام قدوائی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے جو زخم کاری لگا ہے، وہ بیان سے باہر، آپ کا وجود اب ہم لوگوں کے لئے مرہم ہے، خدا کرے آپ کے ہاتھوں کچھ اچھے نوجوان تربیت پاجائیں، اور دارالمصنفین کو اس کی روایت اور علمی مرتبہ کے مطابق چلاسکیں، ہم دور افتادہ تہی سوائے دعا و تمنا کے کچھ بھی اپنے بس میں نہیں پاتے۔

آپ نے مجھ پر بڑا کرم فرمایا، کہ "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" میرے لیے فراہم کرادی، یہ کتاب میرے لیے بہترین زادِ سفر ثابت ہوئی، سفر کی منزلیں آپ کی معیت میں بہت خوشگوار طریقہ پر گزریں، معاصر عرب ادبا جب کسی کتاب کے مطالعہ اور اس سے مستفید ہونے کا ذ

کرتے ہیں تو کہا کرتے ہیں، عشت مع کتاب... (کتاب کا نام) یعنی میں اس کتاب کی معیت میں جیتا رہا، یہ لفظی ترجمہ ہوا، مطلب یہ ہے کہ ایک زندہ شخصیت کی جس طرح معیت ہوتی ہے، اسی طرح یہ کتاب ایک رفیق رہی۔ میرا حال بھی یہی ہے کہ "غالب مدح وقدح کی روشنی میں" میرے ساتھ اس طرح تھی جیسے خود مصنف کی صحبت نصیب رہی ہو۔

اس عریضہ میں جب کہ آپ سے مخاطب ہوں، کتاب کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتا ہوں کسی کے منھ پر اس کی تعریف بھلی نہیں معلوم ہوتی، لیکن اظہار شکر واعتراف میں بھی کوئی بات مانع نہیں ہے، میرا واقعی تاثر یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد غالب پر مزید کچھ پڑھنا وقت کے ساتھ ناانصافی ہے، عربی نحو میں سیبویہ کی کتاب کے بارے میں ابو عثمان المانی کا مشہور فقرہ یاد آتا ہے "من اراد أن یعمل کتابا کبیرا فی النحو بعد سیبویہ فلیستح" یعنی اگر کوئی شخص سیبویہ کی کتاب النحو کے بعد اس فن میں کسی بڑی تصنیف کا ارادہ کرے تو اس کو شرم آنی چاہئے"۔ غالب کے موضوع پر اگر کوئی لکھنا چاہے تو اس کتاب (مدح وقدح کی روشنی میں) کے بعد اس کو شرم محسوس کرنا چاہئے'

میں نہیں جانتا کہ اس کتاب سے کس نے کس درجہ فائدہ اٹھایا، میں کوئی ناقد نہیں ہوں، ہاں اپنی بات عرض کر سکتا ہوں کہ مجھے کیا فائدے ہوئے،

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کتاب سے پہلی بار معلوم ہوا کہ غالب پر اب تک کیا کچھ لکھا جا چکا ہے، ضخیم تذکروں سے لیکر علمی رسائل کے مقالات تک بلکہ سیمنار میں پڑھے جانے والے مقالات تک کا اجمالی جائزہ موجود ہے، حالی اور نواب امداد امام اثر سے لیکر معاصر اہل قلم اور محققین کے افکار وخیالات سب یکجا مل جاتے ہیں،

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ غالب کے مادح وقادح دونوں سامنے آگئے اور اس کتاب کی

بدولت ان کے علمی و تحقیقی مراتب سے واقفیت ہوئی، ضمناً ان کے حالات زندگی، خاص کارنامے اور سنین وفات و تاریخ تصنیف سب سے واقفیت ہوگئی، بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ تاریخ کے ملبوں کے نیچے دب گئے ہیں، بہت ہی خاص الخاص اہل علم ان سے واقف ہیں، کتنے ہیں جنھوں نے آب حیات، گل رعنا اور شعر الہند کے علاوہ کاشف الحقائق اور گلشن بے خار کا بھی مطالعہ کیا ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ آپ نے ناظرین کو دوسروں کے نقطۂ نظر سے آگاہ کر دیا اور خود بہت کامیابی کے ساتھ غیر جانب دار رہے، تائید نہ تو مادحین کی ہوئی، اور نہ قادحین کی، البتہ مادحین و قادحین کے بیان میں جو تضاد ہے، اس کو ظاہر کر دیا۔

بہر نوع تحقیق و ترتیب کے لحاظ سے یہ کتاب دارالمصنفین کی روایات کے صرف مطابق ہی نہیں بلکہ ایک قابل قدر اضافہ ہے، یادگار غالب نے اگر غالب کو حقیقی معنوں میں روشناس کرایا تھا، تو آپ کی اس کتاب نے غالب کی عمر بڑھادی، اللہ! آپ کی عمر جسدی و معنوی کو بڑھائے۔

یادگار غالب کا نام آگیا تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی نوعمری میں یہ کتاب پڑھی تھی مگر اس کے نقوش حافظہ میں قائم ہیں، اس سلسلہ میں ایک طالب العلمانہ اعتراض پیش کرتا ہوں، حالی نے لکھا ہے کہ غالب کو حافظ کے اس شعر پر اعتراض تھا۔

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

غالب کہتے تھے کہ پہلے مصرعہ میں جس ہونا کی کا بیان ہے وہ دوسرے مصرعہ میں ختم ہو جاتا ہے ضرورت تھی کہ اس بے بسی اور بیچارگی کے مفہوم کو دوسرے مصرعہ میں بھی پھیلا دیا جاتا۔ (الفاظ یاد نہیں ہیں، مفہوم یہی ہے) چنانچہ غالب نے عرفی کی زمین میں جو غزل کہی ہے

ع عصا خفتہ است ، جفا خفتہ است ، اس میں ایک شعر حافظ ہی کے مفہوم کو وسیع کرکے کہا ہے۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است

میرا طالب علمانہ ذہن غالبؔ کے اس شعر کی خوبی کو سمجھنے سے قاصر ہے، باوجود مولانا حالیؔ کی وکالت کے جن کے علمی درجہ اور اصلاحی خدمات کا معترف ہوں، سوال یہ ہے کہ جب اس درجہ ہولناک صورت حال ہو اس وقت "ناخدا" کو نیند کیونکر آسکتی ہے، یہ وقت تو وہ ہے، کہ اور چوکنا ہو اور اپنی آخری تدبیر کشتی کو بچانے کی کر ڈالے، نہ کہ پڑا سوتا رہے۔ـــــ یہ اور بات ہے کہ وہ غالبؔ کے ساتھ اولڈ ٹائم یا کاسن ٹین کی بوتلیں چڑھا کر نشہ میں مردہ کے مانند پڑا ہو۔ مگر اس صورت میں خفتہ است کے بجاے مردہ است ہونا چاہئے تھا۔ کبھی ملاقات ہوگی تو اس موضوع پر آپ کی رائے معلوم کرونگا، جو میرے لیے سند ہوگی، یوں اتنی اہم بات نہیں ہے کہ آپ اس کے جواب کے لیے اپنا وقت ضائع فرمائیں۔

زیادہ تحیات و احترام

نیازمند

عبداللہ عباس ندوی

۲۷ ستمبر ۱۹۷۹ء

باب التقریظ والانتقاد

اردو رسالوں کے خاص نمبر

جامعہ مولانا محمد علی نمبر:۔ مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی و عبداللطیف اعظمی، بڑی تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۱۶، قیمت ۸ روپے، پتہ: ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے صد سالہ یوم ولادت کے موقع پر اردو کے کئی رسالوں نے اپنے خاص نمبر شائع کرکے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، مولانا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی تھے، اس لئے اس کے ترجمان ماہنامہ جامعہ نے بھی ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر شائع کیا ہے، جو اس کی روایتی شان کے مطابق اچھے اور بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے، گو چند مضامین پرانے ہیں مگر اہمیت اور فائدے کی بنا پر ان کو بھی شامل کیا گیا ہے، پہلے مضمون کی حیثیت مولانا کے خود نوشت حالات کی ہے، اس کا اردو ترجمہ بہت پہلے پروفیسر محمد سرور نے کیا تھا، جناب عبداللطیف اعظمی نے اس کی تلخیص کی ہے اور اس پر مفید حواشی بھی تحریر کئے ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم اور جناب معین الدین حارث نے مولانا محمد علی کے بارہ میں اپنے اپنے تاثرات مؤثر اور دلکش انداز میں قلمبند کئے ہیں، جناب عتیق صدیقی نے تذکرۂ کاملان رامپور کی مدد سے مولانا کے خاندانی حالات پر روشنی ڈالی ہے، چند مضامین میں مولانا کی قومی و سیاسی زندگی، تحریک خلافت اور بعض معاصرین سے ان کے تعلقات وغیرہ کا ذکر ہے، ان کے اردو اور انگریزی اخباروں پر بھی ایک ایک مضمون درج ہے، جناب عبداللطیف اعظمی نے مولانا کے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تعلق و وابستگی کی روداد بیان کی ہے، فاضل مرتب کا مضمون اور خصوصاً ان کا اداریہ قابل توجہ ہے، افتتاحیہ میں ان اہم امور کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی جانب مولانا کے سوانح نگاروں

ابھی تک دھیان نہیں دیا ہے' تعارف و تبصرہ کے کالم میں مولانا پر حال میں شائع ہونے والی مطبوعات اور خاص نمبروں کا ذکر ہے، شعراء کا منظوم خراجِ عقیدت بھی اثر انگیز ہے، مولانا محمد علی کی کئی تصویروں کے علاوہ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک غزل' ان کے انگریزی اخبار کامریڈ اور اردو اخبار ہمدرد کے سرورق کا عکسی فوٹو بھی دیا گیا ہے' اس نمبر کے اکثر مضامین ان ہی لوگوں کے قلم سے ہیں جن کو مولانا سے براہ راست واقفیت یا عقیدت تھی، مگر پروفیسر محمد مجیب کا مضمون دوسری نوعیت کا ہے، درحقیقت مولانا محمد علی کی ذات و شخصیت میں متضاد اوصاف و خصوصیات جمع ہو گئے تھے اور ان میں غیر معمولی ذہانت اور شدید ذکاوتِ حس بھی تھی' اس کو مدنظر رکھا جائے تو ان کے متعلق رائے قائم کرنے میں اعتدال برقرار رہ سکتا ہے، اب تک مولانا پر جو نمبر شائع ہوئے ہیں' ان میں یہ زیادہ ممتاز ہے' اس سے ان کی مذہبیت' بے چین زندگی' بیقرار طبیعت' پُرعظمت شخصیت اور کمالات کی تصویر بڑی حد تک سامنے آجاتی ہے۔

تحریک سلور جبلی نمبر:۔ مرتبہ جناب گوپال متل' محمود سعیدی' پریم گوپال متل صاحبان' بڑی تقطیع کاغذ' کتابت و طباعت عمدہ' صفحات ۲۲۴ قیمت ۲۵ روپے پتہ: ماہنامہ تحریک انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی

ماہنامہ تحریک اردو زبان کا مشہور و مقبول ادبی رسالہ ہے' اس کے خاص نمبر اہتمام سے شائع ہوتے رہتے ہیں' ۱۹۸۱ء میں تحریک کی اشاعت کو پچیس ۲۵ برس ہو گئے تھے' اس مناسبت سے یہ نمبر شائع کیا گیا ہے' اصلاً اس کے دو حصے ہیں' پہلے میں بڑا حصہ طبعزاد مضامین' افسانوں اور منظومات کا ہے' اس حصہ میں انگریزی سے کئے گئے دو ۲ ترجمے بھی دئے گئے ہیں' ایک میں موجودہ سیاسی اصطلاحوں کا تعارف اور ان کی مختصر تشریح ہے' اس خاص نمبر کی ابتداء ادبی' تحقیقی اور تنقیدی مضامین سے کی گئی ہے' قاضی عبدالودود' امتیاز علی عرشی' مالک رام' کالیداس گپتا رضا' رشید حسن خاں' مشفق خواجہ اور محمد مشتاق شارق کے مضامین ادبی و تحقیقی حیثیت سے اہم اور دلچسپ ہیں' شمس الرحمان فاروقی نے موجودہ ادبی تنقید کا اور ڈاکٹر مغنی تبسم نے گذشتہ پچیس ۲۵ برس کی اردو تنقید کا مبسوط جائزہ لیا ہے' دوسرے مضامین میں اردو کے جدید افسانے اور غزل کا جائزہ لیا گیا ہے' کمیونزم کا رد تحریک کا خاص مشن ہے' فاضل عرب' محمد

ستیہ پرکاش کے مضامین اسی نوعیت کے ہیں، اس نمبر کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ ہندوستانی ادیبوں کی طرح یہ متعدد پاکستانی اہل قلم کی نگارشات سے بھی مزین ہے، اور اس کا ایک حصہ پاکستان کے بعض اصناف ادب کے جائزے کے لئے مخصوص ہے۔ ان سنجیدہ ادبی مضامین کے علاوہ افسانے، ڈرامے اور نظموں و غزلوں کا طویل حصہ بھی جاندار ہے، پہلے حصہ میں جناب عرشی زادہ نے مولانا شبلی کے فارسی مجموعۂ کلام دستۂ گل، بوئے گل اور برگ گل کی متعدد منتخب غزلوں کا کامیاب اردو ترجمہ کیا ہے، جناب گوپال متل نے خاص انداز سے اس کا مختصر تعارف لکھا ہے، ان غزلوں کے ترجمے کی اشاعت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ "شبلی کی علمی اور دینی حیثیت کی طرح ان کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت بھی مسلمات کا درجہ رکھتی ہے" دوسرا حصہ بھی مضامین نظم و نثر کا رنگا رنگ مجموعہ ہے، اس میں ملک کی موجودہ سرکاری زبان ہندی کے علاوہ کئی علاقائی زبانوں پنجابی، کشمیری، اڑیہ، تامل، تلگو، مراٹھی، کنڑا، گجراتی اور راجستھانی کے موجودہ ادبی سرمایہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان زبانوں کی نظموں اور افسانوں کے اردو ترجمے بھی دئے گئے ہیں، اس طرح اس نمبر سے اردو زبان و ادب ہی کی طرح ملک کی اکثر مشہور زبانوں کی موجودہ ادبی رفتار اور ہندوستان و پاکستان دونوں کی آزادی کے بعد کی ادبی سرگرمیوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے، اور نئے ادبی مسائل و رجحانات سے واقفیت ہوتی ہے اور اردو کے متعارف و غیر متعارف ادیبوں کی کدوکاوش کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ نمبر بہت ضخیم ہے، ظاہر ہے کہ سب مضامین یکساں نوعیت کے نہیں ہیں، خصوصاً جب کہ اکثر لکھنے والے نئے ہوں تو تحریر، طرز نگارش اور خیالات میں ناہمواری بھی ہوگی، مگر موجودہ حالات میں ایسے ضخیم نمبر کی اس قدر سلیقہ اور ڈھنگ سے اشاعت ہی ایک بڑا کام ہے جو گوپال متل صاحب جیسے معمر مگر جواں ہمت اردو کے خدمت گذار ہی انجام دے سکتے ہیں، مضامین کے تنوع کی وجہ سے ہر مذاق کے لوگ اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، شروع میں تقریباً ڈیڑھ سو ادیبوں اور شاعروں کے فوٹو بھی

دئے گئے ہیں جن کی نگارشات اس نمبر میں درج ہیں۔

الرشید مدنی واقبال نمبر:- مرتبہ جناب چوہدری عبدالرشید ارشد صاحب وغیرہ بڑی تقطیع کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر صفحات ۲۰۴، قیمت عنک رپتہ: ناظم جامعہ رشیدیہ ساہیوال (پاکستان)

الرشید جامعہ رشیدیہ ساہیوال کا ایک دینی وتبلیغی رسالہ ہے، اس کا بڑا مقصد دیوبندی فکر ومسلک کی ترجمانی واشاعت اور اکابر دیوبند کی حمایت ومدافعت ہے، اس سے قبل اس کا دارالعلوم دیوبند نمبر شائع ہو تھا، یہ مدنی واقبال نمبر ہے جو اکثر مطبوعہ تحریروں اور مضامین پر مشتمل ہے شروع میں مولانا حسین احمد اور ان کے استاذ شیخ الہند پر سیر حاصل مضامین ہیں، دوسرے مضامین میں مولانا مدنی کے "متحدہ قومیت" کے نظریہ کو صحیح ثابت کرکے اس پر اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اس ضمن میں ڈاکٹر اقبال کے اعتراضات کا خاص طور پر ذکر ہے اور ارمغان حجاز کے اشعار کے بارہ میں یہ وضاحت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان سے رجوع کرلیا تھا، بعض مضامین میں اقبال پر نار واطنز وتعریض بھی ہے یہ مضامین جب شائع ہوئے تھے، اسی زمانہ میں ان پر اعتراضات کئے گئے تھے اور اب بھی یہ قابل بحث ہیں آخر میں ڈاکٹر صاحب پر چند مستقل مضامین ہیں، "اقبال اور عصری نظام تعلیم" کے عنوان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بھی ایک مضمون نقل کیا گیا ہے، دوسرے مضامین میں اقبال کی اسلام پسندی علماء کی قدردانی، وہابی تحریک سے دلچسپی، انکار حدیث اور قادیانیت وغیرہ سے برأت کا ذکر اس غرض سے کیا گیا ہے کہ ان طبقوں کے لوگوں پر واضح ہو جائے کہ اقبال ان کے ہمنوا نہ تھے، مولانا حسین احمد اور اقبال سے متعلق مضامین کی اشاعت کا مقصد اس طعن وتشنیع کا جواب ہے جس کا ہدف پاکستان میں بزرگان دیوبند خصوصاً مولانا مدنی کی ذات کو بنایا گیا ہے، مرتب کے خیال میں یہ دراصل اقبال کے وہ پرانے مکفرین ہیں جو تقسیم سے پہلے انگریزوں کا آلۂ کار تھے اور تقسیم کے بعد پاکستان میں مسلم لیگ کی شکست وریخت کا سامان بنے، اس نمبر کے تقریباً سبھی مضامین پرانے ہیں تاہم اس نمبر میں یہ منتشر ذخیرہ یکجا اور محفوظ ہو گیا۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

مستند موضح القرآن:۔ مصححہ مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، مجلد قیمت آٹھ روپیے، ناشر رحمت عالم، ابشیخ چاند اسٹریٹ لال کنواں، دہلی ۶۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی نے محاسن موضح القرآن، اور موضح قرآن کی کتابتی غلطیوں پر تبصرہ، کے نام سے دو کتابیں پہلے شائع کی تھیں، معارف میں ان کے تبصرہ کے ضمن میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ وہ حضرت شاہ عبد القادر دہلوی کے اردو ترجمہ قرآن و فوائد کا ایک صحیح ایڈیشن بھی مرتب کر چکے ہیں، اب انھوں نے اس کی یہ پہلی قسط شائع کی ہے، اس میں آخری دو پارے انتیس ۲۹ اور تیس ۳۰ کے ترجمے اور تفسیری فوائد شامل ہیں، ابھی تک اردو میں قرآن مجید کے کسی ترجمہ کو حضرت شاہ عبد القادرؒ کے ترجمہ جیسی شہرت و مقبولیت نصیب نہیں ہوئی، لیکن یہ تقریباً دو سو برس پہلے کا ہے اور اب اردو کا اسلوب بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے، بعض الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو چکی ہیں، علاوہ ازیں ناشروں کی بے پروائی سے اس میں برابر غلطیاں بھی راہ پاتی رہی ہیں، اس لئے مولانا اخلاق حسین کو شاہ صاحب کے ترجمہ و فوائد کا ایک صحیح ایڈیشن مرتب کر کے شائع کرنے کا خیال ہوا، اس مبارک ارادہ کی تکمیل میں اہل خیر کو ان کا تعاون کرنا چاہئے، ان کو قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کے کام سے دلچسپی بھی ہے اور وہ اردو زبان کے نوک پلک سے بھی واقف ہیں، اس لئے انھوں نے سلیقہ اور حسن مذاق سے یہ ایڈیشن شائع کیا ہے، شروع میں موضح قرآن کے قدیم، متروک اور مشکل الفاظ کی تشریح اور ان غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے جو ناشروں کی ترمیم و تصرف یا غفلت کا نتیجہ ہیں، اگر اس قسط میں

مکمل قرآن کے بجائے صرف آخری دو پاروں ہی کے مشکل و متروک الفاظ اور اغلاط کا ذکر ہوتا تو قارئین کو الجھن نہ ہوتی، مشہور پیغمبروں کی فہرست میں ہابیل، قابیل، طالوت، جالوت اور حضرت مریم وغیرہ کا نام کس طرح دیا گیا ہے، مصنف کا یہ دعویٰ خلافِ واقعہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس ترجمہ کی تصحیح و تشریح کی سعادت ان کو نصیب ہو رہی ہے، کیونکہ ان سے پہلے بھی بعض اہل علم کے حصہ میں یہ سعادت آچکی ہے، خود شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا ترجمۂ قرآن دراصل شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ ہی کی تسہیل و تجدید ہے، شاہ صاحب کے ترجمہ کا ایک اور صحیح ایڈیشن ادارۂ علوم شرعیہ کراچی نے بھی شائع کیا ہے، اس پر مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا مقدمہ بھی ہے، ان کا خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ اردو کا سب سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے، اُن سے پہلے بھی کلام مجید کے بعض اردو ترجمے ہو چکے تھے۔

سرگذشت حیات:۔ مترجمہ جناب شیخ نذیر حسین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت ٹائپ، صفحات ۳۱۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت بیس روپیے۔

پتہ: مجلس ترقی ادب، لاہور (پاکستان)

ڈاکٹر احمد امین زمانۂ حال کے مشہور فاضل تھے، ان کی تصنیفات میں فجر الاسلام، ضحی الاسلام، اور ظہر الاسلام کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی، وہ مصر کے ایک معمولی گھرانے کے فرد تھے، مگر اپنی محنت، مطالعہ اور شوق کی بدولت غیر معمولی ترقی کی اور بڑا علمی اعزاز حاصل کیا، انھوں نے 'حیاتی' کے نام سے اپنے خود نوشت حالات لکھے تھے، یہ کتاب اس کا اردو ترجمہ ہے، اس میں ان کے بچپن سے بڑھاپے تک کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز کا ذکر ہے، شروع میں اپنے خاندان، والدین، ماحول اور محلے وغیرہ کا حال تحریر کیا ہے، ان کو ترکی، شام، فلسطین، عراق اور یورپ جانے کا اتفاق بھی ہوا تھا، اس میں ان ملکوں کا سفرنامہ بھی آگیا ہے، مصنف کی جن مکاتب و مدارس میں

تعلیم ہوئی اور جہاں انھوں نے درس و تدریس کی خدمت انجام دی، ان سب کے تعلیمی و انتظامی حالات بیان کرکے ان کی خوبیاں اور خامیاں واضح کی ہیں، اس ضمن میں جامعہ ازہر کے طریقۂ تعلیم کے نقائص کا ذکر بھی ہے، ان کا بڑا کارنامہ جامعہ شعبیہ (عوامی یونیورسٹی) کا قیام ہے، اس کے علاوہ بعض تصنیفی اداروں سے بھی وہ وابستہ رہے، ان سب کے متعلق بھی اس میں معلومات فراہم کئے ہیں، مصنف اصلاً علمی آدمی تھے، ان کی پوری زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گذری، اس لئے یہ کتاب ان کی خاموش مگر علم و تعلیم کے لئے وقف زندگی کی مکمل داستان ہے جو طالب علموں کے لئے بہت سبق آموز ہے، اس کتاب سے مصر کے علمی و تعلیمی حالات کے علاوہ وہاں کے ذہنی و فکری رجحانات، معاشرت اور اس دور میں مصر کے اندر مشرق و مغرب کی کشمکش کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی کے نام اور کارناموں سے معارف کے ناظرین بخوبی واقف ہیں، انھوں نے ایسا سلیس، شگفتہ اور رواں ترجمہ کیا ہے کہ یہ سرے سے ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا، اس کی اشاعت سے اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا، اس کے لئے مترجم اہل ذوق کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

معاصرین: مرتبہ جناب حکیم عبدالقوی دریابادی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۳۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت بیس روپے، پتہ ادارۂ انشائے ماجدی، ۱۴۷ رابندر سرانی کلکتہ

یہ کتاب مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے جادو نگار قلم کی یادگار ہے، اس میں ان کے اتنی معاصرین کا سوانحی خاکہ درج ہے، مولانا کے وسیع حلقۂ تعارف میں ہر طبقۂ خیال و مسلک اور مختلف مذہب و ملت کے افراد شامل تھے، اس لئے زیر نظر کتاب متنوع اور رنگارنگ شخصیتوں کا ایسا آئینہ ہے جس میں مذہبی، علمی، تعلیمی، ادبی، قومی اور سیاسی ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اصحاب کمال کے جلوے نظر آتے ہیں، اس کے تین حصے ہیں، پہلے میں ایسے اشخاص کی سیرت و شخصیت کے خط و خال

نمایاں کیے گئے ہیں جو مولانا سے عمر میں بڑے تھے، دوسرے حصہ میں برابر والوں کا ذکر ہے اور آخری حصہ میں مولانا نے ایسے اشخاص کی خصوصیات و کمالات بیان کئے ہیں جو ان سے سن و سال میں چھوٹے تھے، ناموں کی فہرست طویل ہے، اس میں علماء و مشایخ، شعراء و ادباء، صحافت و تعلیم کے ماہرین اور قومی، ملی اور سیاسی رہنما سب ہی شامل ہیں، مسلمانوں کی طرح ہندوؤں اور انگریزوں کا سوانحی خاکہ بھی دیا گیا ہے تو یہ سب ایسے منتخب و ممتاز لوگ تھے جن سے مولانا کے تعلقات تھے، اور وہ ان کی شخصیتوں سے کسی حد تک متاثر بھی تھے، گو یہ خاکے مختصر اور سرسری ہیں، مگر مولانا کے پُرنور اور دلکش قلم نے ان میں ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ ہر صاحب تذکرہ کا سراپا نظر کے سامنے آگیا اور ان کے احساس و مشاہدہ کی قوت و گہرائی نے ہر شخص کی سیرت کا اصل جوہر کھینچ دیا ہے، مولانا کی ہر تحریر کی طرح یہ کتاب بھی ان کے منفرد اسلوب نگارش، اچھوتے انداز بیان اور ادب و انشا کی لطافت و رعنائی سے معمور ہے، آیندہ جو لوگ ان شخصیتوں پر کام کریں گے ان کو اس سے بڑی مدد ملے گی، بلکہ آیندہ جو کچھ لکھا جائے گا وہ مولانا کے اجمال کی تفصیل ہوگی، مگر کئی حضرات کا نام قلم انداز ہوگیا ہے، یہاں تک کہ بڑوں میں مولانا حسین احمد مدنی اور خوردوں میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا ذکر بھی رہ گیا، حالانکہ اول الذکر سے مولانا بیعت تھے اور موخر الذکر دونوں حضرات مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اور مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے بعد دارالمصنفین کے روح رواں ہوگئے تھے، جن سے مولانا کا مدۃ العمر تعلق رہا۔

تلسی داس اور رام چرت مانس:۔ مرتبہ ڈاکٹر صفدر آہ صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۹۰، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت ۱۵ روپیے، پتہ: مہاتما گاندھی میموریل، ریسرچ سینٹر اور لائبریری ایم۔ جی۔ ایم بلڈنگ نیتاجی سبھاش روڈ بمبئی۔

ہندوستان کی قدیم زبانوں اودھی اور برج بھاشا وغیرہ کے نامور شاعر تلسی داس کی شخصیت اور شاعری کے بارہ میں اردو میں کم لکھا گیا ہے، اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں بھی مبالغہ اور افسانہ زیادہ ہے اس کی تلافی کے لئے ڈاکٹر صفدر آہ نے یہ کتاب لکھی ہے، اس کے پہلے حصہ میں تلسی داس کے حالات وکمالات بیان کئے گئے ہیں، اور دوسرے میں ان کے لازوال ادبی کارنامہ "رام چرت مانس" پر مبسوط تبصرہ ہے، پہلے حصہ میں تلسی کے سنہ ولادت، ان کے بیراگ اور تصویر وغیرہ کے بارے میں محنت سے معلومات جمع کئے گئے ہیں، آخر میں رام چرت مانس کا مفصل تعارف ہے، اس میں اس کی زبان، اسلوب بیان، قصہ، روایات، ماخذ، پلاٹ، کردار اور فنی خصوصیات کو ظاہر کرکے اس کے ادبی درجہ کا تعین کیا ہے، مصنف نے رام چرت کی خوبیاں اور خامیاں دونوں دکھائی ہیں، اور تلسی کے کلام کا سور اور جائسی وغیرہ کے کلام سے موازنہ بھی کیا ہے، ابھی تک اردو میں اس موضوع پر کوئی اچھی کتاب نہ تھی، اس حیثیت سے مصنف قابل مبارکباد ہیں، لیکن ان کے بعض خیالات سخت قابل اعتراض ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں: "مشرق وسطیٰ میں اسلام پھیلا تو بڑی سرعت سے۔ لیکن بعد میں یہ مذہب سے زیادہ اقتدار پرستی اور روحانیت سے زیادہ ملک گیری کا جنون بن گیا، کسی ملک پر حملہ کرکے اسے اپنا مطیع بنانا، خواہ خدا کے نام پر ہو یا مذہب کے نام پر، ایک وحشیانہ فعل ہے، جس کی اجازت تہذیب کسی طرح نہیں دے سکتی ...... (ہندوستان پر) ابتدا میں جن افغانی حملوں کا سلسلہ شروع ہوا وہ کم و بیش عسکری قزاقی تھی"۔ آگے اورنگ زیب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ان کے الجھے ذہن کا پتہ چلتا ہے، مصنف رائے قائم کرنے اور دوسروں کی تردید کرنے میں غور و فکر کے بجائے عجلت سے کام لیتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کا انداز غیر ذمہ دارانہ ہو گیا ہے، کتاب میں زبان و بیان کی بکثرت خامیاں بھی ہیں، جیسے " پھر انتزاع وقت کے ساتھ واقعات اس طرح مسخ ہوئے ہیں (ص ۵) اس افراطی نظریئے کی تائید

.... (ص ۹) قبل اس کے کہ ہم اس دشوار تجسس کو شروع کریں (ص ۱۳) اس خرافات مواد کا اگر .... (ص ۵۴) چونکہ تلسی اوتاری انسان .... (ص ۵۵) پرانے شعرا میں شاذ ہی ایسے مجموعے ہوں گے (ص ۳۷) وہ بچپن ہی سے ایک سنیاسی گرو کے زیر سایہ پرورش ہوئے (ص ۵۸) شہر ہندی کے نامور مصنف ہیں، ان کا عہد وقوع آج سے ۵، سال قبل سمجھنا چاہئے (ص ۹۲) ایسی مثالوں کو زہر میں ڈوب دے کر اچھالنا ادیب کا کام نہیں ہے (ص ۱۱۵) ان محاسن پر سارا ہندوستان گرویدہ رہا (ص ۲۸۲) بمندرجۂ ذیل جملوں میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر کا خیال نہیں کیا گیا ہے: "ایک تقریباً دو سو سال پرانی کتاب" (ص ۴۴) تلسی کے عہد میں جو ہندو سماج کی تہذیب رائج تھی (ص ۱۱۲) ایک جگہ بچپن کو بھپن لکھا ہے۔ "تقریباً ساڑھے چار سو سال کے بہن پر پھیلے ہوئے مواد .... (ص ۵) جورت کو مذکر لکھا ہے۔

صحیفۂ زندگی: از مولانا عزیز الحق کوثر ندوی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۴۰ قیمت ۵ روپے، پتہ: مکتبہ سراجیہ ۸/۳۱ بجے پچی باغ، وارانسی۔

مولانا عزیز الحق کوثر ندوی کو درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کے علاوہ تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کا بھی اچھا ذوق ہے، ان کے قلم سے مختلف علمی و دینی موضوعات پر کئی مفید رسالے نکل چکے ہیں، "صحیفۂ زندگی" ان کے کلام کا مجموعہ ہے، اس میں دینی و اخلاقی تعلیمات اور تصوف و سلوک کے حقائق بیان کر کے روح کی بالیدگی کا سامان بہم پہونچایا ہے، اور قلب و ذہن کی صفائی، سیرت و کردار کی پاکیزگی اور معاشرہ کی اصلاح کا درس دیا ہے مگر خیالات و مضامین کی گرانباری سے نظم کی روانی، اشعار کی موزونی اور بندش کی چستی وغیرہ میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے اس اعتبار سے "صحیفۂ زندگی" اسم بامسمّیٰ ہے۔

"ض"

دارالمصنفین کی تین نئی کتابیں

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

دارالمصنفین کا سلسلۂ تاریخ ہند ۵ اکتابوں پر مشتمل ہے اسی کے تحت عہد بعہد کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کے کئی حصے ہوں گے، حصۂ اوّل میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، انسان دوستی، مردم پروری کی تفصیل مستند علمی و تاریخی ماخذ کے حوالہ سے پیش کی گئی ہے، اس کے بعد کے حصوں میں دوسرے مسلمان فرمانروا خاندانوں خصوصاً مغل فرمانرواؤں جن کا عہد حکومت سب سے طویل رہا ہے اُن کی مذہبی رواداری، انسان دوستی اور آدم نوازی کی تفصیل پیش کی جائے گی، قیمت ۔ہ/ (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن)

تبع تابعین حصۂ دوم

یہ سلسلہ تبع تابعین دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں امام ابو حنیفہ کے تین جلیل القدر تلامذہ کے علاوہ اور دوسرے مشہور تبع تابعین کے سوانح اور اُن کی علمی و دینی خدمات کی تفصیل ہے اور حصۂ دوم میں امام لیث، امام شافعی، امام حمیدی، قاضی شریک نخعی، امام کاظم، امام یحییٰ مصمودی، اور امام عبدالرزاق کے علاوہ اور دوسرے اہم صاحب تصنیف اور صاحب دعوت تبع تابعین کے حالات لکھے ہیں،

مرتبہ محمد نعیم صدیقی ندوی علیگ رفیق دارالمصنفین،

مرزا مظہر جانجاناں

(اور اُن کا اردو کلام)

مرزا مظہر جانجاناں اردو و فارسی کے ایک صاحب کمال صوفی شاعر ہیں، اس کتاب میں اُن ہی کے سوانح و حالات، اور اُن کا تمام اردو کلام پیش کیا گیا ہے، شروع میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین کے قلم سے پیش لفظ اور جناب سید شہاب الدین دسنوی کے قلم سے مصنف کے مختصر حالات ہیں،

مرتبہ عبدالرزاق قریشی اعظمی،

قیمت ۱/۔ ۔۔ ۱۲

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

عہدِ رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں احادیثِ نبوی کی نقل و روایت کا سلسلہ برابر جاری
یہ احادیث عرب و حجاز ہی میں نہیں پوری دنیائے اسلام میں بکھری پڑی ہوئی تھیں، محدثین کرام
پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ایسے زمانہ میں جب کہ آج کل کی طرح سفر کی سہولتیں تھیں نہ
اور نہ نشر و اشاعت کے اتنے وسیع ذرائع و وسائل موجود تھے، دنیائے اسلام کا ایک ایک چپہ چھان
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و ارشادات کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع
اُن کے مجموعے مرتب کیے، سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے مقدس سلسلوں کے مکمل ہونے
بعد حضرت سید صاحب علیہ الرحمۃ کو ان محدثین کرام کے حالات مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، امام بخار
پر ایک مضمون، اور صاحبِ موطا امام مالک کی سوانح عمری وہ لکھ بھی چکے تھے، یہ کام اُن کی وفات کے
یہاں کے رفیق مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد کیا گیا، جس کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، اور
حصے اور شائع ہوں گے، ان میں سے ایک حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات پر مشتمل ہوگا، ا
یہ حصہ زیرِ ترتیب بھی ہے،

حصہ اول میں امام مالک اور ائمۂ صحاح کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور ص
تصنیف محدثین کرام مثلاً عبد الرزاق، امام حمیدی، امام احمد بن حنبل، امام طحاوی وغیرہ کے حالات و سوانح
فنِ حدیث سے متعلق اُن کی شاندار خدمات کو مستند حوالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، حصہ دوم میں چوتھی صد
ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور صاحبِ تصنیف محدثین کرام کے حالا
و سوانح اور اُن کی حدیثی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے تیسرے حصہ میں آٹھویں صد
ہجری کے بقیہ اور اس کے بعد کے تمام قابلِ ذکر محدثین کے حالات ہوں گے، مرتبہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی

قیمت حصہ اول :- ۱۲-۵۰ — قیمت حصہ دوم :- ۱۳-۷۵ "منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ دسمبر ۱۹۷۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

جلد ۱۲۴ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۹ء عدد ۶

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

چودھویں صدی ہجری ختم اور پندرھویں صدی شروع ہونے کو ہے، ان چودہ سو برسوں میں اسلام تو اپنی [illegible] کے ساتھ قائم رہا لیکن مسلمانوں کی تاریخ اس مدت میں تابناک بھی رہی اور مذموم و شرمناک بھی بنی رہی جو پیچھے مڑ کر دیکھی جا سکتی ہے۔

عہد رسالت خدا ترسی، ایمان پروری، زبان، دل اور عمل کی سچائی، عہد کی پابندی، عدل پروری، خاکساری، خودداری، اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی سے جگمگا اٹھا تھا جن کی تقلید سے آج بھی انسانیت سنواری جا سکتی ہے، اس زمانہ میں مسلمان بدر اور دوسرے غزوات میں ایمان کی جس قوت اور حرارت سے لڑے اس سے ان کو ہر طرح کی سربلندی حاصل ہوئی مگر اسی عہد میں ان کو احد اور حنین کی لڑائیوں سے یہ درس ملا کہ ان کی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے ان کے رسول ﷺ کو بھی مشکلوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

خلافت راشدہ کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے جو مثالی حکومت قائم کی یا اس پورے دور میں اتباع شریعت، نظام عدل، بیت المال کے صحیح استعمال، مجلس شوریٰ کی اہمیت، رائے کی آزادی، انسانی حقوق کے احترام، عوام کی فلاح و بہبود اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جو مثالیں پیش کی گئیں ان میں وہ ساری باتیں موجود ہیں جن کو بنیاد بنا کر اچھی سے اچھی فلاحی حکومت قائم کی جا سکتی ہے، اس عہد کے صحابہ کرامؓ نے انسان دوستی، خدمت خلق، اطاعت گذاری، عبادت و ریاضت، مودت و الفت، خوف الٰہی اور محبت رسول کے جو نمونے پیش کئے ان سے نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی اخلاق کی تاریخ زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

اس عہد میں ایران، شام، بیت المقدس، عراق، طرابلس، مصر، ایشیائے کوچک، قبرص، خراسان، [illegible] جرجان وغیرہ کی فتوحات کی تفصیل پڑھ کر ایمانی حرارت پیدا ہوتی ہے، حضرت اسامہؓ، حضرت [illegible]، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ، حضرت عبداللہ بن عامرؓ اور حضرت سعید بن العاص [illegible]

قائدین سے مسلمانوں کی سپہ گری اور نبرد آزمائی کی تاریخ بھی زریں بنی، مگر اسی دور کی دکھ بھری کہانی یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ شہید ہوئے، جنگ جمل بھی ہوئی جس میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر بن عوامؓ جیسے اکابر صحابہ اللہ کو پیارے ہوئے، جنگ صفین بھی آپس ہی کے اختلاف کی لڑائی تھی جس میں ایک لاکھ آدمی جاں بحق ہوئے، عمرو بن العاصؓ کے فیصلے سے اختلاف کی بنیاد پڑی تو بنو ہاشم اور بنو امیہ میں مستقل عناد پیدا ہو گیا، خارجیوں کا فرقہ وجود میں آیا، حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد خلافت کے بجائے ملوکیت قائم ہو گئی۔

*

بنو امیہ نے مسلمانوں کی حکومت کا دائرہ بہت وسیع کر دیا، ان کی مملکت کے اندر حجاز، عراق، عمان، بحرین، کرمان، سیستان، کابل، خراسان، سندھ، موصل، آذربائیجان، آرمینیا، دمشق، اردن، حمص، مصر اور شمالی افریقہ کے سارے علاقے رفتہ رفتہ آ گئے، اندلس، سسلی، سارڈینیا اور بحیرۂ روم کے جزیرے بھی شامل تھے، ان کی فوجیں اندلس سے نکل کر پرتگال اور فرانس کے حدود میں داخل ہو گئی تھیں، یہ ایسے فوجی کارنامے ہیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے، ان کے فرماں رواؤں میں سے ولید، سلیمان اور ہشام کی سطوت اور حشمت سے رومی اور عیسائی سلطنتیں بھی لرزہ براندام رہیں، مگر ان ہی کے عہد میں کربلا کا المناک واقعہ پیش آیا، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف لشکر کشی میں خانہ کعبہ پر بھی آتش باری کی گئی، ان کی لاش تین دن سولی پر لٹکتی رہی، اور جب ولید بن عبدالملک کے زمانہ کے فوجی قائدین میں قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم نے اسلام کا جھنڈا ترکستان، بخارا، سمرقند، غرناطہ، قرطبہ، طلیطلہ، ملطانہ، غرانہ، سرطوس اور سندھ پر لہرایا تو یہ بھی المیہ ہے کہ اسی خاندان کے حکمراں سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں یہ چاروں مایہ ناز فوجی قائدین موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

*

یہ کیسا دردناک پہلو ہے کہ اسلام ساری تفریق مٹانے آیا تھا، مگر بنو ہاشم بنو امیہ کو برا سمجھنے لگے، شیعیان علیؓ خلفائے ثلاثہؓ اور ان کے بعد کے تمام مسلمان حکمرانوں کو غیظ و غضب کی نظر سے دیکھنے لگے، خارجیوں نے امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے حامیوں کو گمراہ خیال کیا، عربی اور عجمی، عدنانی اور قحطانی، یمنی اور مضری کے نسلی امتیازات اور باہمی تعصبات بھی بری طرح ابھر گئے، حسد، رقابت، عناد اور نفاق اسلام کی تعلیم کے منافی ہے، مگر ان رذائل کی

بدعت ولید ثانی اور یزید بن عبدالملک کا قتل بھی ہوا اور جب عباسیوں نے بنوامیہ کو مغلوب کیا تو ان کو چن چن کر قتل کیا اور ان کے اسلاف کی قبریں اکھڑوا دیں۔

بنو عباس کی حکومت تقریباً پانچ سو برس رہی ان کی سلطنت کے حدود بنوامیہ سے تو نہیں بڑھے مگر ان کے فرماں رواؤں میں منصور کے زمانہ سے عباسی خلفاء روحانی پیشوا بھی تسلیم کئے جانے لگے ہارون رشید کے عہد کی تمدنی شان و شوکت علوم و فنون کی ترقی، سیاسی بیدار مغزی، انتظامی، اور فوجی قوت میں دنیا کی شاید ہی کوئی حکومت اس کا مقابلہ کر سکتی تھی، مامون رشید کے عہد میں جو علمی ترقی ہوئی وہ بھی مسلمانوں کی تاریخ کا زریں باب ہے۔

اسی کے ساتھ ان صدیوں میں مسلمانوں کے اختلافات کی تاریخ بھی دردناک رہی، علویوں، خارجیوں اور زندیقوں کو فرو کرنے میں جانی اور مالی نقصانات ہوتے رہے، باہمی نفاق کی وجہ سے ابوسلمہ، جعفر برمکی، فضل بن سہل، ابراہیم بن علی، موسیٰ بن مصعب، نظام الملک طوسی، مامون رشید کے بھائی امین اور خلیفہ متوکل علی اللہ کا قتل بھی ہوا، مختلف علاقوں کے مسلمان حاکم مسلمانوں ہی کی حکومت کے خلاف بغاوتیں بھی کرتے رہے۔

جن علاقوں کی بغاوتیں سر نہ ہو سکیں، وہاں خود مختار حکومتیں قائم ہوتی گئیں، اندلس میں اموی خلافت قائم ہوگئی، مصر میں فاطمیوں کی حکومت بن گئی، شمالی افریقہ میں ادریسی، قیروان اور صقلیہ میں اغلبی، یمن میں محمد بن ابراہیم نے زیادی، خراسان میں طاہر بن حسین نے طاہری، دیلم اور طبرستان کے کوہستانی علاقہ میں علوی، سیستان میں صفاری، ماوراء النہر میں سامانی، دیلم کے علاقہ میں آل بویہ نے دیلمی، وسط ایشیا میں سلجوقی، اور موصل میں زنگی اور ایوبی حکومتیں علیحدہ علیحدہ قائم ہو گئیں۔

ان خاندانوں کے فرمانرواؤں میں کچھ ایسے بھی گذرے جن پر مسلمانوں کو فخر ہو سکتا ہے، اندلس کے عبدالرحمٰن اول، اور ہشام بن عبدالرحمٰن نے قرطبہ کو سجا کر نادرۂ روزگار بنا دیا، وہاں کے عبدالرحمٰن ناصر کی فوج دنیا کی بہترین فوج سمجھی جاتی تھی، حکم ثانی کے زمانہ میں اندلس علم و فن کا قابلِ رشک مرکز بن گیا تھا، سلجوقیوں میں طغرل نے

…عالم کو اپنے سامنے جھکا لیا تھا اس لیے سلطان اعظم کہلاتا تھا، اسی خاندان کا ملک شاہ اپنی جہاں بانی کی بنا پر دنیا کے بہترین فرمانرواؤں میں شمار کیا جاتا تھا، زنگی خاندان میں نورالدین زنگی نے خلفائے راشدین کی یاد تازہ کر دی تھی، صلاح الدین ایوبی اپنی حکمرانی اور صلیبی لڑائیوں میں اپنی ہوشمندانہ پامردی کی وجہ سے آج بھی فرمانرواؤں کے لیے مشعلِ ہدایت ہے، اس نے بیت المقدس فتح کیا تو یورپ کے فرمانروا اپنی مشترکہ کوششوں کے باوجود اس کو اس سے واپس نہ لے سکے۔

نسلی، قبائلی، علاقائی اور ذاتی مفاد پرستی میں جو چھوٹی بڑی حکومتیں قائم ہوئیں وہ سب رفتہ رفتہ ختم ہو گئیں، ان کے زوال کے اسباب جہاں سیاسی، اقتصادی، فوجی اور معاشرتی تھے، وہاں ایک بڑا سبب ان کی باہمی آویزش بھی ان میں اتفاق کے بجائے نفاق، اتحاد کے بجائے انتشار اور یگانگت کے بجائے منافرت رہی، یورپ کے عیسائی اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کی بیخ کنی میں برابر لگے ہوئے تھے، ایسے موقع پر وہاں کے مسلمانوں کو متحد رہنا چاہیے تھا، مگر ان کو مصر کے فاطمیوں سے برابر خطرہ رہا، اندرونی طور پر بنو عامر، بنو حمود، بنو ذوالنون، المورودی، موحدی اور بنو احمار وغیرہ کے جھگڑے جاری رہے، پھر بربری مسلمانوں اور ملوک عربوں کے باہمی اختلافات نے آگ پر تیل ڈالا، اس طرح ساڑھے آٹھ سو برس کے بعد مسلمان اس مملکت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے، جس سے عالم اسلام کے مسلمانوں کی عزت و ناموس پر اغیار کو ہنسنے کا موقع اس لیے ملا کہ ع عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے۔

ان ریاستوں کی علیحدگی پسندی سے بنو عباس کی حکومت بھی کمزور ہوتی گئی، ہاشمیوں اور علویوں کے علاوہ عربوں، عجمیوں اور ترکوں، شیعوں اور سنیوں، حنفیوں اور حنبلیوں کی باہمی آویزشوں سے یہ اور بھی بے جان ہو گئی، اس سے فائدہ اٹھا کر تاتاریوں نے اس کو روند ڈالا تو مسلمانوں کی ایک ایسی حکومت کا خاتمہ ہو گیا جس کے پیچھے بڑی شاندار روایات تھیں۔

تاتاریوں نے سلجوقیوں کو بھی تہس نہس کیا مگر ان کی خاک سے ایشیائے کوچک میں دولت عثمانیہ ابھری جو آگے چل کر دلکش امپائر کہلائی، ایک زمانہ تھا کہ اس کے قلمرو میں مشرق وسطیٰ کے علاوہ یورپ میں سربیا، بلغاریہ، سلونیکا، البانیہ، بوسنیا، روڈس، ہنگری، بلغراد اور کریمیا وغیرہ بھی تھے، سلطان محمد فاتح تو روم کو بھی فتح کرنا چاہتا تھا،

سلطان سلیم اول کے بعد ترکیان کے سلاطین مسلمانوں کے خلیفہ بھی ہو گئے۔ سلطان سلیمان اعظم کے عہد میں ترکی سلطنتیں بھی بڑی ترقی تھیں، سلطان سلیم ثالث نے تو فرانس کے نپولین اعظم سے بھی ٹکر لی، سلطان عبدالحمید کے عہد میں عثمان پاشا نے روس سے ایسی بہادرانہ جنگ کی کہ وہ شیر پلونا کے نام سے مشہور ہوئے

یورپ کے عیسائیوں کی نظروں میں دولت عثمانیہ بھی برابر کھٹکتی رہی، ترکوں کو ہی تعلیم کہ اپنی ... کا ثبوت دینا چاہئے تھا، گمان میں بھی اندرونی طور پر بڑا اختلاف رہا، سلطان عثمان دوم اور سلطان سلیم ثالث قتل کئے گئے، سلطان مصطفی، سلطان ابراہیم، سلطان مصطفی دوم اور سلطان عبدالحمید ثانی معزول کئے گئے، سلطان مراد اور سلطان احمد سوم کے وزیر اعظم بھی ہلاک کئے گئے، ترکوں نے نو مسلم عیسائیوں کی ایک فوج انکشاریہ کے نام سے تیار کی تھی، ان کی ریشہ دوانیوں سے اندرونی طور پر بڑا انتشار رہا۔

ایران کے صفوی سلاطین نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تو وہ ترکوں کے معاند بن گئے، وہاں نادر شاہ کے حملوں نے ان کو اور کمزور کر دیا، مصر کی ماتحت ریاست ذوالقدریہ نے ان سے سرکشی اختیار کی، ان اختلافات سے یورپ کی عیسائی حکومتیں کیوں نہ فائدہ اٹھاتیں، سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانہ میں انگریزوں نے قبرص پر قبضہ کر لیا، مصر کو بھی اپنی نگرانی میں لے لیا، سوڈان پر لارڈ کچنر کا غاصبانہ اقتدار ہو گیا، اٹلی نے طرابلس کو زیر نگیں کر لیا، پھر یورپ کے سلاویوں نے بلقان کی جنگ چھیڑ کر ترکوں کے یورپی علاقوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور جب ترکوں نے پہلی جنگ عظیم میں جرمنوں کا ساتھ دیا تو ان کی شکست کے بعد حجاز، عراق اور فلسطین کو انگریزوں نے لے لیا، شام فرانس کے قبضہ میں آگیا، ایشیائے کوچک یونان کو ملا، قسطنطنیہ اور آبنائے باسفورس سب کی مشترکہ ملکیت میں آ گئے، سلطان عبدالحمید دوم کی خلافت ختم کر دی گئی تو دولت عثمانیہ کا دور بھی تقریباً ساڑھے چھ سو برس کے بعد ختم ہو گیا، ترکی میں جمہوری حکومت مصطفی کمال کی صدارت میں قائم ہوئی، مگر خلافت کی وجہ سے مسلمانوں کی جو مرکزیت تھی وہ جاتی رہی۔

اور جب مسلمانوں کی حکومتیں علٰحدہ علٰحدہ قائم ہو رہی تھیں تو چوتھی صدی ہجری میں افغانستان میں غزنویہ کی حکومت قائم ہوئی جو تقریباً ڈیڑھ سو برس رہی، سلطان محمود غزنوی دنیا کے عظیم ترین فاتحوں اور حکمرانوں میں شمار کیا جاتا

محمود غزنوی کا خاندان غوریوں کے ہاتھوں ہوا، شہاب الدین غوری کا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم ہوئی، جو مختلف خاندانوں میں منتقل ہو کر ساڑھے چھ سو برس تک رہی، غلام سلاطین میں قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن، خلجیوں میں علاء الدین خلجی، تغلقوں میں محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق، افغانوں میں شیر شاہ، مغلوں میں بابر، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے کارناموں پر مسلمان فخر کر سکتے ہیں، انھوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ہندوستان کو جنت نشان بنا دیا تھا۔

مگر یہاں بھی مسلمانوں کی حکومت میں افراتفری رہی، تیمور مسلمان تھا، مگر دہلی پر حملہ کر کے ایک مسلمان کی حکومت کو تباہ کر گیا، امراء برابر آپس میں لڑتے رہے، مغلوں کے آخری دور میں ہندوستانی اور غیر ہندوستانی، شیعہ اور سنی امراء کے اختلافات سے حکومت کی بنیاد ہل گئی، پھر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی پر کلنک کا یہ ٹیکہ ہمیشہ کے لئے لگ گیا کہ مسلمانوں کی ایک سلطنت پر حملہ آور ہو کر اس کو ختم کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

چودھویں صدی ہجری میں نجد، حجاز، عسیر، یمن، مسقط، امارات نواحی تسعہ، بحرین، کویت، عراق بشمول فلسطین، شام اور مصر پر بظاہر عربوں کی حکومتیں رہیں، مگر ان پر یورپ کی سامراجی قوتیں چھائی رہیں، ان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی تو مصر، سوڈان، عراق اور اردن انگریزوں کی سامراجیت سے بیزار ہوئے، الجزائر اور مراکش فرانسیسیوں کی غلامی سے آزاد ہوئے، یمن، تیونس اور لبنان کو بھی آزادی مل گئی، مگر یہودیوں نے عراق سے اردن کو کاٹ دیا، یمن کے دو ٹکڑے کر دیئے، لبنان کو عیسائیوں اور عربوں کے لئے وجہ تنازعہ بنا دیا، فلسطین اور خصوصاً بیت المقدس پر اسرائیلیوں کا قبضہ کرا دیا۔

کچھ نئی ریاستیں بھی بنیں، بحرین، قطر اور ابوظہبی انگریزوں کے اثر سے آزاد ہوئیں تو عرب امارات کے نام سے اپنا اتحاد بنا لیا، مسقط، عمان، زنجبار کی اب علٰحدہ ریاستیں ہیں، افریقہ میں لیبیا، نائجیریا اور مالی میں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں، انڈونیشیا ولندیزیوں سے آزاد ہو کر اس وقت سب سے بڑی مسلم ریاست ہے، ملیشیا بھی اب ایک مسلم ریاست بن گئی ہے، پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی قربانیوں سے وجود میں آیا مگر باہمی آویزش سے اس کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے، بنگلہ دیش اب ایک علٰحدہ مسلم ریاست ہے۔

عربوں نے قومیت کے سہارے اپنے کو منظم کرنے کی کوشش کی مگر اسلام نے ان کو جتنا متحد کیا تھا اتنا وہ عرب قومیت کے نام

حصہ ہے کہ سعودی عرب کے شدید عمل رد عمل نے تمام [illegible] کی ہیں یہ ... کی کوشش کی گئی پاکستان کے تعمیری

تجویز ... اب ... بہت ... سیاسی ... گئے ہیں۔ ع ... [illegible]

جمال الدین افغانی نے بھی پان اسلام ازم کی تحریک چلائی تھی۔ ڈاکٹر محمد اقبال کی تمنا تھی کہ نیل کے ساحل سے کاشغر کی خاک تک مسلمان ایک ہوں مگر ہم ابھی ان آرزوؤں کے خواب کی تعبیر کیا دیکھتے کہ سمرقند، بخارا اور تاشقند جہاں سے اسلامی علوم و فنون کا سرچشمہ بہا تھا کمیونزم کے زیر اثر ہیں۔ عراق اور شام نے اسلامی تعلیمات کو چھوڑ کر اشتراکی خیالات کو اپنایا ہے۔ افغانستان روس کی گود میں جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سعودی عرب، پاکستان اور ایران سے اسلامی دستور کی آواز بلند ہوئی۔ مگر ابھی اس کے عملی پہلو عیاں سامنے نہیں آئے ہیں۔ ایران اسلامی انقلاب کے نام پر خون کی ہولی کھیل رہا ہے۔

مسلمان اپنی نسبت ابراہیمی سے معمار جہاں بننے کے لئے آئے تھے وہ راز کن فکاں تھے آخری نبوت کے امین تھے اور خدا کی زمین ایشیا کے پاسبان بنائے گئے تھے، مگر وہ سوچیں کہ اب کیا ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ کسی زمانہ میں انھوں نے جہانداری، جہانبانی اور جہانبینی کی اعلیٰ مثالیں پیش کیں مگر جب وہ اپنے عروج سے زیادہ اپنے زوال کے اسباب پر غور کریں وہ اسلامی اخلاق کے فضائل سے آراستہ رہے تو ابھر کر جھپٹے پلٹے اور پلٹ کر جھپٹے مگر بنیادی اخلاق کے رذائل میں مبتلا ہوئے تو گرے اور گرتے چلے گئے۔ اسلام کی تعلیم تھی کہ مسلمان اپنی یگانگت اور مؤانست میں سیسہ کی دیوار بنے رہیں، کسی ایک مسلمان کے تلوے میں خار چبھے تو دوسرا مسلمان اس کی خلش اپنے سارے جسم میں محسوس کرے مگر ان کی تاریخ میں ان کی باہمی عداوت، فرقہ پسندی اور نفاق پروری کی ایسی مثالیں ہیں کہ حالی نے ... کہا تھا

کہ نااتفاقی نے کھویا ہے ہم کو ۔۔۔ اسی جزر و مد نے ڈبویا ہے ہم کو

اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ

نہیں جانتے یہ کہ جاتے کدھر ہیں ۔۔۔ گئے بھول رستہ وہ یا راہ پر ہیں

ان کے دل کی درد بھری آواز یہ بھی تھی کہ

انھیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے ۔۔۔ ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دے

حالی کے بعد اقبال نے یہ پیام دیا تھا ع تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری۔

پندرہویں صدی کا آغاز بھی مسلمانوں کو یہی پیام دیگا

مقالات

سنائی کا مذہب

از

جناب ڈاکٹر نذیر احمد، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۲)

سنائی کی حدیقہ کے مطبوعہ نسخے میں حضرات خلفائے اربعہؓ کی مدح میں قرآن و حدیث وغیرہ کے جو اقتباسات نقل ہوئے ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنائی کے نزدیک ہر ایک کا کیا مقام تھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں فرماتے ہیں[1]:-

ذکر ابی بکر الصدیق الاطہرؓ	ابوبکر صدیق اطہرؓ، شیخ اکبر، وزیر
الشیخ الاکبر الوزیر الانور	روشن فکر، بزرگ و منتخب روزگار،
العتیق الازھر، الصاحب فی	یار غار، سختیوں اور اسرار میں معتمد
الغار، الموتمن فی الشدائد	علیہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
والاسرار، المنفق لرسول	کے لئے چالیس ہزار دینار صرف
اللہ اربعین الف دینار، حبیب	کرنے والے، اللہ تعالیٰ کے حبیب کے
حبیب الملک الجبار، الذی	حبیب، جن کی شان میں قرآن کی

---

[1] ص ۲۲۲ ببعد

انزل اللہ تعالیٰ فی شانہ:
والذی جاء بالصدق
وصدق بہ اولٰئک ھم
المتقون، وقال النبی صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم :-
ھذا کھول اھل الجنۃ من
الاولین والآخرین الا
النبیین والمرسلین، وقال
علیہ السلام: انت عتیق
اللہ من النار، فسمی عتیقاً
وسئل الجنید عن قول النبی
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
لابی بکر: انت عتیق اللہ
من النار الخ قال: لانہ عتیق
من مشاھدۃ الکونین لا
لیشاھد مع اللہ غیر اللہ،
.... وقال علیہ السلام:
ولو کنت متخذاً من امتی
خلیلاً لاتخذت ابا بکر

آیت: "والذی جاء بالصدق"[۵]
(وہ شخص جو سچ بات لے کر آیا، اور
جس نے اُس کو سچ جانا، تو یہ لوگ
پرہیزگار ہیں) نازل ہوئی ان
کا ذکر، اور فرمایا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے انبیاء
اور مرسلینؑ کے سارے اگلوں اور
پچھلوں میں وہ ابوبکر صدیق اہلِ
جنت کے بزرگ ہیں، اور فرمایا حضور
علیہ السلام نے آپ کو اللہ نے جہنم کی
آگ سے بچایا ہے، پس آپ کا نام عتیق
ہوا، حضرت جنیدؒ سے حضرت ابوبکرؓ
سے متعلق حضور علیہ السلام کے قول:
انت عتیق اللہ الخ کے بارہ میں
سوال کیا گیا، انھوں نے جواب میں
فرمایا، اس لئے کہ وہ مشاہدۂ کونین
سے فارغ ہیں، اس لئے کہ اللہ کے
ساتھ غیر اللہ کا مشاہدہ نہیں چاہیے،
اور حضور علیہ السلام نے فرمایا، اگر میں

---

۵ سورۂ زمر - آیت نمبر ۳۳

خليلا ...... وقال صلى الله عليه وسلم: انا مدينة الصدق وابوبكر بابها وقال عليه السلام: من احب ابا بكر فقد اقام الدين،

اپنی اُمت میں سے کسی کو دوست اختیار کرتا تو ابوبکر ہی کو اختیار کرتا، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: میں صدق کا شہر ہوں، اور ابوبکرؓ اس کے دروازے ہیں، فرمایا حضور علیہ السلام نے: جس نے ابوبکر سے محبت کی، اُس نے دین کو قائم کیا،

حضرت عمرؓ کے لئے اس طرح فرمایا گیا ہے،

ذكر امير المومنين ابي حفص عمر بن الخطاب المذكور بافضل الخطاب، الحاوي للثواب، الماحي العقاب الذي فرق بين الحق والباطل والقتيل والقاتل، الذي انزل الله تعالى في شانه يا ايها النبي حسبك الله ومن اتبعك من المومنين

ذکر امیر المومنین ابوحفص عمرؓ بن خطاب کا، جن کا ذکر افضل الخطاب ہے جو اجر ثواب کے جمع کرنیوالے برائی کے ختم کرنے والے وہ ذات جن کی وجہ سے حق و باطل قتیل و قاتل میں امتیاز ہوتا ہے جن کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی: "یا ایھا النبی الآیہ" (اے نبی اللہ اور مومنین میں وہ جنھوں نے آپ کی پیروی کی، آپ کے لئے کافی ہیں اللہ)

ھ حدیقہ ص ۲۳۴، ۵۲ قرآن سورۂ الانفال ۸ - آیت ۶۴،

يعنى عمر رضى الله عنه قال	عمر فرمایا حضور علیہ السلام نے عمر
النبى صلى الله عليه وسلم	اہل جنت کے چراغ ہیں، اگر میرے
عمر سراج اهل الجنة ولو كان	بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے، اور فرمایا
بعدى نبيا كان عمر، وقال	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان
عليه السلام، ان الشيطان	عمر کے سایے سے بھاگتا ہے جس نے عمرؓ
ليفر من ظل عمر، من احب	سے محبت کی، وہ خطرے سے محفوظ رہا
عمر امن من الخطر من احب	جس نے عمر کو عزیز رکھا، اس پر سارے
عمر فقد اوضح الطريق وقال	راستے روشن ہو گئے، اور فرمایا حضور
انا مدينة العدل وعمر بابها،	علیہ السلام نے، میں عدل کا شہر
	ہوں، اور عمر اُس کے دروازے ہیں

حضرت عثمانؓ کی مدح اس طرح شروع[1] ہوتی ہے،:

ذكر الشهيد القتيل المظلوم	بیان شہید قتیل مظلوم، ابوبکر عثمان
ابى بكر عثمان بن عفان ذى	ابن عفان کا جو دونوں منزلوں (دنیا
النورين المكرم فى المنزلين	و آخرت) میں مکرم ہیں جن سے حضور
ختن رسول الله صلى الله عليه	علیہ السلام نے اپنی دو محترم و مکرم بیٹیاں
وسلم باثنين ام كلثوم ورقيه	اُم کلثومؓ و رقیہؓ کا نکاح کر کے اُن کو
المباركتين الكريمتين جامع	داماد بنایا، وہ جامع قرآن اور اس
القرآن الشاهد يوم التقى	دن کے شاہد ہیں جب دو جماعتیں ملیں گی

---

[1] حدیقہ ص ۲۳۹،

الجمعان، الذی انزل اللہ	وہ ذات جن کی شان میں اللہ تعالیٰ
سبحانہ وتعالیٰ فی شانہ؛[1]	نے یہ آیت نازل فرمائی، امن ھو
أمّن ھو قانت آناء اللیل	قانت الآیۃ (بھلا جو شخص، وقت
ساجدا وقائما یحذر الآخرۃ	شب میں سجدہ وقیام (یعنی نماز کی
ویرجو رحمۃ ربہ، وقال	حالت میں عبادت) کر رہا ہو، آخرت
النبی صلی اللہ علیہ وسلم	سے ڈر رہا ہو، اور اپنے پروردگار
فی حقہ: عین الایمان عثمان	کی رحمت کی امید کر رہا ہو) اور
بن عفان مجھز جیش العسرۃ	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت
وقال ایضا صلوٰت اللہ و	عثمانؓ کے حق میں فرمایا، عثمان بن
سلامہ علیہ حکایۃ عن	عفان عین ایمان ہیں جنھوں نے
اللہ تعالیٰ: استحییت من	تنگی میں فوج کے لئے ساز وسامان تیار
عثمان بن عفان، وقال	کر رکھا ہے، اور حضورؐ نے اللہ کی طرف
الحیاء من الایمان وعثمان	منسوب کرکے فرمایا، عثمان بن عفان
عین الحیاء وقال علیہ	سے میں حیا کرتا ہوں، اور حضور علیہ السلام
السلام: انا مدینۃ الحیاء	نے فرمایا، حیا ایمان سے ہے اور
وعثمان بابھا،	عثمان عین حیا ہیں، اور حضور نے مزید
	فرمایا، میں حیا کا شہر ہوں، اور عثمان
	اس کے دروازے ہیں،

---

[1] قرآن سورہ ۳۹۔ آیت ۹۔

حضرت علی کا بیان اس طرح شروع ہوتا ہے[۱]

ذکر زوج البتول وابن عمّ الرّسول ابی الحسن والحسین، المبار ذالکرار، غیر الفرار، غالب الجیش الجرار، سیّد المهاجرین، والانصار، قال النبی صلّی اللّٰه علیہ وسلّم: من احبّ علیا فقد استمسك بالعروة الوثقی، الّذی انزل اللّٰه تعالیٰ "انّما ولیکم اللّٰه ورسولہ والّذین آمنوا الّذین یقیمون الصّلٰوة ویؤتون الزّکٰوة وھم راکعون" وقال اللّٰه تعالیٰ: ویطعمون الطّعام علیٰ حبّہ مسکینا وّیتیما وّاسیرا" وقال علیہ السّلام: یا علی! انت منی بمنزلة ہارون من موسیٰ

حضرت فاطمۃ الزہرا (بتول) کے شوہر، حضور کے چچازاد بھائی، ابوالحسن والحسین، بہت حملے کرنے والے میدان میں ڈٹے رہنے والے جنگجو لشکر جرار پر غالب، مہاجرین اور انصار کے سردار کا بیان، حضور علیہ السّلام نے فرمایا، جس نے علی کو دوست رکھا، اس نے دین کے مضبوط رسّے کو پکڑا، وہ ذات جس کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی "انّما ولیکم اللّٰه الآیہ" تمہارے دوست تو اللہ، اس کے رسول اور ایمان والے لوگ ہیں، جو اس حالت سے نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، کہ ان میں خشوع ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ویطعمون الطّعام الآیہ:

---

[۱] حدیقہ ص ۲۴۴،

الا انہ نبی۔ لا نبی بعدی

وقال صلی اللہ علیہ وسلم:

اللھم وال من والاہ وعاد

من عاداہ، وانصر من

نصرہ واخذل من خذلہ

وقال، من کنت مولاہ فعلی

مولاہ، ..... وقال النبی

علیہ السلام، انا مدینۃ

العلم وعلیؓ بابھا،

اور وہ لوگ محض خدا کی محبت سے

غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے

ہیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا: اے

علی تم مجھ سے ہو، جیسے ہارون موسیٰ

سے تھے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ

نبی تھے، اور تم نبی نہیں اس لئے

کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے

اللہ اس کو محبوب رکھ جو علی کو محبوب

رکھے، اور اس کو دشمن رکھ جو علی کو

دشمن رکھے، اس کی مدد کر جس نے

اُن کی مدد کی، اور جو اُن کو ذلیل کرے

اس کو تو ذلیل کر، اور فرمایا، جس کا

دوست میں ہوں، تو علی بھی اس کے

دوست ہیں، اور نبی علیہ السلام نے

فرمایا، میں علم کا شہر ہوں اور علی

اس کے دروازے ہیں،

اگرچہ حدیقہ سنائی کے ان بیانات کے بعد حکیم سنائی کے تسنن اور حنفیت میں شبہہ باقی نہیں رہ جاتا، پھر بھی مزید استدلال کے لئے دیوانِ سنائی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے،

دیوان میں خلفائے اربعہؓ کا ذکر بکثرت ہوا ہے، اور وہاں چاروں خلیفہ کا ذکر اسی ترتیب سے ہوا ہے جو اسلاف میں رائج تھی، ذیل میں بعض[1] اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

گفتم اے بوبکر با احمد چہا یکتا شدی ‌ ‌ ‌ گفت ہر حرفے کہ ضعفی یافت آن مدغم بود
گفتم اے عمر تو دیدی بو الحکم پس چون برید ‌ ‌ ‌ گفت زمردکی سزاے دیدۂ ارقم بود
گفتم اے عثمان بناگہ کشتۂ غوغا شدی ‌ ‌ ‌ گفت خلخال عروس عاشقان زان دم بود
گفتم اے حیدر منی از ساغر شیران بخور ‌ ‌ ‌ گفت نفخ باز نفخ زادۂ مجسم بود

اے چو عثمان چو حیدر شرم ردی وزدرمند
دی چو بوبکر و چو عمر راست گوی ودادگر (صفحہ ۲۷۹)

صادقین بوبکر بود و قانیتن فترخ عمرؓ
منفقین عثمان، علی مستغفرین آمد بہم (ص ۳۶۳)

در از اصحاب پیغمبر عتیق و عمر و عثمان
علی و سعد و سلمان و صہیبؓ خالد و مظعون (ص ۵۴۲)

در پی بوبکرؓ خواہی رفت بعد از مصطفیٰ ‌ ‌ ‌ پاے بر دندان مار و دست بر دینار کو
در کوے عمرؓ کو داد و کو مشک و مار ‌ ‌ ‌ یک درا عہ ہفدہ من دہ سال یک دستار کو
در در عثمانؓ گرفتی شرم کو وحلم کو ‌ ‌ ‌ دیدۂ روشن ز دین و سینۂ بیدار کو
در ہمی گوئی کہ ہستم چاکر شیر خدا ‌ ‌ ‌ تن فداے تیغ و جان در خدمت دادار کو

(ص ۵۴۳)

صادقی باید کہ چون بوبکرؓ در صدق و ثواب ‌ ‌ ‌ زخم مار و بیم دشمن از بن دندان کشد

---

[1] دیوان ص ۱۶۷۔

یا نہ چوں عمرؓ کہ در اسلام بعد از مصطفےٰؐ — از رعب لشکر ز جیحوں سوے ترکستاں کشد
پارسائی کو کہ در محراب و مصحف بے گناہ — تا زِ غوغا شور شِ شمشیر چوں عثماںؓ کشد
حیدرِ کرارؓ کو کاندر مصاف از بہر دیں — در صفِ صفیں ستم از لشکرِ مرداں کشد

(ص ۵۹۰)

سنائی نے اپنے مکاتیب میں حضرت عمرؓ کی بے حد تعریف کی، مثلاً ایک خط خیامؔ کے نام یہ لکھتے ہیں:-

" جامہ و نامۂ تو داد عمرؓ بس احبک اللہ، مراد ازیں اسباب و اطباب آنست کہ چوں شرف جوہر نبوت از حراست عمرؓ مستغنی نبود پس صدف دُرِ حکمت را از رعایت عمرے نیز استغنا نہ باشد، کہ کتاب و حکمت دو جوہر اند در یک طویلہ...
...چوں کتاب را بجہاں عمرؓ سے حاجت بود حکمت را نیز بچوں تو عمرے حاجت باشد تا بسبب عُمَران این دو ولایتِ عمراں باشد" (مکاتیب ص ۳۰)

ان مندرجات کے دقیق مطالعے کے بعد حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

(۱) سنائی اہلِ سنت والجماعت کے مسلک پر تھے، جو اشعار اوپر نقل ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ چند اور شواہد قابلِ ذکر ہیں:

سنی دیں وار شو تا زندہ مانی زانکہ ہست — ہر چہ جز دیں مردگی و ہر چہ جز سنت حزن

(ص ۴۸۹)

چار گوہر چار پایۂ عرش شرعِ مصطفےٰؐ است — صدق و علم و شرم و مردی کاین ہر چار پایہ
چار یار مصطفےٰؐ را مقتدا دارو بدا ن — ملک او را ہست نوبت پنج نوبت زن چار

صد ہزاراں رنج بوبکرؓ از یکے ایں حرف بُد — نوحؑ نہصد سال نوحہ کرد تا شد چو نال
گر دمِ بوبکرؓ خواہی بخشش یک نانت کو — در کمالِ نوح جوئی نوحہ ات کو نیم سال

(ص ۳۴۷)

بس نباشد قیمت گوہر بر و نقعاے درو — در نیابد بخشش بوبکرؓ حق اصطفا (۴۲)
در حریم مصطفےؐ بوبکرؓ دارا اندر خرام — تا سیہ روے جفا بینی و خوشخوئی وفا
عشق را بینی علم بر کردہ اندر کوی صدق — عقل را بینی قلم بشکستہ در صدرِ رضا

(ص ۴۴)

کار صدق و معنیٔ بوبکرؓ دارد در جہاں — ورنہ در ہر کوے بوبکرؓ است و در ہر کوہ غار

(۲۱۴)

گر شکر بی زہر خواہی غار بے خر مباش — صدق بوبکر بیت باید خیمہ اندر غار زن

(ص ۲۸۲)

مصطفےؐ را یار بوبکرؓ است اندر غار و بس — - بولہب را باز بوجہل است یار و ہم نشیں

(ص ۵۵۲)

نامِ عمرؓ از عدل بلند است و گر نی — یک خانہ ندانم کہ در آں جا عمرے ہست

(ص ۱۰۰)

آہوے خود پیش افتد مرد باید چوں عمرؓ — چوں عمرؓ در زیں نشیند بوالحسن باید سوار

(۲۲۵)

یا چوں عمرؓ بدتر جہاں را قرار دہ — یا چوں علیؓ بہ تیغ فراواں حصار گیر

(۲۹۶)

چو عمر خطابؓ سر سنت و دین ... چون حیدرِ کرارؓ در علم و معانی (۴۰۶)

تا بروزِ عدل دار الملک از تاثیرِ عدل ... ہمچو دار الملک انصافِ عمرؓ معمور باد

(۴۳۰)

(۲) سنائی کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مراتبِ دینی کا منکر رافضی ہے،

در سرای سریر مونس و یار ... ثانی اثنین اذ ہما فی الغار

صور صدقیا متش خوانند ... رافضی قدر او کجا داند

رافضی را بماندہ در گردن ... چنبک و مرگ چنبک جان کردن

بر براقی کہ مصطفیٰ پرورد ... رافضی رافضی چہ داند کرد

(۳) سنائی کے نزدیک حضرت علیؓ کے مخالفین خوارج واجب القتل ہیں،:

ہر کہ باشد خوارج و ملعون ... واجب آمد کشش بریزی خون

(۴) سنائی نے حدیقہ کے اشعار میں حضرت علیؓ اور اہلِ بیتِ اطہار سے کمال ارادت و عقیدت کا اظہار کیا ہے، مگر حضرت علیؓ کے نعتیہ قصیدہ میں جذباتِ ارادت و عقیدت میں وہ شدت نہیں جو حدیقہ میں پائی جاتی ہے، ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے سنائی کے مذہبی عقائد پر اعتراض کیا تھا، سنائی کے اشعار اس اعتراض کے جواب ہیں، اسی بنا پر ان میں ایک قسم کی شدت بھی ہے، اہلِ بیت سے کمالِ ارادت و اعتقاد کے نتیجے میں وہ آلِ ابی سفیان وآلِ مروان کی طعن و تشنیع کے بھی قائل تھے،

(۵) سنائی کے نزدیک امام اعظم یا امام شافعی پر طعن کرنے والے راہ دین سے بھٹکے ہوئے ہیں، دونوں میں سے کسی کی بھی پیروی راہِ حق ہے، وہ امام اعظم کے ساتھ اپنا حشر چاہتے

(۶) ان واضح نتائج کی روشنی میں وہ قصیدہ جو سلطان سنجر کے جواب میں ہے، اور جس

سنائی نے اپنے مذہبی موقف کی نشاندہی کی ہے، سنائی کے دیوان میں جو معلوم ہوتا ہے یہ قصیدہ بعض نسخوں میں من جملہ ان کے نسخہ کلیاتِ کابل میں شامل نہیں ہے، ذیل میں اس قصیدے کے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں،

کاہِ عاقل نیست در دل مہرِ دل بر داشتن　　جان نگیں مہر شاخ بلی بر داشتن
یوسفِ مصری نشستہ با تو اندر انجمن　　زشت باشد چشم را در نقش آزر داشتن
احمد مرسل نشستہ، کے روا دارد خرد　　دل اسیرِ سیرتِ بوجہل کافر داشتن
اے بدریائے ضلالت در گرفتار آمدہ　　زین برادر یک سخن بایست باور داشتن
بحر پر کشتی ست لیکن جملہ در گرداب خوف　　بی سفینۂ نوح نتوان چشم معبر داشتن
گر نجاتِ دین و دل خواہی ہمی تا چند ازین　　خویشتن چون دائرہ بی پا و بے سر داشتن
من سلامت خانۂ نوح نبی بنمایمت　　تا توانی خویشتن را ایمن از شر داشتن
شو مدینۂ علم را در جوی و پس در وی خرام　　تا کے آخر خویشتن چون حلقہ بر در داشتن
چون ہمی دانی کہ شہرِ علم را حیدر در است　　خوب نبود جز کہ حیدر میر و مہتر داشتن
کے روا باشد بناموس و حیل در راہِ دین　　دیو را بر مسند قاضی اکبر داشتن
از تو خود چون می پسندد عقلِ نابینائے تو　　پارگین را قابلِ تسنیم و کوثر داشتن
مر مرا باری نکو ناید ز روے اعتقاد　　حقِ زہرا بردن و دینِ پیمبر داشتن
تا سلیمان وار باشد حیدر اندر صدرِ ملک　　زشت باشد دیو را بر تارک افسر داشتن
چون درختِ دین بباغِ شرع حیدر در نشاند　　باغبانی زشت باشد جز کہ حیدر داشتن
جز کتاب اللہ و عترت ز احمد مرسل نماند　　یادگاری کان توان تا روز محشر داشتن
از گذشتِ مصطفای مجتبیٰ جز مرتضیٰ　　عالم را دین را نیارد کس معبر داشتن

بگزین سلطان ملک شہ چون تمیداری روا | تاج و تخت پادشاہی جز کہ سنجر داشتن
از پئے سلطان دین پس چون رواداری ہمی | جز علیؓ و عترتش محراب و منبر داشتن
ہشت بستان را کجا ہرگز توانی یافتن | جز بحب حیدر و شبیر و شبر داشتن
گر ہمی مومن شماری خویشتن را بایدت | مہر زہر جعفری بر دین جعفر داشتن

(دیوان چاپ مصفا ۵ ۲ بعد
چاپ مدرس رضوی ۷۶۴ بعد)

سنائی نے آلِ ابی سفیان و آل مروان پر لعن طعن کی ہے، اگر ان اشعار میں روئے سخن اُن کی طرف ہوتا تو یہ اشعار سنائی کے دیوان میں بے جوڑ نہ تھے لیکن واضحاً روئے سخن خلفائے ثلاثہؓ کی طرف ہے، ان اشعار میں ان حضرات کو جس طرح نشانۂ ملامت بنایا گیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے لیکن جو اشعار پہلے نقل ہو چکے ہیں، اُن میں خلفاے اربعہؓ کی محبت کو اصل دین بتایا گیا ہے، وہ خلفائے ثلاثہؓ سے بیزاری کو رفض کہتے ہیں، اور اُن کے نزدیک رفض ... نہیں، اس طرح کے اشعار کی موجودگی میں قصیدۂ بالا کی نسبت نہ صرف مشکوک بلکہ غلط معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ ان اشعار میں جن خیالات کا اظہار ہوا ہے، وہ سنائی کے معتقدات کے خلاف ہیں، اور چونکہ یہ قصیدہ سنائی کے دیوان کے بعض نسخوں میں منجملہ نسخۂ کابل میں شامل نہیں، اس بنا پر اس کا انتساب یقیناً مشکوک ہے،

خلاصۂ کلام یہ کہ سنائی شروع سے آخر تک سُنی اور حنفی مسلک کے پیرو تھے، اہل بیت سے اُن کو بڑی عقیدت تھی، اسی بنا پر وہ آلِ ابوسفیان پر لعنت بھیجنے کے حق میں تھے، غالباً اسی وجہ سے اس دور کے سُنی علماء سے اُن کا اختلاف ہوا، اس اختلافِ نظر کا عکس اُن کی کتاب حدیقہ میں ملتا ہے، یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت علیؓ کی نعت میں جو قصیدہ د...

میں شامل ہے، یا حضرت حسنینؓ کی مدح میں جو اشعار حدیقہ میں منقول ہیں، ان میں وہ جوش و خروش نہیں جو ان اشعار میں ہے، جو حدیقہ میں حضرت علیؓ کی مدح میں شامل ہیں،

یہ عجیب بات ہے کہ فارسی کے کسی مشہور شاعر نے خلفائے ثلاثہؓ اور ائمۂ فقہ خصوصاً امام اعظم و امام شافعی کے ساتھ ایسی عقیدت کا اظہار لفظاً نہیں کیا ہے، جیسا سنائی کے یہاں ہے، لیکن ان کے باوجود ان کے عقیدۂ مذہبی کے بارے میں اختلاف عرصے سے چلا آرہا ہے، اور اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ آلِ ابوسفیان و آلِ مروان کو ملعون اور مطعون قرار دیتے تھے، اس سے ان کے بارے میں غلط فہمی کے مواقع پیدا ہوگئے، اور لوگوں کو اس سے سوءِ ظن کا موقع ملا، لیکن حق بات یہی ہے کہ ان کا تسنن اور ان کی حنفیت ہر طرح کے شکوک سے پاک ہے،

راجہ جے سنگھ کی رصدگاہیں

از جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے ال ال بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی (اتر پردیش)

(۳)

(جے سنگھ کا مسلم ماخذ)

غیاث الدین جمشید کاشی نے "زیج خاقانی" کے علاوہ ایک اور زیج "زیج التسہیلات" کے نام سے لکھی تھی، غالباً اسی کے عنوان کے اتباع میں ملا چند اکبر شاہی (مولانا چاند منجم ہمایونی) نے اپنی ہیئتی تصنیف کا نام "تسہیلات" رکھا تھا۔

تسہیلات ملا چند اکبر شاہی کا حوالہ "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ کے علاوہ تاریخ و تذکرہ کی متداول کتابوں میں نہیں ملتا، ویسے مولانا چاند عہد ہمایونی کے ایک مشہور منجم تھے، وہ ہمایوں کے بہت پسندیدہ درباریوں میں تھے، چنانچہ جب بادشاہ شیر شاہ سے شکست کھا کر ایران بھاگے اور ملکہ حمیدہ بیگم کو جو اکبر کی ماں بننے والی تھیں قلعہ امرکوٹ میں چند وفادار جان نثار ساتھیوں کے ساتھ چھوڑا تو ان لوگوں میں مولانا چاند بھی تھے، جنھیں بادشاہ اس لئے چھوڑ گئے تھے کہ نومولود کی پیدائش کے وقت موجود رہیں، اور اس کا زائچہ مرتب کرکے بادشاہ کے پاس بھیجیں، ابوالفضل کہتا ہے:

"در وقت نہضت رایات نصرت اعتصام از حصار امرکوٹ مولانا چند منجم را کہ در معرفت اسطرلاب و تحقیق زیج و استخراج تقویم و تخریج احکام مہارتے عظیم و ممارستے تمام داشت بجہت تشخیص زمان سعادت وقت ولادت ملازم درگاہ عفت مآب ساختہ بودند"[1]

---

[1] اکبر نامہ ج ۱ ص ۲۳۔

مولانا چاند نے جو "زمان سعادت" نومولود کی ولادت کے لئے تشخیص کیا تھا حمیدہ بیگم کو اس سے پہلے ہی درد زہ شروع ہوگیا، مولانا چاند کو معلوم ہوا تو انھوں نے بڑے ادب سے کہلا بھیجا کہ ملکۂ عالیہ جس طرح بھی ہو سکے، تکلیف کو ضبط کر لیں اور ابھی ولادت نہ ہونے دیں، کیونکہ ابھی نحوست کا اندیشہ ہے، لیکن حسن اتفاق سے ملکہ کو اسی وقت نیند آگئی اور اس وقت بیدار ہوئیں جو مولانا چاند نے ولادت کے لئے تشخیص کیا تھا، اس طرح بادشاہ اکبر کی ولادت اسی ساعت سعید میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے نومولود کا زائچہ بنا کر بادشاہ کو لکھا کہ ہیئتی حسابات سے طالع سعادت سنبلہ ہے۔[1]

فاضل مصنف نے "اکبر نامہ" کی متعلقہ عبارت کا انگریزی ترجمہ نقل کیا ہے جس سے سیدھی سادی بات چیستاں بن کر رہ گئی ہے۔

ملا فرید شاہجہانی (زیج شاہجہانی) کا ترک ذکر فاضل مصنف (جی۔ آر۔ کے) کی انتہائی افسوسناک فروگذاشت ہے، راجہ جے سنگھ "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ میں غیر مبہم الفاظ کے اندر ملا فرید شاہجہانی (کی ہیئتی تصنیف "زیج شاہجہانی") سے استفادہ کا معترف ہے۔

"زیجہائے متعارف مثل زیج جدید سعید گورگانی خاقانی و تسہیلات ملا چند اکبر شاہی و ملا فرید شاہجہانی"[2]

مسلم ہندوستان کی ہیئتی تاریخ میں ملا فرید منجم شاہجہانی کی سرگرمیاں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی "زیج شاہجہانی" (پورا نام کارنامۂ صاحبقرانی زیج شاہجہانی) مغل دور کے ہیئتی ادب کا گل سر ہے، اور یہ باور کرنے کے لئے ناقابل تردید وجوہ ہیں کہ یہ کتاب راجہ جے سنگھ کے مطالعہ میں رہی تھی، اور وہ اس سے متاثر ہوا تھا (تفصیل آگے آرہی ہے) عہد شاہجہانی کا مشہور درباری مورخ محمد صالح کنبو "عمل صالح" میں ملا فرید کے تبحر علمی اور ریاضیاتی حذاقت کے بارے میں لکھتا ہے:

"ملا فرید منجم .... در تحصیل فن ریاضی باوجود مناسبت طبیعی و موافقت طالعی بتوفیق الٰہی

---

[1] اکبر نامہ ج ۱ ص ۱۸ و ۲۳۔ [2] زیج محمد شاہی ص ۱ ب۔

ریاضت تمام کشیدہ بود"[1]

اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ عبدالباقی نہاوندی نے "مآثر رحیمی" میں اس کے علم و فضل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ وقت کے ایک مشہور علمی خاندان میں پیدا ہوئے، ریاضیات کی اعلیٰ تعلیم امیر فتح اللہ شیرازی سے حاصل کی جن کے فیضِ تلمذ نے جوہر ذاتی کو سونے سے کندن بنا دیا، نہاوندی نے لکھا ہے[2]:

"آخر الامر از جملۂ تلامذۂ زمان و وحید دوران ارسطوئے ثانی و افلاطونی یونانی شاہ فتح اللہ شیرازی گشت و ترقی تمام در خدمت ایشاں اور ادست داد و در اندک زمانے از دانشمندانِ تبحر ایں فنون گردید، و اہل ہندوستان بدانش و فضیلت او مقر و معترف گشتند و کارش بجائے رسید کہ اکثر علمائے متقدمین ریاضی و دانایانِ پیشیں وجودش را در می یافتند بوجودش مفتخر گشتہ بشاگردیش مباہات می نمودند و متاخرین را خود در فضل و دانش او سخنے نیست"

علم ہیئت میں ان کی دو کتابیں مشہور ہیں "زیج شاہجہانی" اور "سراج الاستخراج"۔ اول الذکر کے بارے میں محمد صالح نے دوسرے سالِ جلوس کے واقعات میں لکھا ہے:

"اس انتہائی مبارک زمانہ کے واقعات میں سے ملا فرید منجم دکا زیج شاہجہانی کو تصنیف کرنا ہے، انھوں نے ریاضی و ہیئت کے فنون کو سیکھنے میں بڑی کوشش و ریاضت کی ہے، انھوں نے بادشاہ شاہجہاں کے ایما سے آصف جاہ وزیر کی نگرانی میں اپنے بھائی ملا طیب اور دوسرے یونانی علم الہیئت نیز ہندو جوتش ودیا کے ماہرین کی مدد سے کتاب زیج شاہجہانی کو مرتب کیا تھا، اس سال (۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء میں) بادشاہ کے سامنے (اس زیج شاہجہانی کو) پیش کیا اور بادشاہ نے اس کی اس کوشش کو بہت زیادہ سراہا، چونکہ اس کتاب کے اصول و ابواب بے شمار فوائد اور بے حساب منافع پر مشتمل ہیں نیز اس میں ایسے قاعدے اور ضابطے ہیں جس سے مختلف

---

[1] عمل صالح ص ۳۶۱ [2] عبدالباقی نہاوندی، مآثر رحیمی ج ۳ ص ۱۔

ہیئتی اور نجومی مسائل بڑی آسانی سے حل ہو جاتے ہیں جن سے متاثر ہو کر اس فن کے ماہرین زیچ ملغ بیگی سے مستغنی ہو گئے ہیں اور اسی کتاب کی مدد سے تقویم اور جنتریوں کو تیار کرتے ہیں، لہٰذا بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ فارسی نہ جاننے والے اور صرف ہندی جاننے والے منجموں اور جوتشیوں کی تعلیم و تعلم اور آسانی سے سمجھ میں آنے کے لئے نجوم و ہیئت سے واقف علماء نے اس کتاب کا (عوامی) ہندی زبان میں ترجمہ کیا[1]۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، یہ باور کرنے کے لئے ناقابل تردید وجوہ ہیں کہ یہ کتاب راجہ جے سنگھ کے مطالعہ میں رہی تھی اور وہ اس سے متاثر ہوا تھا، راجہ نے اس کتاب "زیچ شاہجہانی" کا ایک نہایت قابل اعتماد نسخہ حاصل کیا تھا جو یا تو مصنف کا دستخطی نسخہ ہے' یا اس سے براہ راست منقول ہے' خوش قسمتی سے یہ کتاب دستبرد حوادث سے محفوظ رہ گئی اور آج بھی ریاستی لائبریری کا قابلِ فخر سرمایہ ہے' جسے نیشنل میوزیم دہلی نے مستعار لے لیا ہے، اس کا سنہ کتابت حسب تصریح ۱۰۳۲ھ ہے، جب کہ بقول محمد صالح اس کا سنہ تصنیف بھی ۱۰۳۲ھ ہے، مگر کے (G. R. Kay) نے راجہ کے مسلم آخذوں میں اس کا نام نہیں لیا، حالانکہ خود راجہ نے اس کی صراحت کی تھی، چونکہ Flamstead کے ہیئتی جداول اس کی لائبریری میں ملے تھے اس لئے باوجودیکہ راجہ نے اس کے بارے میں کوئی صراحت نہیں کی، کے نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ راجہ نے اس کا مطالعہ کیا تھا[2]، مگر زیچ شاہجہانی" کا یہ قدیم ترین اور بیش قیمت مخطوطہ بھی ریاستی لائبریری کے اندر ہنوز موجود ہے اور راجہ نے غیر مبہم الفاظ میں اس کے مطالعہ کرنے کی صراحت بھی کی ہے، مگر فاضل مصنف نے اسے درخور اعتناء نہ سمجھا، یا للعجب! خدا جانے یہ فروگذاشت خود فاضل مصنف نے کی ہے یا ہنٹر کے اتباع میں انھوں نے ایسا کیا۔

---

[1] محمد صالح کنبوہ، عمل صالح، وقائع سال دوم جلوس، ص ۳۶۱

[2] G. R. Kaye . P. 88,

[3] Catalogue of National Mus P. 102,

اوپر بار بار کہا گیا ہے کہ راجہ کی مرتبہ زیج محمد شاہی کو اگر بربنائے ادب زیج الغ بیگ کا سرقہ نہ کہا جائے تب بھی مقدم الذکر کو موخر الذکر کا چربہ یا نظرثانی کردہ ایڈیشن (Revised-edition) ضرور کہا جائے گا، فاضل مصنف نے تو صرف اتنا ہی کہا ہے : —

" ان عوامل و موثرات کے باب میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے جنھوں نے راجہ جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا، یہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کے اثرات تھے"[1]

اور ان کی تقلید میں جوزف نیڈھم نے لکھا ہے :

" راجہ اگرچہ ہندو تھا اور اس نے ہندو معاونین ہی کی مدد سے کاروبار رصد کو انجام دیا، مگر وہ کلیۃً اسلامی، عربی علم الہیئت کی روایات کا متبع تھا، اور اپنی مساعی کو الغ بیگ کی سرگرمیوں کا تسلسل سمجھتا تھا"[2]

لیکن سوال الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کے " Influence " اور الغ بیگ کی سرگرمیوں کے تسلسل کی نوعیت کا ہے۔

سقوط بغداد کے بعد محقق طوسی نے دیگر علوم عقلیہ کی طرح علم الہیئت کی بھی تجدید کی، ان کی مرتب کردہ "زیج ایلخانی" نے بعد کی زیجوں کے لئے نمونۂ عمل کا کام دیا، "زیج ایلخانی" میں تمہید کے بعد چار مقالے ہیں: پہلا تواریخ (Calendar) پر، دوسرا حرکات کواکب و اوضاع ثوابت پر، تیسرا "معرفت اوقات و طوالع" پر اور چوتھا "اعمال نجومی" پر، کوئی دو سو سال بعد الغ بیگ نے بھی اپنی زیج جدید گورگانی" میں اسی تقسیم کو ملحوظ رکھا، صرف پہلے اور دوسرے مقالہ کی ترتیب بدل دی، چنانچہ "زیج الغ بیگ" بھی چار مقالوں پر مشتمل ہے بترتیب ذیل :

---

[1] G.R.Kaye: P.69

[2] Joseph Needham: Science and Civilization in China Vol. III. P. 300

پہلا مقالہ "معرفت تواریخ" میں، دوسرا مقالہ "معرفت طالع ہر وقت" میں، تیسرا مقالہ "روشِ سیارگان ومواضعِ ایشاں" میں، اور چوتھا مقالہ "بقیہ اعمالِ نجومی" میں۔

بعد میں "زیچ الغ بیگ" ہی کی تقسیم وترتیب کو ملا فرید منجم نے "زیچ شاہجہانی" میں ملحوظ رکھا ہے، اس میں بھی چار مقالے ہیں: پہلا "معرفت تواریخ" میں، دوسرا "معرفت اوقات وطالع اوقات" میں، تیسرا "حرکت سیارات واوضاع ثوابت" میں، اور چوتھا "نجوم" میں۔

اسی ہیئتی مواد کو جے سنگھ نے اسی تقسیم وترتیب کے ساتھ "زیچ محمد شاہی" میں اختیار کیا، چنانچہ اس کا بھی پہلا مقالہ "معرفت تاریخ" میں ہے، دوسرا مقالہ "معرفت طالع ہر وقت" میں، اور تیسرا مقالہ "روشِ سیارگان ومواضع اینہا، وطول وعرض وانچہ لازم آنست" میں۔

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نسخہ "زیچ محمد شاہی" میں صرف یہی تین مقالے ہیں اور جس نسخہ سے یہ منقول ہے اس کے بارے میں بھی کاتب نے صراحت کی ہے کہ اس میں اسی قدر مواد تھا اور جلد بھی باقاعدہ بندھی ہوئی تھی[1]۔ معلوم نہیں اس نسخے ہی میں کوئی چوتھا مقالہ نہیں تھا، یا راجہ جے سنگھ ہی نے یہ مقالہ نہیں لکھا، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ سابقہ زیچوں کا چوتھا مقالہ بھی علم الہیئت سے تعلق نہیں رکھتا۔

لیکن غیر معمولی مماثلت "زیچ الغ بیگ" اور "زیچ محمد شاہی" میں ہے، مثلاً دونوں کے دوسرے مقالہ کا موضوع "معرفت اوقات وطوالع" ہے۔ اول الذکر میں بائیس اور ثانی الذکر میں اکیس باب ہیں، اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ "زیچ الغ بیگ" کے دوسرے مقالہ کا پہلا باب "تعدیل ابین السطرین" (Interpolation) پر ہے، مگر جے سنگھ نے اپنی زیچ کے دوسرے مقالہ سے

---

[1] زیچ محمد شاہی ص ۸۱۔ ب "در کتاب شرف خاں صاحب ہمیں قدر مقدار اوراق وجد اول بودند، وزیادہ ازیں نبود، وکتاب ایشاں مجلد بود، یعنی تمام کتاب اصل زیچ محمد شاہی ہمیں قدر است۔"

پہلے باب کے آخر میں اس بحث کا ماحصل لکھ دیا ہے، نیز زیج الغ بیگ کا انیسواں باب سمت قبلہ کی دریافت پر ہے (باب نوزدہم در معرفت سمت قبلہ وانحراف آن[1]) مگر راجہ کے تعصب اور اسلام بیزاری نے اسے اپنی کتاب سے ساقط کر دیا اور مقالہ دوم کے آخر میں ایک اور باب کا اضافہ کر دیا۔

اس صوری مشابہت سے زیادہ مماثلت مواد کی ہے، ضمائر کے اختلاف سے قطع نظر دونوں زیجوں کے اکثر ابواب میں مواد اس درجہ یکساں ہے کہ زیج محمد شاہی کو "زیج الغ بیگ" کا سرقہ نہیں ترجمہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا، اس کی تفصیل تو موجب تطویل ہوگی، وضاحت کے لئے صرف ایک مثال دی جاتی ہے:

"زیج الغ بیگ: مقالہ دوم[2]

باب ہفتم در مطالع خط استواء

و آنرا مطالع فلک مستقیم نیز گویند

جیب تمام قوسے را کہ میان جزء مفروض و نقطۂ اعتدال اقرب باشد، بر جیب تمام میل آں جزء منحط قسمت کنیم، جیب تمام مطالع آں جزء حاصل آید، و بوجہے دیگر جیب قوس مذکور را در جیب تمام میل کلی ضرب کنیم و بر جیب تمام میل نقطۂ مفروض قسمت کنیم، حاصل جیب مطالع باشد

زیج محمد شاہی: مقالہ دوم[3]

باب ششم در مطالع خط استواء۔

و آنرا مطالع مطالع فلک مستقیم نیز گویند

جیب تمام قوسے را کہ میان جزء مفروض و نقطۂ اعتدال اقرب باشد بر جیب تمام میل آں جزء منحط قسمت کنیم، جیب تمام مطالع آں جزء حاصل آید، و بوجہے دیگر جیب قوس مذکور را در جیب تمام میل کلی ضرب کنیم و حاصل را بر جیب تمام میل نقطۂ مفروضہ قسمت کنیم، حاصل جیب مطالع باشد"

---

[1] زیج الغ بیگ ورق ۲۱ ظ [2] زیج الغ بیگ ص ۱۵ ب [3] زیج محمد شاہی ص ۷ ظ.

مزید تفصیل موجب تطویل ہوگی۔

اس کے بعد یہ سوال کسی مزید وضاحت کا مقتضی نہیں رہتا کہ یہ مماثلت جو اتفاقی نہیں ہے "اثرات" کی مصداق ہے یا "تسلسل" کی، یا "نظر ثانی" کی، یا "تجربہ" کی، یا کسی اور چیز کی۔

لیکن جیسا کہ سابق میں مذکور ہو چکا ہے (معارف نومبر ۱۹۷۸ء ص ۳۶۲) ہر چند کہ "راجہ جے سنگھ نے نظری علم الہیئت میں کوئی اضافہ نہیں کیا" تاہم عملی علم الہیئت میں اس کی مساعی علمیہ کا بہت بڑا مقام ہے؛ چنانچہ فاضل مصنف لکھتا ہے:

"یہ بات کہ جے سنگھ نے کوئی نئی ہیئتی دریافت نہیں کی، اس کی سرگرمیوں کی قدر و قیمت کا صحیح اور منصفانہ معیار نہیں ہے، کیونکہ انتہائی قیمتی ہیئتی سرگرمیوں کا بہت بڑا حصہ نئی دریافتوں سے متعلق نہیں ہوتا، اس کا مصرح مقصد تقویم کی اصلاح، گرہنوں کی صحیح پیشین گوئی اور اسی طرح کے دوسرے امور سے متعلق تھا، اور یہ ایسے کام ہیں جن میں انتہائی تاب فرسا محنت درکار ہوتی ہے، پھر بھی عموماً کوئی نمایاں کامیابی نظر نہیں آتی۔"[1]

اس سے بھی کہیں زیادہ اس کی ہیئتی سرگرمیوں کا بڑا مقصد ارصاد اور آلاتِ رصدیہ کی اصلاح و اختراع اور اتقان و تدقیق تھا، اور اس باب میں اس نے دیرپا یادگاریں چھوڑی ہیں، بلکہ راجہ جے سنگھ کو یہ امتیازی شرف حاصل ہے کہ آج جب کہ مشرق میں کسی قدیم رصدگاہ کے آثار ڈھونڈے نہیں ملتے، صرف اسی کی قائم کردہ رصدگاہیں (کم از کم دہلی، جے پور اور بنارس میں) ہنوز برقرار ہیں اور زبان حال سے اپنے بانی کے کمال کی شہادت دے رہی ہیں، اور اگر اس کے ساتھ ہم یہ بھی یاد رکھیں کہ فاضل راجہ نے یہ عظیم عمارتیں بغیر کسی سابق نمونہ کے محض اپنے پیش رو (مسلمان) ہیئت دانوں کی کتابوں کے مطالعہ یا اپنے خداداد ملکۂ ایجاد و اختراع کی مدد سے تعمیر کی تھیں تو ہمیں اسے عباقرۂ روزگار کی صف میں جگہ

---

[1] G. R. Kaye, P. 86,

میں بخل نہیں کرنا چاہیے۔

اس باب میں فاضل راجہ کی ان اختراعی و تعمیری مساعی کا اجمالی خاکہ سابق میں مذکور ہو چکا ہے
۔۔۔ نومبر ۱۹۷۸ء ص ۳۷۲) لیکن اس سلسلہ میں اہم سوال یہ ہے کہ آیا وہ اپنی ان اختراعی و تعمیری
ں میں اپنے پیشروؤں کا رہین منت تھا یا نہیں؟ اور اگر تھا تو کس حد تک؟

فاضل مصنف نے جسے رصدگاہوں کی تعمیر کی تاریخ سے بڑی گہری واقفیت ہے، اس کا جواب
ت میں دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ غیر مبہم الفاظ میں اس کے مآخذ کی نشاندہی بھی کی ہے وہ لکھتا ہے:

"عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جے سنگھ کے آلات (رصدیہ) ان پچھلے آلات (رصدیہ) کی یا تو
بعینہٖ نقل تھے یا براہ راست اصلاح تھے جنھیں الغ بیگ یا اس کے پیشروؤں نیز اس کے بعد
آنے والے ہیئت دانوں نے استعمال کیا تھا۔"[1]

اس کے ساتھ وہ بطور دفع دخل مقدر ایک ممکنہ غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیتا ہے:

"جن آلات رصدیہ کا ذکر (قدیم) ہندو تصانیف میں کیا گیا ہے، ان میں اور جے سنگھ کے
مخصوص آلات رصدیہ (سمراٹ جنتر، رام جنتر، جے پرکاش) میں کوئی امر مشترک نہیں ہے۔"[2]

ساتھ ہی ساتھ وہ غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ جے سنگھ نے اپنے اختراع کردہ مخصوص آلات رصدیہ
کا بنیادی تصور مسلمان ہیئت دانوں سے اخذ کیا تھا:

"اس (راجہ جے سنگھ) کے حجری آلات رصدیہ ان تصورات کے زیر اثر تیار کیے گئے ہیں جو
اس نے (سابق) مسلمان ہیئت دانوں سے اخذ کیے تھے۔"[3]

اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے:

آلات رصدیہ کی کئی قسمیں ہیں، چنانچہ مصنف "جامع بہادر خانی" نے لکھا ہے:

---

[1] G.R. Kaye p. 86 [2] G.R. Kaye. p. 89 [3] G.R. Kaye. p. 89

"واضح باد کہ آلات رصدی دو گونہ است:

یکے آنکہ صغیر الحجم بود و نصف قطرش زیادہ از ذراع نباشد و از روئے آں اعمالِ رصدی بوقتے از اوقات حال بالتقریب معلوم کنند، اما ضبط حرکات کواکب برائے زمانہ مدید مستقبل از روئے آں متعذر باشد و مشہور ترین ہمچو آلات کرۂ مصنوعہ واسطرلاب و ربع مجیب است۔

دوم آنکہ کبیر الحجم باشد و محیطش باجزائے ادون درجہ تقسیم پذیرد، و از روئے رصد اتفاقات حال بتدقیق و ہم ضبط حرکات و تعیین اوضاع کواکب بزمانہ مستقبلہ مفروضہ تواں کرد، و مشہور ترین ہمچو آلات ذات الحلقتین، لبنہ، سدس فخری، حلقۂ اعتدالی، حلقۂ شاملہ انقی، ذات الحلق، ذات الشعبتین، ذات الشقتین است[1]"

لیکن ان دو قسموں کے علاوہ ایک تیسری قسم اور بھی ہوا کرتی تھی جنھیں (Masonary) یا حجری و جصّی (Instruments of Stone and Lime) کہتے ہیں، ان کی اختراع کا موجب اہل ہیئت کا دھات کے بنے ہوئے آلات سے بے اطمینانی و مایوسی تھا کیونکہ ان (دھات کے بنے ہوئے آلات) کی مدد سے مطلوبہ صحت و تدقیق حاصل نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا وہ مجبور ہوئے کہ غیر معمولی طور پر بڑے آلات بنائیں، المقریزی نے ایک ہیئت داں کا قول نقل کیا ہے کہ کاش وہ اتنا بڑا دائرہ بنا سکتا جس کا ایک سرا اہرام پر اور دوسرا جبل مقطم پر ہوتا کیونکہ جتنا بڑا آلۂ رصدیہ ہوتا ہے اتنے ہی صحیح اور دقیق مشاہدات حاصل ہوتے ہیں، چنانچہ ابو الوفاء البوزجانی کے "ربع تام" (Quadrant) کا نصف قطر ۲۲ فٹ تھا، حامد بن خضر الخجندی کے "سدس فخری" کا نصف قطر ۲۰ فٹ تھا، غالباً ایسے ہی عظیم القطر آلات رصدگاہ مراغہ میں ہوں گے اور انہی کے انداز پر الغ بیگ کی رصدگاہ سمرقند کے آلات بنائے گئے تھے، موخر الذکر کے ربع (Quadrant) کا نصف قطر بقول لی بان اتنا بڑا تھا جتنا کہ جامع ایا صوفیا کے

[1] مولانا غلام حسین جون پوری: جامع بہادر خانی ص ۴۸۰۔

گنبد کی اونچائی ہے یعنی کوئی ایک سو اسی فٹ ممکن ہے یہ بات کچھ مستبعد نظر آئے مگر حال ہی میں رصدگاہ سمرقند کی کھدائی ہوئی ہے، اس میں اس "ربع" کا جو حصہ دستیاب ہوسکا اس کے فوٹو ایک ازبک دانشمند قاری نیازوف نے اپنی کتاب "Astronomicaeskaia Schkola Ulaigbeka" میں شائع کر دئے ہیں، ان فوٹوؤں سے لی بان کے قول کی تصدیق ہو جاتی ہے[1]۔

رصدگاہ الغ بیگ ہی کے انداز پہ یورپی نشأۃ ثانیہ کے ہیئت دانوں نے اپنی اپنی رصدگاہیں بنائیں، اس کی مثال ٹیکوبرے (Tyclo Brahe) کی بنائی ہوئی رصدگاہوں میں دیکھی جا سکتی ہے، بالخصوص اس کی رصدگاہ اوگس برگ (Augsburg) کا "ربع عظیم" (Quadrant) نیز بعد کی رصدگاہ (Uraniborg) کا Mural Quadrant[2].

پھر رصدگاہ مراغہ میں آلات رصدیہ کی ساخت کا جو انداز اختیار کیا گیا تھا اس میں وہی رجحان کارفرما رہا ہوگا جو سابق کے مسلمان ہیئت دانوں ابوالوفاء البوزجانی، حامد الخجندی وغیرہ کا پسندیدہ مشغلہ تھا، اور جو بعد میں رصدگاہ الغ بیگ میں بھی جاری رہا، یہاں (مراغہ میں) بڑی عظیم آلات رصدیہ بنائے گئے ہوں گے اور انہی آلات کے نمونے ہلاکو یا اس کے جانشین نے منگول شاہنشاہ قبلائی خاں کے پاس جمال الدین نام کے ایک ہیئت داں کے ہاتھ چین بھیجے ہوں گے[3]، لہٰذا یہ رجحان (یعنی عظیم آلات رصدیہ کا استعمال) وہاں بھی اثر انداز ہوا جیسے وہاں کی بعض قدیم رصدگاہوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بہرحال چونکہ راجہ جے سنگھ نے رصدگاہ دہلی مسلمان ہیئت دانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے مطالعے کے بعد قائم کی تھی، لہٰذا اس نے بھی کبیر الحجم آلات کی تیاری کی طرف خصوصی . . کی۔

ویسے عمارتی (Masonary) آلات رصدیہ کا رواج (اسلامی) رصدگاہوں میں عام تھا

---

۱ گستاؤلی بان: تمدن عرب، ص ۴۲۲ ۲ Needham Vol III, P. 296 and foot-note

۳ Needham Vol III P. 296 ۴ ایضاً: P. 372

ی کی رصدگاہ (زمانہ پانچویں صدی ہجری کا وسط) اور مراغہ کی رصدگاہ (۶۵۸ تا ۶۷۲ھ) ہیں پہلے
ارتی آلات کی تفصیل تواریخ میں محفوظ ہے، غور کی رصدگاہ اس خاندان کے ایک حکمران امیر عباس نے
سلطان ابراہیم غزنوی کا ہمعصر تھا، تعمیر کرائی تھی، اس کا ذکر منہاج سراج نے "طبقات ناصری" میں
ہے، وہ لکھتے ہیں:

"و در پائے آں کوہ بر بالائے تلے قصر بلند بنا فرمود بدوازدہ برج، و در ہر برجے بصورت برجے از فلک سی دریچہ نہادہ، شش برج شرقی و شمالی و شش برج غربی و جنوبی، و بر ہر برجے صورت برجے از فلک بنگاشت و وضع آں چناں کرد کہ ہر روز خورشید از یک دریچۂ آں درجہ کہ مطلع آں بودے درتافتے، چنانچہ اورا معلوم بودے کہ آں روز آفتاب درکدام درجہ از کدام برج است[1]"

رصدگاہ کے کوئی دو سو سال بعد مراغہ کی رصدگاہ تیار ہوئی، اس کی کیفیت تعمیر میں صاحب "حبیب السیر" نے لکھا ہے:

"خواجہ نصیر الدین ...... در طرف شمالی مراغہ بر زیر پشتۂ رفیع بہ بنائے رصدخانہ اشتغال فرمودہ، مشتمل بر ثمانین اشکال افلاک .... و بر درج دوازدہ گانہ. و آں رصد بر وجہے ساختہ و پرداختہ شد کہ ہر صباح پرتو نیر اعظم از ثقبۂ قبۂ بالا بر سطح عقبۂ می افتاد و درج و دقائق حرکت وسط آفتاب ...... از آنجا معلوم می گشت[2]"

سلسلۂ کلام جاری رکھنے سے پیشتر دو باتیں کہنا ضروری ہیں:

۱. رصدگاہ غور دنیائے اسلام کے ایک انتہائی غیر معروف گوشہ میں تعمیر ہوئی تھی، اس لئے

---

[1] منہاج سراج جوزجانی: طبقات ناصری ص ۳۳۱ (مرتبہ ڈاکٹر عبدالحی حبیبی، نشر کردہ انجمن تاریخ افغانستان، کابل ۱۳۴۲ھ) [2] حبیب السیر ج ۳ جزو اول، ص ۵۹.

اس بات کے فرض کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ اس کی تقلید میں خواجہ نصیرالدین طوسی نے مراغہ میں رصدگاہ قائم کی۔

۲۔ صاحب "حبیب السیر" نے ممکن ہے اپنی تاریخ کی تدوین میں "طبقات ناصری" سے استفادہ کیا ہو لیکن رصدگاہِ مراغہ کی کیفیت تعمیر کے قلم بند کرنے میں "طبقات ناصری" کی عبارت متعلقہ کا سرقہ ناقابل تصور ہے، بالخصوص جب کہ اس کے قیام و تیاری اور کیفیت ارصاد کے متعلق نہ صرف بعد کے ماہرین خصوصی کے کتب و رسائل موجود تھے، بلکہ شاید اس رصدگاہ کے کارکنوں کی یادداشتیں (مثلاً موید الدین عرضی دمشقی کا رسالہ فی کیفیۃ الارصاد .... (لخ) بھی موجود تھیں۔

لہٰذا یہ نتیجہ نکالے بغیر چارہ نہیں کہ عمارتی آلات رصد (Masonsary instruments) کا عام دستور تھا اور سمراٹ جنتر وغیرہ کی تعمیر راجہ جے سنگھ کی جدت اختراع کی مرہون منت نہیں ہے، بلکہ مسلمان ہیئت دانوں نے اس موضوع (آلات رصد کی تیاری) پر جو کتابیں لکھی تھیں ان کے مطالعہ کا نتیجہ ہے، ہاں یہ ممکن ہے کہ راجہ کی جدت پسند طبیعت نے اس میں جزوی تبدیلیاں کی ہوں، مزید تفصیل سردست ناممکن ہے، کیونکہ ان کتابوں کے محتویات ہنوز منظر عام پر نہیں آئے، خود فاضل مصنف (جی۔ آر۔ کاے) نے لکھا ہے:

"عربوں کے بنائے ہوئے کبیر الحجم آلات (رصدیہ) کا تفصیلی بیان نہیں ملتا۔"

ویسے مسلم ہیئت دانوں نے آلات رصدیہ کے موضوع پر وافر سرمایہ چھوڑا ہے۔ اس میں سے چند اہم تصانیف ہندوستان اور یورپ کی لائبریریوں میں ہنوز موجود ہیں، مثلاً:

(۱) رسالہ آلات رصدیہ (رضا لائبریری رام پور) (۲) رسالہ فی صنعۃ الآلات الرصدیۃ (آصفیہ حیدرآباد، حال سنٹرل لائبریری حیدرآباد (۳) رسالۃ الغاذانیہ

G. R. Kaye. p 86

غور کی رصدگاہ (زمانہ پانچویں صدی ہجری کا وسط) اور مراغہ کی رصدگاہ (۶۵۸ھ تا ۶۷۲ھ) ہیں جن کے عمارتی آلات کی تفصیل تواریخ میں محفوظ ہے۔ غور کی رصدگاہ اس خاندان کے ایک حکمراں امیر عباس نے جو سلطان ابراہیم غزنوی کا ہمعصر تھا، تعمیر کرائی تھی۔ اس کا ذکر منہاج سراج نے "طبقات ناصری" میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"و در پائے آں کوہ بر بالائے یکے قصر بلند بنا فرمود بدوازدہ برج، و در ہر برجے بصورت برجے از فلک سی دریچہ نہادہ، شش برج شرقی و شمالی و شش برج غربی و جنوبی، و بر ہر برجے صورت برجے از فلک بنگاشت و وضع آں چناں کرد کہ ہر روز خورشید از یک دریچہ ازاں درجۂ مطلع آں بودے در تافتے، چنانچہ او را معلوم بودے کہ آں روز آفتاب در کدام درجہ از کدام برج است"[1]

رصدگاہ کے کوئی دو سو سال بعد مراغہ کی رصدگاہ تیار ہوئی، اس کی کیفیت تعمیر میں صاحب "حبیب السیر" نے لکھا ہے:

"خواجہ نصیرالدین ...... در طرف شمالی مراغہ بر زیر پشتۂ رفیع بہ بنائے رصدخانہ اشتغال فرمودہ مشتمل بر تمامین اشکال افلاک .... و بر درج دوازدہ گانہ. و آں رصد بر وجہے ساختہ و پرداختہ شد کہ ہر صباح پرتو نیر اعظم از نقبہ قبۂ بالا بر سطح عقبہ می فتاد و درج و دقائق حرکت وسط آفتاب ...... از آنجا معلوم می گشت"[2]

سلسلۂ کلام جاری رکھنے سے پیشتر دو باتیں کہنا ضروری ہیں:

۱. رصدگاہ غور دنیائے اسلام کے ایک انتہائی غیر معروف گوشہ میں تعمیر ہوئی تھی، اس لئے

---

[1] منہاج سراج جوزجانی: طبقات ناصری ص ۴۳۱ (مرتبہ ڈاکٹر عبدالحی حبیبی، نشر کردہ انجمن تاریخ افغانستان کابل ۱۳۴۲ھ) [2] حبیب السیر ج ۳ جزو اول، ص ۵۹.

اس بات کے فرض کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ اس کی تقلید میں خواجہ نصیرالدین طوسی نے مراغہ میں رصدگاہ قائم کی۔

۴۔ صاحب "حبیب السیر" نے ممکن ہے اپنی تاریخ کی تدوین میں "طبقات ناصری" سے استفادہ کیا ہو، لیکن رصدگاہِ مراغہ کی کیفیت تعمیر کے قلم بند کرنے میں "طبقات ناصری" کی عبارت متعلقہ کا سرقہ ناقابل تصور ہے، بالخصوص جب کہ اس کے قیام و تیاری اور کیفیت ارصاد کے متعلق نہ صرف بعد کے ماہرین خصوصی کے کتب و رسائل موجود تھے، بلکہ شاید اس رصدگاہ کے کارکنوں کی یادداشتیں (مثلاً موید الدین عرضی دمشقی کا رسالہ فی کیفیۃ الارصاد ۔۔۔۔ (نخ) بھی موجود تھیں۔

لہٰذا یہ نتیجہ نکالے بغیر چارہ نہیں کہ عمارتی آلات رصد (Masonsary instruments) کا عام دستور تھا اور سمراٹ جنتر وغیرہ کی تعمیر راجہ جے سنگھ کی جدت اختراع کی مرہونِ منت نہیں ہے، بلکہ مسلمان ہیئت دانوں نے اس موضوع (آلات رصدیہ کی تیاری) پر جو کتابیں لکھی تھیں، ان کے مطالعہ کا نتیجہ ہے، ہاں یہ ممکن ہے کہ راجہ کی جدت پسند طبیعت نے اس میں جزوی تبدیلیاں کی ہوں، مزید تفصیل سردست ناممکن ہے، کیونکہ ان کتابوں کے محتویات ہنوز منظر عام پر نہیں آئے، تو دفاضل مصنف (جی۔ آر۔ کاے) نے لکھا ہے:

"عربوں کے بنائے ہوئے کبیر الحجم آلات (رصدیہ) کا تفصیلی بیان نہیں ملتا۔"[1]

ویسے مسلم ہیئت دانوں نے آلات رصدیہ کے موضوع پر وافر سرمایہ چھوڑا ہے، اس میں سے چند اہم تصانیف ہندوستان اور یورپ کی لائبریریوں میں ہنوز موجود ہیں، مثلاً:

(۱) رسالہ آلات رصدیہ (رضا لائبریری رامپور) (۲) رسالہ فی صنعۃ الآلات الرصدیۃ (آصفیہ حیدرآباد، حال سنٹرل لائبریری حیدرآباد (۳) رسالۃ الغازانیہ

---

[1] G. R. Kaye. p 86

فی الآلات الرصدیہ (آصفیہ) (۴) مختصر بیان الرصد (آصفیہ) (۵) شرح رسالہ آلات رصدیہ (آصفیہ) (۶) کتاب تعلیم آلات رصد (برٹش میوزیم) (۷) رسالہ فی کیفیۃ الارصاد وغیرہ (پیرس دارالصوفیا)

مگر اس عاجز کی محرومیٔ قسمت کہ باوجود کوشش فراواں ان نوادرات کی زیارت سے محروم ہے، فالی اللہ المشتکی۔

بہرحال ان ثانوی ماخذوں کی مدد سے فاضل مصنف (جی۔ آر۔ کاے) نے راجہ جے سنگھ کے اپنے اختراع کئے ہوئے آلات رصدیہ کے ماخذ اور ان سے راجہ کے استفادے کی کیفیت بتائی ہے:

ان میں سب سے اہم سمراٹھ جنتر ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ آلات رصدیہ کا شاہنشاہ و سرتاج ہے، جی۔ آر۔ کاے کے خیال میں اس کا ماخذ اولین بروسس Berosus کا نصف کرہ ہے[1]

"The Samrat Yantra might be Considered as a Section in the Plane of the equator of the hemisphere of Berosus"

اسی ساخت کی بنا پر نہ صرف قرون وسطیٰ میں بلکہ عہد حاضر کی ابتدائی صدیوں میں بھی بہت سے "صفائح" (Dails) تیار کئے گئے، برٹش میوزیم میں سترہویں اور اٹھارویں صدی میں بنے ہوئے بہت سے "ڈائل" موجود ہیں، جو اسی اصول پر تیار کئے گئے تھے جس پر سمراٹھ جنتر بنا ہے۔

---

[1] G. R. Kaye P. 87

"سمراٹ جنتر" ساعات مستویہ یا ساعات معتدلہ کی پیمائش کا آلہ ہے۔

ساعات مستویہ کے ارتقاء کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے، اور فاضل مصنف نے اسے ذکر کیا ہے:[1]

قدیم آلات میں طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک کا وقت بارہ برابر حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، ہر حصہ "ساعت" یا "گھڑی" کہلاتا تھا، مگر سال کی مختلف فصلوں میں اس "ساعت" یا "گھڑی" کی مدت مختلف ہوتی تھی، کم سے کم سب سے چھوٹے دن کا بارہواں حصہ اور زیادہ سے زیادہ سب سے بڑے دن کا بارہواں حصہ، اسی نابرابری کی وجہ سے انھیں "ساعات معوجہ" یا "ساعات زمانیہ" کہتے تھے، یورپ میں (Temporal Hours) ظاہر ہے ان میں اوسطاً اس دن کی ساعت ہوگی جبکہ آفتاب نقطۂ اعتدال پر ہوتا ہے، جب وقت پیمائی کے لئے میکانکی طریقے ظہور میں آئے، مثلاً "ریت گھڑی" (Sandglass) "بن گھڑی" وغیرہ تو آفتابی گھڑیوں کی پیمائش کے لئے یہی "ساعات معتدلہ" معیار قرار پائیں، فرانسیسی ہیئت داں ڈی المبرٹ (J. Delambre) کہتا ہے کہ ساعات معتدلہ کی ابتداء مراکش کے ہیئت داں و میقات ساز عبد الحسن (صحیح نام ابو علی الحسن بن علی بن عمر المراکشی) نے کی۔

لیکن المراکشی نے "سیر اظلال" کے لئے رائج الوقت افقی سطح (Horizontal - Plane) کو استعمال کیا تھا، مگر جے سنگھ کے بنائے ہوئے آلہ میں ایک ترچھے نومن —— (Inclined gnomon) کا سایہ ایک مدور قوس پر پڑتا ہے جو دائرۂ معدل النہار کی سطح میں واقع ہے۔

جی۔ آر۔ کاے دوسرے آلہ "جے پرکاش" کے بارے میں لکھتا ہے:[2]

جے پرکاش عملاً بروسس (Brosus) کا نصف کرہ ہی ہے، صرف اس میں تھوڑی سی جدت کی گئی ہے، یہ اجزاء میں منقسم (graduated) ہے اور غالباً

---

۱ G.R. Kaye, P. 87 ۲ ایضاً: ص ۸۶

قدیم مسلمان ہیئت دانوں کے بنائے ہوئے اس آلہ پر مبنی ہے جو "الساطرہ" کہلاتا تھا، اور جس کا ذکر تفصیلی طور پر آلات رصدیہ پر لکھنے والے مصنفین نے کیا ہے۔ ان میں سے بہت سی کتابیں فرانسیسی مستشرق سدیو کی دسترس میں تھیں اور انہی کی مدد سے اس نے اپنی کتاب مرتب کی تھی ("Memoire Sur les instruments astronomique des Arabes")

ان کتابوں میں سے بعض راجہ جے سنگھ کے بھی پیش نظر رہی ہیں جن کا وہ زیج محمد شاہی کے دیباچہ میں حوالہ دیتا ہے:

"چندے از آلات رصدی مانند آنکہ در سمرقند ساختہ بودند از روئے کتب اسلامیاں در اینجا ہم ساخت"[1]

خوش قسمتی سے ان میں ایک اہم کتاب نظام الدین عبد العلی برجندی کی "رسالہ فی آلات الرصد" ہے۔

دو اور آلے جن کی اختراع کو راجہ جے سنگھ کی عبقریت کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے "رام جنتر" اور "دگا سا ینتر" ہیں، مگر جی۔ آر۔ کاے کا خیال ہے کہ یہ مسلمانوں کے وضع کردہ دائرۃ السموت (Azimuth) نیز دائرۃ السموت اور دائرۃ الارتفاع کے مرکب آلہ (Combined Azimuth and Altitude instruments) سے ماخوذ ہیں جنھیں اصل کے مقابلہ میں بہت بڑا اور دھات کے بجائے چونے پتھر سے بنایا گیا ہے[2]

ختم مقال سے پیشتر فاضل مصنف کے ایک دلچسپ انکشاف کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے، وہ لکھتا ہے:

"سائنس کی تاریخ میں ایک عجیب نکتہ قابل غور ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو براہ راست زاویائی پیمائش سے کتراتے تھے اور ان کی ریاضیاتی تصانیف میں زاویوں سے متعلق کوئی قاعدہ یا کلیہ ثابتی نہیں ملتی Indian Mathematics

وہ لکھتا ہے (ص ۲۵۹) ہندوؤں نے زاویہ جیبی یا قوس اور بنیادی مقدار کے لئے کا لفظ بیرونی ملک (یونان) کے Vuria سے حاصل کیا، ممکن ہے یہ دعویٰ عجیب اور مستبعد نظر آئے اس لئے اس کی تائید میں ہم اس چونکا دینے والی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائیں گے کہ ہندو ریاضیات کے اس ترقی یافتہ اور طلائی دور میں بھی جو سوریہ سدھانت کی تصنیف کا زمانہ ہے ہندو فضلاء اپنے حسابات میں زاویوں کا کسی طرح بھی استعمال نہیں کرتے"[3]

---

[1] زیج محمد شاہی ورق ۲ الف [2] G.R.Kaye.p. 87 [3] G.R.Kaye.P. 87 footnote (3)

ابن جُلجُل

ایک مؤرخ طبیب

از

از جناب اطہر ریحان فلاحی طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نام اور پیدائش | ابو داؤد سلیمان بن حسان بن جلجل اندلس کے ایک معزز گھرانے میں ۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے، عبرانی لغت میں جلجل کے معنی جرس کے آتے ہیں، گویا یہ عربی طرز کا ایک لاطینی نام ہے، غالب گمان یہ ہے کہ ان کے جد امجد جلجل فتح اندلس کے بعد مشرف باسلام ہوئے، اس طرز کے اور بہت سے لاطینی نام عربی ترکیب کے ساتھ اندلسی مورخین کے یہاں ملتے ہیں، مثال کے طور پر ابن بشکوال (CPaoc-) ابن فور (Tauro) اور ابن فیرہ (Ferro) قابلِ ذکر ہیں۔

تاریخ کی کتابوں میں ابن جلجل کا بڑا مختصر تذکرہ ملتا ہے، انتہا یہ کہ ابن الآبار کے علاوہ شاید ہی کسی مورخ نے اس کی زندگی کے بیشتر پہلوؤں کو اجاگر کیا ہو، ابن الآبار نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب التکملہ میں ابن جلجل پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور اس کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کا مناسب جائزہ لیا ہے۔ ذیل میں التکملہ سے ایک اقتباس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

حصول علم اور اساتذہ ابن جلجل ۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے، ۳۴۳ھ میں قرطبہ میں حدیث کا درس لیا، اس وقت ان کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی۔ جن اساتذہ سے استفادہ کیا، ان میں ابوبکر احمد ابن الفضل الدنیوری[۱]، ابو الحزم وہب بن مسرۃ[۲]، ابو القاسم الاسعد بن عبد الوارث[۳] وغیرہ

---

[۱] یہ خفاف کے نام سے مشہور ہیں، اندلس کے ایک جید عالم تھے، ۸۲ سال کی عمر میں ۳۴۶ھ

قابل ذکر ہیں، اس کے علاوہ محمد بن یحییٰ رباحی عربی ادب کے استاذ تھے، جن سے سیبویہ کی الکتاب سبقاً سبقاً پڑھی اور ۳۵۸ھ میں اس سے فارغ ہوئے، رباحی کے انتقال کے بعد ابوبکر محمد بن عمر القوطیہ اور ابوایوب سلیمان بن محمد الفقیہ سے اکتساب فیض کرتے رہے، اس سے فراغت کے بعد علم طب کی طرف رجحان ہوا اور وقت کے اساتذۂ فن سے اسے سیکھا، اور ۲۴ سال کی عمر میں ایک صاحب فن طبیب اور حاذق معالج کی حیثیت سے مطلع عالم پر نمودار ہوئے،

ان مشہور عام اساتذہ کے علاوہ بعض ان اصحاب علم وفن کا تذکرہ جن سے اکتساب فیض کا اعتراف خود ابن جلجل نے کیا ہے، دوسرے سوانح نگاروں کے یہاں نہیں ملتا، مثال کے طور پر احمد بن یونس الحرانی جو کہ ابن جلجل کے معاصر ہیں، ابن جلجل نے اپنی کتاب طبقات الاطباء والحکماء میں کئی مقامات پر ان کے حوالہ سے روایتیں نقل کی ہیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۵) میں قرطبہ میں انتقال ہوا (ابن الفرضی ج ۱، ص ۵۹) ۵۰ فقہ و حدیث کے امام تھے، وادی حجارہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۳۴۶ھ میں انتقال ہوا، اندلس کا سفر بھی کیا تھا، (ابن الفرضی، ج ۱، ص ۲۹ ۵۱ قرطبہ میں پیدا ہوئے، حدیث کے اچھے عالم اور استاذ تھے، (حوالۂ بالا ص ۷۰)

۵۲ قرطبہ میں پیدا ہوئے اور مشرق کا سفر کیا، فقہ کے معتبر امام اور ادب کے اچھے استاد تھے، ۳۵۸ھ میں انتقال ہوا، (ابن الفرضی، ج ۲، ص ۳۶۴) ۵۳ اندلس کے ایک مشہور نحوی تھے لغت میں گہری دسترس تھی، تاریخ اندلس کے مصنف بھی ہیں، ۳۶۷ھ میں انتقال ہوا، (ابن الفرضی، ج ۱، ص ۳۷۰) ۵۴ شذونیہ میں پیدا ہوئے، ۳۳۷ھ میں اندلس آئے، نحو اور فقہ کے مستند عالم تھے، ۷۱ سال کی عمر میں ۳۷۱ھ میں انتقال ہوا، (ابن الفرضی، ج ۱، ص ۱۵۹ ۵۵ التکملہ لابن الآبار، ج ۱ ص ۲۹۷،

دوسرے ابوزکریا یحییٰ بن مالک ہیں جو کہ العایدی کے نام سے مشہور ہیں، مشرق میں ایک عرصہ قیام کے بعد جب وہ اندلس واپس آئے، تو ہر طبقہ کے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا، چنانچہ سعید بن عبدربہ کے تذکرہ میں ابن جلجل نے عابدی سے اکتساب علم کا اعتراف کیا ہے" سعید بن عبدربہ نے اپنے بھتیجے کے لئے جو قصیدہ لکھا تھا، وہ عابدی نے مجھے سنایا؛[۵۱]

تیسرے محمد بن عبدون الجبلی ہیں جو کئی برسوں تک مشرق میں قیام کے بعد علم و معرفت کا بیش بہا خزانہ لیکر اندلس واپس آئے تھے، انھوں نے ابن جلجل کو اس سے پوری طرح بہرہ مند کیا، ابن جلجل نے ان کا تذکرہ اپنے شیخ کی حیثیت سے کیا ہے؛[۵۲]

چوتھے ابوحفص عمر بن بریق جو کہ ابن جزار قیروانی کے مشہور شاگرد ہیں، قیروان سے واپسی پر بعض بڑی اہم علمی دستاویزات ابن جلجل نے ان سے حاصل کی تھیں؛[۵۳]

ان لوگوں کے علاوہ کسی استاذ کا ذکر نہ تو خود ابن جلجل نے کیا ہے اور نہ ہی دوسرے مورخین نے۔ ابن جلجل کے چند تلامذہ کا ذکر ملتا ہے جن میں طلیطلی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جو ابن البغونش کے نام سے مشہور ہیں، ابن جلجل کے یہ شاگرد رشید طلیطلہ کے رہنے والے تھے ابن جلجل سے علم طب کا حصول کیا، اور ۴۴۴ھ میں انتقال ہوا؛[۵۴]

علم و اخلاق صاعد اور تفقطی کی کتابوں میں ابن جلجل کے اخلاق و کردار اور علم اور فضل کے متعلق مختصر اور غیر مربوط بیانات کے سوا کچھ نہیں ہے، یہی حال دوسرے مورخین کا بھی ہے لیکن بیشتر سوانح نگار اس کے علم و فضل، حسن اخلاق، وضعداری اور سنجیدگی کے معترف ہیں، ابن ابی اصیبعہ نے بھی اگرچہ بہت مختصر لکھا ہے لیکن پھر بھی عام روش سے ہٹ کر بعض بڑے اہم نصوص قلمبند کئے ہیں، اور یہ تمام نصوص دیسقوریدوس کی کتاب الحشائش میں لکھے گئے ہیں، ابن جلجل کی

---

۵۱ طبقات الاطباء ص ۱۰۵ ۵۲ ایضاً ص ۱۱۵ - ۵۳ ایضاً ص ۶۱،

۵۴ طبقات ابن ابی اصیبعہ، ج ۲ ص ۹۴

تفسیر کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں جن سے ابن جلجل کی مہارت فن حسن اخلاق اور معیاری زندگی کا پتہ چلتا ہے خاص طور سے اس کی لاطینی زبان سے علمی سرمایہ کو عربی میں منتقل کرنے کی اہم خدمات کا اندازہ ہوتا ہے، ابن جلجل نے نہ صرف یہ کہ فن طب اور طبیبوں کے متعلق اہم کتابیں لکھیں بلکہ اسے معالجات پر بھی عبور تھا، مفردات اور صیدلہ کا بھی ماہر تھا، ابن ابی اصیبعہ نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے،

کان طبیباً فاضلاً خبیراً بالمعالجات	ابن جلجل ایک فاضل طبیب اور بہترین
جیّد التصرف فی صناعۃ الطبّ	معالج تھا، اسے صیدلہ میں بھی اچھی
کان فی ایام ھشام بن الحکم	مہارت تھی، وہ ہشام بن الحکم کے
خدمہ بالطب، ولہ بصیرۃ	عہد میں اس کا طبی مشیر بھی رہا تھا،
واعتناءً بقوی الادویۃ المفردۃ	مفردات کے خواص واثرات سے
یعتبر ابن جلجل اول مورّخ	بھی اسے پوری واقفیت تھی، ابن
اسلامی استفاد من الترجمۃ	جلجل پہلا اسلامی مورخ طب مانا
العربیۃ ونقل منھا فی کتابہ	جاتا ہے جس نے عبرانی ترجموں سے
بعض النصوص،[۵۱]	براہ راست استفادہ کیا، اور بعض
	گراں قدر نصوص بھی نقل کئے،

جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے معالجات اور فن دوا سازی میں اس کی مہارت کے اعتراف کے ساتھ بڑے واضح الفاظ میں بیان کیا کہ مفردات کے افعال وخواص کے متعلق بھی اس کو بہت ٹھوس اور حقیقی واقفیت تھی اس کا ثبوت مفردات پر

---

[۵۱] طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ ج ۲ ص ۴۶،

لکھی گئی اس کی کتابیں ہیں، جن کا ذکر اپنے محل پر آئے گا، مورخ جرجی زیدان نے بھی اُس کا گیا وشناس کہہ کر ذکر کیا ہے۔[ل]

اس سے قطع نظر کہ ابن جلجل موید باللہ کا طبیب خاص تھا، اور دربار خلافت میں اس کی بڑی رسائی تھی، وہ ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، درباری ہونے کے باوجود بھی اس نے اپنے خاندانی وقار کو مجروح نہ ہونے دیا تھا، وہ بے جا خوشامد پسند نہیں تھا، تاریخ و سیر کی کتابوں میں کوئی ایسا واقعہ میری نظر سے نہیں گذرا جس سے اُس کا حسن کردار مجروح ہوتا ہو وہ ایک باعزت اور شریف انسان تھا، دنائت و پستی یا پیشہ ورانہ رنگ اس کی زندگی کے کسی پہلو میں نہیں دیکھا جا سکتا، طبابت کے معزز پیشے کو اُس نے محض کھانے کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا تھا، بلکہ خدمتِ خلق کو اپنا فرض سمجھتا رہا تھا، یہی وجہ ہے کہ بیشتر مورخین اس کی عظمت مرتبت کے معترف ہیں۔

تاریخ وفات اکثر سوانح نگار اس سلسلے میں بالکل خاموش ہیں، البتہ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ ابن جلجل کی وفات ۳۷۲ھ کے بعد کسی قریبی سال میں ہوئی، اسی سال اس نے اپنی کتاب تفسیر اسماء الادویۃ المفردہ تصنیف کی، حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے، کیونکہ ۳۷۷ھ میں اس نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف طبقات الاطباء والحکماء مکمل کی تھی۔

ابن الآبار کی روایت ہے:

"والف حسناً باحسنا فی طبقات الاطباء والحکماء وفرغ منه فی سنة سبع وسبعین وثلاثمائة"[۲]

ل تاریخ التمدن الاسلامی از جرجی زیدان ترجمہ فارسی ص ۵۹۰۔

۲ التکملہ ج ۱ ص ۲۹۔

قول اللہ کر روایت کی تصدیق عمر رضا کحالہ کے قول "کان حیا الی ۳۷۷ھ" سے بھی ہوتی ہے[1] ...... یہی بات بغدادی نے بھی لکھی ہے، "المتوفی فی حدود ۳۷۷ھ"[2] لیکن تعجب ہے کہ مورخین نے طبقات الاطبا، والحکما کے سال تالیف کو کیسے نظر انداز کردیا، اس ضمن میں یہ چیز بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے، کہ ابن جلجل کے شاگرد رشید سعید بن محمد الطلیطلی جو کہ ابن البغونش کے نام سے مشہور ہیں، انھوں نے ابن جلجل سے اکتساب فیض کے لئے قرطبہ کا سفر کیا تھا، ان کی پیدائش ۳۶۹ھ میں ہوئی تھی اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد زیادہ سے زیادہ پندرہ سال کی عمر میں حصول علم طلب کے لئے سفر کیا ہو تو بھی ۳۸۴ھ سے قبل ابن جلجل سے کسب علم ناممکن ہے، ابن البغونش کے اس سفر کا ذکر دیگر مورخین کے علاوہ قاضی صاعد اندلسی، ورابو محمد ابن حزم نے بھی کیا ہے،[3]

ان تفصیلات کی روشنی میں وفات کی کسی متعین تاریخ کا ذکر نہ کرکے بس اتنا ہی وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ابن جلجل نے ۳۸۴ھ کے بعد کسی سال میں وفات پائی، کیونکہ اس کے بعد نہ تو اس کی کسی تصنیف کا پتہ چلتا ہے، اور نہ ہی کسی اور ذریعہ سے اس کے زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے

خود نوشت سوانح حیات | ابن جلجل نے اپنی مشہور عام کتاب طبقات الاطبار والحکما کے آخر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے،

"وصفت ایتها الشریف فی آخر هذه الرسالة تادبی و

---

[1] معجم المؤلفین ص ۲۵۸، [2] ایضاح المکنون ج ۲ ص ۸۷،

[3] طبقات الامم ص ۸۰-۸۱

سیرتی وحیث کان طلبی و توخیت الصدق واللہ الشاھد علی ما اقول ولهذا اخلاء هذه الرسالة من ذالك لما فیه من تخلید الذکر وجمیل النشر وباللہ استعین۔[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن جلجل نے ایک ضمیمہ اپنی کتاب طبقات الاطباء والحکماء کے آخر میں بطور تتمہ شامل کر دیا تھا، جس میں اُس نے اپنی زندگی، تعلیمی سرگرمیاں اخلاق وعادات، اور خاندانی امور پر روشنی ڈالی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ حصہ ہم تک نہ پہونچ سکا، اور بے احتیاطی کی نذر ہو گیا، کیونکہ موجودہ شائع شدہ کتاب میں یہ حصہ موجود نہیں ہے،

صاعد ابن ابی اصیبعہ اور قفطی وغیرہ نے طبقات الاطباء سے خوب خوشہ چینی کی ہے اور اُس کے حوالہ سے بیشتر اندلسی اطباء کے حالات قلمبند کئے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس ضمیمہ کا ذکر نہیں کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ انھیں وہ خود نوشت سوانح ملی ہی نہ سکی، ورنہ ابن جلجل کے حالات کو تشنہ اور غیر مرتب چھوڑ کر آگے نہ بڑھ جاتے،

اس کے باوجود بھی اُن کی خود نوشت سوانح عمری سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا، ابن الآبار نے "التکملہ"[2] میں نہ صرف اس کا ذکر کیا ہے، بلکہ بعض اقتباسات بھی اس کے

---

[1] طبقات الاطباء ص ۱۱۶

[2] التکملہ ج ۱ ص ۲۹۸،

حوالے سے درج کئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ابن الآبار طبیب موصوف کے سب سے مفصل سوانح نگار ہونے کے باوجود تاریخ وفات کی تعیین نہیں کر سکے ہیں، اگر اُن کے پیش نظر خود نوشت سوانح کے علاوہ کوئی اور ماخذ ہوتا تو وہ تاریخ وفات بھی لکھتے لیکن کسی خود نوشت سوانح میں تاریخ وفات کا ذکر ناممکن ہے،

اس سوانح حیات کی تصدیق ایک اور چیز سے بھی ہوتی ہے، وہ یہ کہ ابن الآبار نے ابن جلجل کے بڑے بھائی کے تذکرہ کے ضمن میں بعض معلومات کی تصدیق یہ کہہ کر کر دی ہے کہ اسے محمد بن حسان کے چھوٹے بھائی ابن جلجل نے اپنی کتاب طبقات الاطبار میں بیان کیا ہے، حالانکہ محمد بن حسان طبیب نہیں تھے، پھر طبقات الاطبار میں اُن کا ذکر کیونکر آیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود نوشت سوانح کا باب جو اس کتاب کے آخر میں شامل تھا، اس میں اُن کا تذکرہ تھا، نہ کہ اصل کتاب میں، ابن الآبار نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ اپنے بھائی کا تذکرہ ابن جلجل نے اپنے اساتذہ کے ضمن میں کیا ہے،

تصنیفی کارنامے | (۱) **طبقات الاطباء والحکماء** :- ابن جلجل کی یہ معرکۃ الآرا تصنیف ۳۷۷ھ میں منظر عام پر آئی، اُس کی تالیف میں اُس نے ابو معشر بلخی کی کتاب الالوف سے کافی استفادہ کیا ہے، اور اہم مراجع کی حیثیت سے جگہ جگہ اس کا حوالہ بھی دیا ہے، اس کے علاوہ اسپینی مؤرخ باولوس اروسیوس کی کتاب ہروشیوش پادری اور یرونیم کی کتاب القروانقہ جس میں قدیم تاریخی واقعات درج ہیں، بشیر الاقبیلی المطران کی الاصول والاشتقاق بھی اس کے مراجع میں داخل ہیں،[1]

---

[1] مقدمہ طبقات الاطبار والحکماء از فواد رشید،

کتاب میں مندرج حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارسطو کی کتاب السیاسۃ، بقراط کی عہد بقراط، افلاطون کی النوامیس، جالینوس کی الامراض العسرۃ، قاطاجانس کی الادویۃ الطبیہ اور ینبغی للطبیب ان یکون فیلسوفاً وغیرہ ایک عرصہ تک اس کے مطالعہ میں رہی ہیں، اور اپنی کتاب کی تالیف میں اس نے ان اہم مراجع سے بڑی مدد لی ہے۔ الکندی وغیرہ سے بھی استفادہ ثابت ہے[1]۔

اس کے علاوہ یحییٰ بن اسحاق کے حوالہ سے بھی اس میں بہت سی حکایات مذکور ہیں۔

یہ کتاب بعد کے مورخین کے مراجع میں داخل ہے اور اسے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، ابن الآبار، قفطی ابن ابی اصیبعہ، صاعد اور حاجی خلیفہ وغیرہ نے بہت سے واقعات اس کتاب کے حوالہ سے ذکر کئے ہیں، قفطی نے تو اپنی کتاب میں، اسے زائد جگہوں پر مختلف تذکروں کے ضمن میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

ان مذکورہ مورخین کے علاوہ بغدادی نے ایضاح المکنون میں[2]، ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں[3]، حمیدی نے جذوۃ المقتبس میں[4]، احمد عیسیٰ نے معجم الاطباء میں[5]، احمد بن یحییٰ نے بغیۃ الملتمس[6] میں اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔

---

۱ طبقات الاطباء: ص ۳۹ بضمن ذکر اقلیدس

۲ ص ۵۶۱ ۳ ج ۲، ص ۸۰ ۴ ص ۲۱۹ ۵ ص ۲۰۷۔

۶ ص ۲۸۵۔

ابن جلجل پہلا اندلسی طبیب اور مورخ طبیب ہے جس نے تاریخ طب پر پہلی اتنی جامع اور مربوط کتاب لکھی۔ اس موضوع پر اس سے قبل بھی کئی مصنفین نے قلم اٹھایا لیکن ان کے کام کی نوعیت بے حد محدود ہے، ان میں حنین بن اسحاق متوفی ۲۶۰ھ، یعقوبی ۲۸۴ھ، اسحاق بن حنین متوفی ۲۹۸ھ صاحب نوادر الاطباء، المسعودی متوفی ۳۴۶ھ، زکریا رازی متوفی ۳۱۳ھ، ابن الندیم متوفی ۳۸۰ھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حنین بن اسحاق کی کتاب تاریخ الحکماء والاطباء کا شمار تاریخ الاطباء میں ہوتا ہی نہیں اس لئے کہ اس میں محض کچھ حکیموں اور فلسفیوں کے فرمودات، مقولے، اور ان سے متعلق چند حکایات جمع کر دی گئی ہیں، یعقوبی کی تاریخ خالص اطباء کی تاریخ وسوانح پر مشتمل نہیں ہے، البتہ بہت سے مشہور طبیبوں کے تذکرے اس میں ضرور مل جاتے ہیں، امام رازی کی تاریخ "سیرۃ الحکماء" کا ذکر صرف ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے، جبکہ یہ کتاب کہیں موجود نہیں ہے، اگر اس کا کہیں وجود ہوتا تو دوسرے مورخین بھی ضرور ذکر کرتے، ہوسکتا ہے کوئی مقالہ اس موضوع پر امام موصوف نے لکھا ہو اور مخطوطہ یا اس کی نقل ابن ابی اصیبعہ کو مل گئی ہو اور اس کو انھوں نے کتابچہ تصور کرتے ہوئے ان کی کتابوں میں شمار کر دیا ہو، جسے بہرحال تاریخ طب کے موضوع پر کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں کہا جا سکتا، المسعودی کی کتاب التنبیہ والاشراف بھی خاص طور سے اطباء کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں پر مخصوص نہیں ہے، ابن الندیم کی "الفہرست" کا بھی یہی حال ہے، یہ بھی طبیبوں کی زندگیوں پر ہی مشتمل نہیں ہے، اتنا ضرور ہے کہ اس میں بہت سے اطباء کے تذکرے موجود ہیں، ان وجوہ کی بنا پر مذکورہ کتابوں اور ان کے مصنفین کو ابن جلجل پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، اس میں شک نہیں کہ اسحاق بن حنین اسلام کے سب سے پہلے مورخ طب شمار ہوتے ہیں، اور انھوں نے تاریخ الاطباء والحکماء نام کی ایک کتاب بھی لکھی ہے، لیکن چونکہ اس کا تعلق ماقبل اسلام کے اطباء اور ان کے حالات سے ہے اس لئے اس کا موازنہ بھی

ابن جلجل کی اس تالیف سے کرنا غلط ہے، گویا ابن جلجل سے پہلے طبقات کے طرز پر کوئی بھی تاریخ اطبا نہیں لکھی گئی تھی، اس کمی کا احساس خلیفۂ وقت کو بھی تھا اور اس کے مطالبہ پر ہی ابن جلجل نے یہ کتاب تالیف کی، اس کا ذکر ابن جلجل نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

ذکرت انک لم تر احدا من المتقدمین فی ذلک کتابا مرتبا ولا کلاما مقنعا مشبعا فصادفت منی نشاطا الی تقیید ما سألت[1]۔

۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر فواد رشید[2] نے اس مخطوطہ کو ایڈٹ کر کے ایک پُر مغز مقدمہ کے ساتھ پہلی بار شائع کیا، اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ادوار کے لحاظ سے طبقات کی تشکیل میں بڑے اختصار و ایجاز سے اطباء کے حالات قلمبند کئے ہیں، ضروری باتوں کے علاوہ قافیہ آرائی یا نثر نگاری سے قطعاً احتراز کیا ہے اور ہر طبیب کی خاص مہارت یا امتیازی نشان ہی کا ذکر کیا ہے، ان کی کتابوں اور ذاتی حالات بھی لکھے ہیں، بعض فلسفیوں کے تذکرے بھی آ گئے ہیں، لیکن بہرحال تاریخ کی دوسری کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی طبیب تھے، البتہ ایسا ضرور ہے کہ وہ طبیب کم، فلسفی زیادہ رہے ہوں، اس کتاب سے ہر طبیب کے بارہ میں مختصر حالات اور اس کے علمی و تصنیفی کارناموں کا ایک نظر میں اندازہ ہو جاتا ہے۔

مورخین کے درمیان اس کتاب کے نام کے سلسلے میں اختلاف رائے ہے، بیشتر مورخین نے اسے مختلف ناموں سے ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ جس نسخہ کو ڈاکٹر فواد رشید نے ایڈٹ کیا ہے، اس کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ اس پر کوئی نام نہیں درج تھا، بلکہ سرورق کے بغیر ہی کتاب شروع ہو گئی تھی، اس میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ سرورق غائب ہو گیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مؤلف نے قصداً

---

[1] طبقات الاطباء والحکماء ص ۱ [2] ڈاکٹر فواد رشید ازہر یونیورسٹی کی لائبریری میں شعبۂ مخطوطات کے انچارج رہے ہیں، انھوں نے کئی کتابیں ایڈٹ کی ہیں

ایسا کیا ہو، اول الذکر خیال زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ اکثر مورخین نے اس کا نام نفس مضمون سے استنباط کر کے لکھا ہے:

حتی ان النسخة التی اعتمدنا علیها فی نشر الکتاب لاتقدم لنا اسما صریحا فقد خلت من صفحة العنوان وبدأت بمتن الکتاب مباشرة ولست ادری ان کانت ورقة العنوان من النسخة ام انها فعلاً خلوا منه۔[1]

چنانچہ ابن ابی اصیبعہ نے اس کتاب کے متعلق بس اتنا لکھا ہے:

کتاب یتضمن ذکر شیئ من اخبار الاطباء والفلاسفة[2]

قفطی نے بھی کوئی متعین نام لئے بغیر صرف یہ لکھا ہے:

له تصنیف صغیر فی تاریخ الحکماء ولم یشف منه علیلاً۔[3]

ابن جلجل کی حکماء کی تاریخ پر ایک بہت مختصر کتاب ہے جس سے تشفی نہیں ہو سکتی، صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ ابن ابی اصیبعہ اور ابن جلجل دونوں نے طبقات الاطباء لکھی ہے، ابن حزم نے اپنے ایک مضمون "فضائل علماء اندلس" میں ابن جلجل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "ابن جلجل کی ایک تصنیف اخبار الاطباء ہے"[4] احمد بن یحییٰ نے بھی ابن جلجل کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ اس کی ایک کتاب "اخبار الاطباء بالاندلس" ہے:

سلیمان بن حسان بن جلجل مذکور بالطب والادب له کتاب فی اخبار الاطباء بالاندلس۔[5]

لیکن ایسا لگتا ہے کہ یا تو احمد بن یحییٰ نے ابن جلجل کی یہ کتاب دیکھی نہیں اور یہ فرض کر لیا کہ چونکہ وہ اندلسی

---

[1] مقدمہ طبقات الاطباء از فؤاد رشید [2] طبقات ابن ابی اصیبعہ ص ۴۸ [3] "تاریخ الحکماء" ص ۱۹۰۔
[4] نفح الطیب ج ۲، ص ۱۱۹ [5] بغیة الملتمس ص ۲۸۵۔

مورخ طبیب ہے' اس لئے تاریخ طب پر لکھی گئی اس کی کتاب اندلسی اطبار کے حالات زندگی پر ہی ہوگی' حالانکہ امر واقعہ اس کے برعکس ہے، اس لئے کہ اس میں ابن جلجل کے عہد سے پہلے کے تمام ہی اطبا کا طبقات کے اعتبار سے ذکر ہے، یا یہ کہ اس نام کی کوئی اور کتاب بھی ہو جس کا ذکر بہر حال ان کے علاوہ کسی نے نہیں کیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابن جلجل نے اپنی کتاب کا کوئی متعین نام دیا ہی نہیں تھا؟ ڈاکٹر فؤاد رشید کے مطابق اب یہ بات مختلف قرائن سے صاف ہوگئی ہے کہ "طبقات الاطبار والحکما" خود اس کا اپنا دیا ہوا نام ہے، انھوں نے جو چند دلائل دئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) کتاب کے موضوع اور اس کی ترتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اطبار کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں کا تذکرہ ہے، اور ان کو ۹ طبقات میں زمانہ کے لحاظ سے تقسیم کر دیا گیا ہے' جو اسم با مسمٰی کی دلیل ہے۔

(۲) ابن الآبار نے ابن جلجل کی خود نوشت سوانح حیات کا جو اقتباس نقل کیا ہے، اس میں "طبقات الاطبار" کا تذکرہ ہے، ابن الآبار نے لکھا ہے کہ یہ نام ابن جلجل نے ہی رکھا ہے۔

(۳) ابن الآبار نے محمد بن حسان کے حالات زندگی قلمبند کرتے ہوئے بعض واقعات نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ابن جلجل نے اپنی کتاب "طبقات الاطبار" میں اسے بیان کیا ہے۔

(۴) اصبغ بن یحییٰ طبیب کے تذکرہ میں ابن الآبار نے بعض اہم نصوص اس کی زندگی سے متعلق لکھے ہیں، اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ابن جلجل نے اپنی "طبقات الاطبار" میں بیان کیا ہے۔

(۵) تیسری چوتھی صدی ہجری میں طبقات کے طرز پر تاریخ وسیر کی کتابیں لکھنے کا عام رواج تھا یا پھر حروف تہجی کے اعتبار سے کتابیں تصنیف کی جاتی تھیں، ابن جلجل کے ایک معاصر ابو بکر الزبیدی متوفی ۳۷۹ھ نے نحویوں کی تاریخ مرتب کی تھی اور اپنی کتاب کا نام "طبقات النحویین واللغویین"

رکھا تھا[1]

اس طرح اب یہ بات نہایت قرین قیاس ہے کہ ابن جلجل نے اپنی کتاب کا نام خود ہی طبقات الاطباء والحکماء رکھا تھا لیکن بعد میں مسودہ سے سرورق غائب ہو جانے کی وجہ سے مورخین کو کتاب کا اصل نام نہ معلوم ہو سکا، لیکن ابن الآبار جنھوں نے ابن جلجل کی خود نوشت سوانح عمری دیکھی تھی ان کی اس بات میں بڑا وزن ہے کہ اس نے اپنی کتاب کا نام طبقات الاطباء رکھا تھا[2] جس کی تائید صاحب کشف الظنون نے بھی کی ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے ابن جلجل اور ابن ابی اصیبعہ دونوں ہی نے طبقات کے طرز پر اطباء کی سوانح عمری مرتب کی ہے، یہ دونوں بھی اسی نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

(۲) تفسیر اسماء الادویۃ المفردۃ من کتاب دیسقوریدوس

ابن جلجل نے یہ کتاب ۳۷۲ھ میں موید باللہ کے عہد میں تصنیف کی[3] ۳۳۷ھ میں شہنشاہِ قسطنطنیہ ارمانیوس نے خلیفہ عبدالرحمن کو بہت سی کتابیں ہدیۃً بھیجی تھیں، ان میں دیسقوریدوس کی کتاب الحشائش کا بھی ایک نسخہ تھا، لیکن اغریقی زبان میں ہونے کی وجہ سے اس سے استفادہ ممکن نہیں تھا، چنانچہ خلیفہ موصوف کے مطالبہ پر ارمانیوس نے نیقولا راہب کو بطور مترجم قرطبہ بھیجا، اس سے قبل خلیفہ جعفر المتوکل کے عہد میں کتاب الحشائش کو اصطفن بن بسیل نے اغریقی سے عربی میں منتقل کیا تھا، جسے بعد میں یوحنا بن ماسویہ کے شاگرد رشید حنین بن اسحاق نے ترمیم و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا تھا، لیکن اب بھی اس میں بڑا سقم تھا، بعض اغریقی ناموں کو عربی میں منتقل کرنے میں دونوں ہی ناکام رہے تھے۔

چنانچہ راہب نے اصطفن کے ترجمے کے تشریح طلب مواقع اور نامعروف الفاظ کی تحقیق و ترجمہ کا کام شروع کیا، ابھی ترجمہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ راہب کا انتقال ہو گیا، ابن جلجل دربار خلافت میں اپنی

---

[1] مقدمہ طبقات الاطباء والحکماء فواد سید [2] التکملہ لابن الآبار بضمن تذکرہ ابن جلجل [3] طبقات ابن ابی اصیبعہ ص ۴۸۔

بہونچ کی وجہ سے راہب کے بہت قریب تھے اور بڑی حد تک اغریقی زبان اس سے سیکھ لی تھی،
چنانچہ اس کے انتقال کے بعد اسی کام کو دوسرے مترجمین کے ساتھ انجام دیا[1]

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نسطوری اور یعقوبی عیسائیوں نے سریانی زبان
میں یونانی علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے کئے تھے، اسلامی فتوحات کے بعد انھوں نے ہی سریانی
سے عربی میں ان کتابوں کو منتقل کیا، لیکن ان ترجموں میں دو عیب بہت زیادہ نمایاں تھے: ایک
تو یہ کہ وہ بالکل ترجمے ہی ترجمے تھے، نہ ان میں ایجاد و اختراع سے کام لیا تھا اور نہ ہی جدید نظریات
و خیالات پیش کئے گئے تھے، دوسرے یہ کہ ترجمے صحت اور دقت نظری کے ساتھ نہیں کئے گئے تھے
بلکہ مترجمین نے کم علمی کی بنا پر ان میں بہت کچھ رد و بدل کر دیا تھا[2]، چنانچہ کتاب الحشائش کے ساتھ
بھی لازمی طور پر یہی کچھ ہوا تھا جس کی وجہ سے کئی بار اس کتاب کے ترجمے کرنے پڑے۔

دیسقوریدس کی کتاب الحشائش میں نہ صرف یہ کہ ابن جلجل کا نام آتا ہے بلکہ اس کی تفسیر و تشریح
مذکورہ کتابی شکل میں پیش کی، افسوس کہ اس کتاب کا تذکرہ تو بیشتر مورخین نے کیا ہے، لیکن یہ کہیں
دستیاب نہیں ہے، غافقی اور ابن بیطار نے مفردات پر لکھی گئی اپنی کتابوں میں ابن جلجل کی اس کتاب
کے حوالے دئے ہیں، ابن ابی اصیبعہ نے ابن جلجل کے اس کتاب پر لکھے گئے مقدمہ کے حوالہ سے
بہت اہم نصوص درج کئے ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔

مورخ جرجی زیدان نے بھی اس کتاب اور ابن جلجل کی مفردات کے سلسلہ میں ٹھوس معلومات
کو بہت سراہا ہے، اس کا اعتراف بھی اس نے کیا ہے کہ بعض جڑی بوٹیاں جو کہ دیسقوریدس کی کتاب
میں مذکور تھیں، ان کی تشریح بھی اس نے کی ہے:

"در ذیل کتاب دیسقوریدس گیاہ ہائے را شرح دادہ کہ قدما آنہا نمی دانستہ اند"[3]

---

[1] مقدمہ طبقات الاطباء [2] حکماء اسلام ج ۱ ص ۸۰ از مولانا عبد السلام ندویؒ [3] تاریخ التمدن الاسلامی ترجمہ فارسی ص ۶۰۵ از جرجی زیدان۔

(۳) مفردات پر ایک اہم کتابچہ | ابن ابی اصیبعہ اور صفدی نے اس مقالہ کا تذکرہ کیا ہے، ان کے مطابق یہ کتابچہ ان مفرد ادویہ کے بیان پر مشتمل ہے جن کا ذکر دیسقوریدوس نے اپنی کتاب الحشائش میں نہیں کیا تھا ابن ابی اصیبعہ نے اس سلسلہ میں ابن جلجل کے اسی مقالہ کا ایک اہم اقتباس بھی نقل کیا ہے:

ان دیسقوریدوس اغفل ذلك اما لانه لم يره ولم يشاهده عياناً واما لان ذلك كان غير مستعمل في دهره وابناء جنسه۔[1]

(دیسقوریدوس نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ خود اس کے مشاہدہ میں یہ ادویہ نہ رہی ہوں، دوسرے یہ کہ اس کے دور میں ان دواؤں کی طبی خصوصیات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہ رہی ہوں۔)

ڈاکٹر فواد رشید نے لکھا ہے کہ "آکسفورڈ لائبریری میں "استدراک علی کتاب دیسقوریدوس" کے عنوان سے ابن جلجل کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے"[2]۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہی وہ مقالہ ہو جس کا ذکر بغیر کسی متعین نام کے ابن ابی اصیبعہ اور صفدی وغیرہ نے کیا ہو۔

(۴) مقالۃ فی ادویۃ التریاق | اس کا تذکرہ بھی صفدی وغیرہ کے یہاں ملتا ہے، فواد رشید کی تحقیق کے مطابق یہ کتابچہ بھی آکسفورڈ لائبریری میں موجود ہے، اس کتاب میں ان کے مطابق بعض مفید اور اہم تریاقات کا ذکر ہے، جس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا[3]، لیکن افسوس کہ ابھی تک یہ کتاب باقاعدہ طور پر منظر عام پر نہ آ سکی جو بہرحال ابن جلجل کے بلند معیار پر لکھی گئی ہوگی اور جس سے طبی دنیا اس تجرباتی اور سائنٹفک دور میں بڑے مفید اور کار آمد مقاصد حاصل کر سکتی تھی۔

(۵) رسالۃ التبیین فیما غلط فیہ بعض المتطبین | یہ رسالہ بھی دستیاب نہیں ہے، البتہ اس کا ذکر مورخین کے یہاں ملتا ہے، ابن ابی اصیبعہ اور صفدی کے بموجب اس رسالہ میں بعض پیشہ ور اطبا کی

---

[1] بحوالہ طبقات ابن ابی اصیبعہ ص ۴۰۸ [2] مقدمہ طبقات الاطباء از فواد رشید [3] مقدمہ طبقات الاطباء از فواد رشید۔

طبیوں اور علمی خامیوں کی طرف نشاندہی کی گئی ہے، یا جو چیزیں پیش رو اطبا سے رہ گئی تھیں، ان کا اضافہ کیا گیا ہے۔

جیسا کہ اوپر گذر چکا احمد بن یحییٰ نے ابن جلجل کو ادیب کی حیثیت سے بھی متعارف کرایا ہے:

"سلیمان بن حسان بن جلجل مذکور بالطب والادب"[1]

تاہم اس کے کسی ادبی شاہکار کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مورخوں اور سوانح نگاروں نے اس فنکار طبیب اور پہلے مسلمان مؤرخ طبیب کو اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑا رہنے دیا، اور اس کے ساتھ بڑی حق تلفی اور ناانصافی کی۔

---

[1] بغیۃ الملتمس ص ۲۸۵ وابن ابی اصیبعہ ص ۴۸۔

شاہ اسد الرحمٰن قدسیؒ

از جناب محمود الرحمٰن صاحب، کراچی

بہت سے انسان موت کے بعد فراموش کر دیئے جاتے ہیں، لیکن بعض اس مرتبے کے ہوتے ہیں کہ ان کی یاد لمحے بھر کو بھی دل سے محو نہیں ہوتی، اور زندگی کے ہر موڑ پر ان کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

ایسی ہی عالی مرتبت ہستیوں میں حضرت شاہ اسد الرحمٰن قدسی علیہ الرحمۃ بھی تھے، طریقت ہو کہ شریعت، قلندری ہو کہ درویشی، علم ہو کہ عرفان، ادب ہو کہ آگہی، فلسفہ ہو کہ حکمت، تفکر ہو کہ تصوف، ہر صنف میں انھیں مقام اولیت حاصل تھا۔

برصغیر پاک و ہند کے تمام اکابر آپ کی فکر و نظر، علم و دانش، تبحر علمی، قلندرانہ شان، حسن اخلاق، شفقت و محبت اور روحانی مقام و مرتبے کے معترف رہے ہیں، ہر مکتبۂ خیال کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر سکون و اطمینان کی دولت سے مستفید ہوتے رہتے ہیں، ہر فکر و تشویش ان کی صحبت میں کالعدم ہو جایا کرتی تھی، اور ہر عقدۂ لاینحل اس پیر کامل کی مجلس میں حل ہو جایا کرتا تھا، اور سائل آستانۂ قدسیؒ شاد کام و بامراد لوٹتا تھا۔

آپ کا اسم گرامی ناصر الدین محمد اسد الرحمٰن قدسی تھا۔ آپ کے جد امجد شیخ الاسلام شاہ ابوالمکارم، جن کا سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادقؓ سے ملتا ہے، سبزوار کے رہنے والے تھے، وہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لائے اور قطب الاقطاب حضرت

عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خاندان میں متاہل ہوئے، آگے چل کر اس خاندان میں ایک
ت مشہور بزرگ حضرت شاہ نجف علی گذرے ہیں، جو حضرت شاہ رفیع الدین محدث
ویؒ کے شاگرد و خلیفہ تھے، موصوف کی اہلیہ محترمہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی
یقی بہن تھیں۔ جن سے حضرت شاہ حبیب الرحمٰن پیدا ہوئے۔

آپ کی والدۂ محترمہ علامہ محمد اسحٰق کی دختر تھیں۔ ان کی زبان فارسی تھی، اردو اور پشتو بھی
دلتی تھیں۔ اپنے والد سے عربی پڑھی تھی، اور حافظ کلام اللہ تھیں۔

آپ کی ولادت ۱۲/ رجب ۱۳۰۹ھ بروز دوشنبہ بوقت صبح صادق ہوئی۔ جب آپ
چار سال کے ہوئے تو والدۂ محترمہ نے قرآن مجید پڑھانا شروع کیا، آپ نے جس دن قرآن مجید
ختم کیا، والدہ صاحبہ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رحل پر
قرآن کھولے ہوئے اول سے آخر تک پورا قرآن شریف سنایا اور سرکارؐ نے ایک بڑا تھیلا جس میں
اخروٹ کے برابر کوئی سے بھری ہوئی تھی، عنایت فرمایا۔

چھٹے برس کتابی تعلیم اور اس کے ساتھ روحانی تربیت والد بزرگوار کی زیر نگرانی مسلسل
سات برس تک ہوتی رہی۔ قرآن پاک، تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد
والد نے آپ کو لاہور بھیج دیا۔ جہاں آپ نے پانچ سال تک مقیم ہو کر مختلف علوم و فنون
میں دستگاہ حاصل کی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں درس تعلیم سے فراغت حاصل کر کے بھوپال واپس آئے، اور
روحانی مشاغل کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس دوران والد بزرگوار حضرت شاہ حبیب الرحمٰن
نے جو حضرت کے مرشد طریقت بھی تھے، رحلت فرمائی۔ رخصت سے دو ہفتے پہلے بعد نماز مغرب
حضرت قدسیؒ کو تسبیح، مصلے، کلاہ اور اوراد و وظائف کا قلمی مجموعہ حوالہ کر کے ارشاد فرمایا

مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ تم کو اپنا جانشین مقرر کر دوں۔ میری وفات کے بعد بارہ برس تک مجاہدات میں مشغول رہنا۔ کتاب و سنت کے بغیر کوئی عمل اختیار نہ کرنا۔"

آپ نے اپنے والد ماجد کے حکم پر پوری طرح عمل کیا، اور کامل بارہ سال تک سخت مجاہدے میں مصروف رہے۔ دن بھر روزہ رکھتے۔ شام کو کچھ خرمے اور چائے سے افطار کرتے۔ بقیہ سارا وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا۔ بھوپال کی جس ویران مسجد میں تنہا تین سال کا عرصہ گذارا۔ وہاں ایک پرانا بوریا جس کے سرہانے دو اینٹیں رکھی ہوئی تھیں ایک کمبل، ایک پانی کا گھڑا اور ایک مٹی کا لوٹا تھا، صاحبِ ولایت کا بس یہی اثاثہ تھا۔ اس تمام عرصے میں شب بیداری آپ کا معمول خاص رہا۔

بارہ سالہ مجاہدہ ختم ہونے پر مولانا اشرف علی تھانویؒ نے آپ کو "ولی الاشرف" کا لقب عنایت فرمایا۔ حضرت شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے "حبیب الاولیاء" کے خطاب سے نوازا۔

حضرت قدسی نے ۱۳۵۰ھ میں سفرِ حج اختیار کیا۔ اور مدینہ منورہ میں سرکار دو عالم کے روضے پر حاضری دی۔ وہیں آپ حضرت سید حمزہ رفاعیؒ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضرت ممدوح نے جو ساٹھ سال سے خلوت نشین تھے۔ اپنا تجدید شدہ طریقہ تفویض فرما کر خلعتِ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا کہ "تمہاری امانت میرے پاس محفوظ تھی، اور عرصۂ دراز سے میں تمہارا منتظر تھا۔ الحمدللہ کہ اس بارِ امانت سے جلد سبکدوش ہوا۔ یہ چیز دربارِ نبویؐ سے روحانی طور پر عطا ہوئی"، خواجہ حسن نظامی نے اس خبر کو اپنے اخبار "منادی" مورخہ یکم فروری سنہ ۱۹۴۰ء میں شائع کیا تھا۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو حضرت قدسیؒ سے خصوصی عقیدت تھی، اپنی پیرانہ سالی کے زمانے میں حضرت مرحوم کو خط لکھا کہ

"میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کچھ سکت ہوتی تو حاضر آستانہ ہو کر خدمت کرتا، کیا ہی اچھا ہو کہ آپ یہاں رونق افروز ہو کر باعث خیر و برکت ہوں۔

مولانا کی اس درخواست پر ہمارے مرشد گرامی تھانہ بھون تشریف لے گئے، معزز میزبان نے مقتدر مہمان کو ٹھہرانے کے لئے بستی سے باہر خیمہ گاہ کا بندوبست فرمایا۔ اس میزبانی سے کچھ عرصہ قبل مولانا موصوف کو خواب میں اس جگہ ایک بارونق منظر کا مشاہدہ ہوا تھا، عجب اتفاق، حضرت قبلہ کو یہ جگہ پسند آئی۔ اور ایک فرودگاہ تعمیر کرائی، جس کو مولانا تھانوی نے "آستانۂ قدسی" کے نام سے موسوم فرمایا۔ اور مندرجہ ذیل تاریخی قطعہ لکھا۔ اور اسے ایک سنگ مرمری لوح پر کندہ کرا کر آستانے کی دیوار میں نصب کرا دیا۔

قطعہ

کرد قدسی نزول چوں ایں جا | جستم از دل سن ظہور سرور
گفت دل آستانۂ قدسی | ہم بیفزا "برد تجلی طور"
۶۶۱ ۶۵۸

کتبہ فقیر اشرف علی تھانوی

مولانا ممدوح نے اس دوران یہ وصیت کی تھی کہ جس جگہ حضرت قدسی کا پلنگ بچھا ہے، مجھے وہیں پر دفن کیا جائے۔ چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق ایسا ہی کیا گیا۔

علامہ اقبال کو حضرت قدسی سے خاص عقیدت تھی۔ اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ اقبال کے مرشد حضرت گل حسن شاہ قلندرؒ کو حضرت سے خاص تعلق تھا، نیز ان کے خلیفہ حضرت فضل شاہ قلندر کشمیری آستانہ قدسی پر اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال حضرت مرحوم سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، آپ ہی کی تحریک پر علامہ نے "جواب شکوہ"

جیسی شہرۂ آفاق نظم لکھی تھی، علامہ اقبال نے قیام بھوپال کے زمانہ میں آستانے پر حاضری دی ، اور وہاں کے روح پرور ماحول سے متاثر ہو کر یہ قطعہ لکھا تھا،

چشمۂ فیض تشنہ لب کے لیے ۔۔۔ مرکز رشد بہر اہلِ صفا

کوئی سمجھے تو ہے مقامِ قدس ۔۔۔ آستانہ جناب قدسی کا

قیام پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے پہلے کوئٹہ آئے۔ پھر سندھ کے مقام تھانہ بھولاخاں میں سکونت اختیار کی، پھر وہاں سے کوٹری تشریف لے آئے، یہاں کئی سال قیام کرنے کے بعد بہاول پور تشریف لے گئے، پھر وہاں سے نقل مکان کر کے چکوال آئے۔ سادہ کچھ عرصہ بعد بھون میں ایک وسیع وعریض رقبہ میں آستانہ قدسی کی تعمیر عمل میں آئی۔ اور پھر آپ نے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

افسوس، صد افسوس! اس گراں مایہ ہستی نے ۸۸ سال کی عمر میں آستانۂ قدسی بھون میں ۳ نومبر ۱۹۷۰ء کی شام کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، دوسرے دن جمعہ کو بعد نماز عصر اپنی وصیت کے مطابق آستانۂ قدسی میں مدفون ہوئے۔ مجھ جیسے رُوسیاہ کی زبان اس لائق نہیں کہ ایسی مقدس شخصیت کے لئے دعائے مغفرت کرے۔

امام رازی

استدراک

از منصور نعمانی ندوی رفیق دارالمصنفین

جون و جولائی ۹۰ء کے معارف کی دو قسطوں میں شیخ عبدالقادر عیدروسی کی سوانح خدمات اور تصانیف پر ایک مضمون سپرد قلم کیا گیا تھا، مضمون ختم کرنے کے بعد کچھ مواد اور دستیاب ہوا تھا اور مزید تلاش جاری تھی کہ معارف کے قدر داں جناب ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے تصانیف کے سلسلہ میں کچھ مزید مواد کی نشاندہی کی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے ۲۴ بیس سال قبل عیدروسی کی شہرۂ آفاق کتاب "النور السافر" پر انگریزی میں ایک مضمون تحریر کیا تھا، جو مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی بڑودہ (گجرات) کے ادارۂ شرق شناسی کے سہ ماہی رسالہ میں چھپ چکا ہے، ڈاکٹر صاحب نے ہم کو یہ خبر بھی دی ہے کہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی مرحوم نے "گجرات اور اہل گجرات کا عربی ادب میں حصہ" کے موضوع پر بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ مقالہ طبع نہ ہو سکا، اس کا ایک ٹائپ شدہ نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس مقالہ میں عیدروسی کی تصانیف کی تعداد کتابچوں اور تقریظوں کے ساتھ ۲۴ تحریر کی ہے، ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب دیکھی تو اس میں تعداد ۳۳ ہے، اور ہم نے صرف ۲۰ کتابوں کا تعارف معارف میں کرایا تھا اور کل ۲۸ ہی کتابوں کا حتمی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا، ذیل میں النور السافر، خلاصۃ الاثر، زبید احمد، فہرست بوہار اور ڈاکٹر باقر علی ترمذی کے قلمی نسخہ کی منقولہ بقیہ

سے ہم باقی کتابوں اور اس کے متعلقات کو بطور استدراک درج کرتے ہیں۔

عیدروسی نے النور السافر میں اور محبی نے خلاصۃ الاثر میں تقریظ، رد اور اجازت پر مشتمل کتابچوں کا ذکر کیا ہے مگر ہم نے تصانیف گناتے وقت قصداً ان کو تصانیف میں شامل نہیں کیا تھا، ڈاکٹر باقر علی ترمذی کی فہرست میں یہ کتابیں بھی درج ہیں اسلئے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

۲۹۔ تقریظ علی شرح قصیدہ البوصیری:۔ یہ شیخ الاسلام عبدالملک بن عبدالسلام بن حسین اموی الیمنی الشافعی کی شرح پر ایک تقریظ ہے۔ (النور السافر ص۳۴۲ و خلاصۃ الاثر)

۳۰۔ تقریظ علی رسالۃ البسکری:۔ مصنف نے اپنے شاگرد احمد بن علی البسکری کے اس مضمون پر لکھا ہے جس میں امام مالک کے متعلق ناروا باتیں تحریر کی ہیں، یہ امام مالک کی مدافعت میں ہے۔ (النور السافر ص۳۴۰)

محبی نے اس کا نام "رد علی رسالۃ الشیخ احمد بن محمد بن علی البسکری تحریر کیا ہے (خلاصہ ۲/۴۴۲) اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

۳۱۔ اجازۃ للفقیہ الصالح بن الفقیہ محمد باجابر:۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، عیدروسی نے اپنے عزیز ترین شاگرد باجابر کو روایت حدیث اور بیعت کی اجازت دی۔ (النور السافر و خلاصہ ۲/۴۴۲)

۳۲۔ المقالۃ النافعۃ والرسالۃ الجامعۃ:۔ مصنف نے اپنے بعض قریبی عزیزوں کے اصرار پر اس رسالہ کو لکھا، اس میں مسائل تصوف سے بحث کی گئی ہے۔ اسکا ایک نسخہ بوہار میں اور ایک برلن میں پایا جاتا ہے۔ (فہرست بوہار ۲/۵۰ و زبید احمد ص۳۰۵)

۳۳۔ القول الجامع فی بیان علم النافع:۔ اس کتاب میں مشہور روایت "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ" پر صوفیانہ نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے،

مصنف نے علم سے مراد علم باطن لیا ہے، اس کے قلمی نسخے بوہار اور برلن میں موجود ہیں۔ (فہرست

بوہار ۲/۵۰۸، زبید احمد ص ۳۰۵)

۳۴۔ السلوک الی ملک الملوک :۔ اس میں خدائے مالک الملک کے حضور راہِ طریقت کے ایک مسافر کے جذبات و تاثرات رقم کیے ہیں (مخطوطہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی بمبئی)

۳۵۔ مراسلات عبدالقادر العیدروس و حاتم الاہدل :۔ یہ عیدروسی اور ان کے استاذ حاتم الاہدل کے مکاتیب کا مجموعہ ہے جو صوفیانہ مکالمات پر مشتمل ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ برلن میں ہے (ایضاً) ڈاکٹر زبید احمد نے اس کو "المکاتیب" کا نام دیا ہے۔ (زبید احمد ص ۱۷۴) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ہے کہ "عیدروسی نے حاتم الاہدل کے ساتھ خط و کتابت کو اپنی تصنیف الدر الباسم من روض السید حاتم میں جمع کر دیا ہے"

(دائرۂ معارف اسلامیہ اردو ۳/۵۷۲)

۳۶۔ التعلیقات علی ابیات العیدروسیہ :۔ یہ صوفیانہ سلاسل پر اپنے والد شیخ بن عبداللہ عیدروس (متوفی ۹۹۰ھ) کے ایک منظوم رسالہ پر مفصل سوانحی تعلیق ہے اس کا حوالہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی بمبئی یونیورسٹی نے دیا ہے۔

۳۷۔ رسالۃ فی مناقب البخاری :۔ یہ کتابچہ امام بخاریؒ کی خدمات و مناقب پر ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ بوہار لائبریری نمبر ۳/۴۵۳ پر موجود ہے (بوہار ۲/۵۰۱)

۳۸۔ صفوۃ الصفوہ فی بیان احکام القہوہ :۔ یہ کتابچہ قہوہ پینے کے جواز پر ہے، اس کا ایک مخطوطہ برلن میں ہے (زبید احمد ص ۳۲۶)

۳۹۔ الواسطہ :۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں تصوف کا غیر جانبدارانہ جائزہ ہے مقدمہ میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ پیغمبر خدا اور بنی نوعِ انسان کے درمیان رابطہ کی ایک

وصیاں لکھی تھے، اس کی وضاحت میں مصنف نے اشرف الکلام واکمل تحیۃ السلام کے زیرعنوان ایک تفصیلی بحث کی ہے، اسکا مخطوطہ بھی برلن میں ہے (مخطوطہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی بمبئی)

۴۰۔ رجز:۔ برلن کی اسٹیٹ لائبریری میں مصنف کے دیوان الروض الاریض کے حاشیہ پر ایک نظم ۲۲ اشعار پر رجزیہ بحر میں موجود ہے (زبید احمد ص ۳۰۶ و ڈاکٹر باقر علی ترمذی)

۴۱۔ موشح۔ دو مزید نظمیں ایک موشح میں ہے اور دوسری ۲۰۴ بند کے اشعار پر مشتمل ہے یہ بھی برلن لائبریری میں موجود ہے، نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ حیات انسانی دراصل ایک سفر ہے جس میں آخرت کے لیے زادِ سفر کی فراہمی ہونی چاہئے. اس کے لیے اولین شرط تقویٰ ہے، یہ نظم تقریباً دس حصوں میں ہے. شاعر نے خود ہی اس نظم کی شرح بھی کی ہے، یہ شرح بھی برلن میں موجود ہے (ڈاکٹر باقر علی ترمذی و زبید احمد ص ۳۰۶)

۴۲۔ تحفۃ الغریب فی الصلوٰۃ علی البشیر النذیر:۔ رسولِ خدا پر درود و سلام ہے اور چار ابواب پر منقسم ہے، آخر میں مصنف نے بارگاہ رسالت مآب میں نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے، اس کا واحد نسخہ بانکی پور میں موجود ہے۔ (ڈاکٹر باقر علی ترمذی مخطوطہ بمبئی)

۴۳۔ نفائس الانفاس و نسبۃ الخرقۃ والالباس:۔ یہ ارباب تصوف اور خرقہ پوشی کے مناقب و فضائل پر ہے، اسکا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے، مخطوطہ کا کا نمبر ۸۸-۱۳۳ آر (فہرست انڈیا آفس لائبریری عربی ۲/ ۸، ۱۷ و زبید احمد ص ۳۰۶)

ان سب کتابوں کو ملا کر اب عیدروسی کی تصانیف کی تعداد ۴۳ ہو جاتی ہے، ممکن ہے کتب خانوں کی فہرستوں میں ابھی کچھ اور کتابیں دستیاب ہو جائیں، تاریخ عرب کی میں بھی شاید اس سلسلہ میں کچھ تصانیف کا پتہ چل جائے، مگر یہ ہمارے کتب خانہ میں موجود نہیں ہے،

ڈاکٹر باقر علی ترمذی کی فہرست میں ایک کتاب کا نام نہایۃ الطلب تحریر کیا گیا ہے،
معارف جولائی ۱۹۴۸ء صفحہ ۳۹ پر ہم نے حیدر روسی کی کتاب النور السافر سے اس کا
صحیح نام غایۃ القرب فی شرح نہایۃ الطلب نقل کیا ہے، یہ تصنیف نہیں شرح ہے تفصیل
کے لیے دیکھئے (النور السافر ص ۳۳۹)

معارف کے مذکورہ شمارہ میں تصانیف کے ذیل میں کچھ کتابوں کے نسخوں کی نشاندہی
نہیں کی گئی تھی، اب ان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے، اسکی طرف جناب ضیاء الدین ڈیسائی صاحب نے
توجہ دلائی ہے،

الفتوحات القدوسیہ فی الخرقۃ العیدروسیہ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری
میں موجود ہے،

اتحاف الحضرۃ العزیزہ بعیون السیر الوجیزہ :۔ اس کا نسخہ برلن میں ہے (ڈاکٹر
باقر علی و زبید احمد)

المنہاج الی معرفۃ المعراج ، اس کا نسخہ برلن میں نمبر ۲۰ پر ہے (زبید احمد ص ۳۲۵)

الانموذج اللطیف فی اہل بدر الشریف :۔ مصنف کا خود نوشت نسخہ احمد آباد ۔۔۔
میں ہے (مخطوطہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی بمبئی)

اسباب النجاۃ والنجاح فی اذکار المساء والصباح :۔ اس کا نسخہ برلن میں بھی ہے
(ایوورڈ ۱۸/۳ زبید احمد ص ۳۰۶)

الدر الثمین فی بیان المہم من علم الدین :۔ اس کا ایک نسخہ بوہار میں اور
ایک نسخہ برلن میں ہے۔ (بوہار ۲/۴۹۹)

بغیۃ المستفید فی شرح تحفۃ المرید : اس کا نسخہ برلن میں بھی ہے، (ایوورڈ ۴۵۰
زبید احمد ص ۳۰۶)

غایۃ القریب فی شرح نہایۃ الطلب :۔ اس کا نسخہ برلن میں ہے (زبید ڈ ۲۲۲ زبید احمد ص ۳۴۴)

الاعتقادیہ :۔ اس کا ایک نسخہ بوہار میں اور ایک برلن میں ہے (فہرست بوہار ۲۰۴)

الزہر الباسم فی روض حاتم :۔ اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۲۱۰ھ انڈیا آفس میں ہے (مخطوطات عربی انڈیا آفس ص ۱۶۱)

النور السافر کے ذیل کے سلسلہ میں جولائی ۱۹۷۹ء کے شمارہ صفحہ ۵۰ پر لکھا گیا تھا کہ اس کا ایک ذیل شلی متوفی ۱۰۹۳ھ نے لکھا ہے، جو المشرع الروی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ذیل ہماری نظر سے نہیں گزرا، ڈاکٹر ڈیسائی نے توجہ دلائی تو اس کے نام کی تحقیق کی گئی، دراصل یہ ذیل شلی ہی کا ہے، مگر اس کا نام "السنا الباہر تکمیل النور السافر" ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مصر میں بتایا جاتا ہے۔ (الاعلام ۳/ ۸۶)

سال وفات | ڈاکٹر زبید احمد نے عیدروسی کا سال وفات ایک جگہ $\frac{۱۰۳۵}{۱۶۲۵}$ھ درج کیا ہے۔ (زبید احمد ص ۴۱۷)۔ اسی طرح صاحب المشرع الروی نے (۲/ ۱۳۷) سال وفات ۱۰۴۸ھ اور ناجی کے تتبع میں تاریخ الشعراء الحضرمیین کے مصنف نے ۱۰۴۸ھ لکھا ہے۔ (الاعلام جدید ۴/ ۱۶۴) جبکہ صحیح تاریخ وفات ۱۰۳۸ھ ہے، صاحب حدائق نے ان کی تاریخ وفات "شریعت پناہ" سے نکالی ہے۔ (حدائق الحنفیہ ص ۴۰۰)

عرب و ہند کے تعلقات

عرب و ہند کے تعلقات پر مولانا سید سلیمان ندوی کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں دیے تھے،

طبع جدید معارف پریس اعظم گڈھ۔ قیمت

مولانا عبدالسلام قدوائی کی یاد میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

لاہور - ۱۱ر نومبر ۷۹ء

معظمی و محترمی السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا، "معارف" پابندی سے مل رہا ہے، نوازش کا بے حد شکریہ،

اس اندوہناک خبر سے بے حد رنج ہوا کہ آپ کے دوست اور مخلص رفیق کار مولانا عبدالسلام قدوائی اللہ کو پیارے ہوگئے، (انا للہ وانا الیہ راجعون) خداوند تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، اور آپ سب لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، دست بدعا ہوں کہ آپ جیسے بزرگوں کا سایہ خداوند تعالیٰ تا دیر قائم رکھے، مولانا کی موت کا سانحہ واقعی دارالمصنفین کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ ہے، مگر موت سے کس کو رستگاری ہے، انسان سخت جان ہے، بڑے بڑے صدموں کو برداشت کر لیتا ہے، "ہرچہ آید بر سر اولاد آدم بگذرد"

ستمبر کے "معارف" میں شذرات کے تحت مرحوم کے متعلق آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا، وہ میں نے اشک بار آنکھوں سے پڑھا، اور دل کی عجیب کیفیت ہوئی، کارِ لائقہ سے یاد فرمائیں،

فقط والسلام نیازمند (ڈاکٹر محمد معزالدین، ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی، پاکستان)

(۲) مکرمی۔ السلام علیکم

مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کی رحلت سے میں ذاتی طور پر بہت غمزدہ ہوں، مجھ سے بے حد شفقت

فرماتے تھے، اُن کی یاد برابر آتی ہے، جب سوچتی ہوں آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں، انہی سوگوار کیفیت میں کچھ اشعار قلمبند ہوگئے ہیں، جو معارف کے لئے بھیج رہی ہوں، اگر مناسب سمجھیں تو معارف میں شائع کرکے ممنون فرمائیں،

بیگم احتشام ندوی، ضیاء

غمزدہ ہے آج بزمِ فکر و فن تیرے لئے
کیوں نہ روئے گی شمعِ انجمن تیرے لیے

نیک باطن نیک طینت سادہ دل تیرا کلام
نازشِ اہلِ وطن اے پاک دل عبدالسلام

تیرے غم میں آج ہے چشمِ تصور اشکبار
تیری فرقت سے ہوئی ہند و دمسلم بیقرار

یاد تیری سوگواروں کو سدا تڑپائے گی
تجھ سا فرزانہ کہاں ارضِ وطن پھر پائیگی

نالہ کش ہیں آہ اب تیری کمی کے عندلیب
ہو گئے احباب و اہلِ خانداں حرماں نصیب

آئینہ فطرت، فرشتہ خصلت و عالی مقام
جامعۂ ندوہ میں جو تھا قابلِ صد احترام

لب پہ استغفار تھا گویا سفر کا اختتام
کتنی آسانی سے کرلی منزلِ آخر تمام

ماہ تھا رمضان کا، وقتِ اذانِ جمعہ تھا
تیرے استقبال کا حق کیا کیا انتظام

خلد کو بھی تھا ترے قدموں کا شاید انتظار
اور تھی آغوش کھولے رحمتِ پروردگار

اُٹھ گیا محفل سے اب وہ عالمِ روشن دماغ
ہوگیا گویا کہ گُل اک بزمِ شبلی کا چراغ

باب التقریظ والانتقاد

ابو اسحاق ابراہیم اور ان کی کتاب التاجی [1]

از پروفیسر خواجہ مجیب الحق ایم اے باراسات گورنمنٹ کالج ، مغربی بنگال۔

چوتھی صدی ہجری یعنی دسویں صدی عیسوی عربی تاریخ نگاری کے لئے نہایت اہم صدی ہے، اور تاریخ کی بہت سی اہم کتابوں کے علاوہ اسی صدی میں الطبری کی تاریخ الرسل والملوک اور المسعودی کی مروج الذہب تکمیل کو پہونچی، اسی صدی میں ثابت بن سنان کی تاریخ ، ابن مسکویہ کی تجارب الامم کے علاوہ ابو اسحاق ابراہیم الصابی کی ایک سرکاری تاریخ کتاب التاجی بھی لکھی گئی تھی، اس مقالے کا تعلق اسی کتاب سے ہے،

کتاب کا نام | اس کتاب کا نام جیسا کہ اس کے ایک نادر مخطوطے کے صفحۂ اول پر درج ہے "کتاب المنتزع من الکتاب المعروف بالتاجی فی اخبار الدولۃ الدیلمیۃ" ہے یا مختصر "کتاب التاجی" ہے، کیونکہ یہ مشہور بویہی حکمراں عضد الدولہ کے حکم سے لکھی گئی تھی جس کا لقب "تاج الملۃ" تھا۔

اس کا نادر مخطوطہ | یہ مخطوطہ زیدی فقہ کی ایک کتاب "التاج الکافی" کے آخر میں پایا گیا ہے، جامع الکبیر صنعاء (یمن) کے المکتبۃ المتوکلیہ میں یہ مخطوطہ موجود ہے اور اس کا نمبر ۱۲۵ ہے، اس کی مائکروفلم دار الکتب المصریہ قاہرہ میں شمارہ نمبر ۲۰۵ کے تحت محفوظ ہے، یہ نادر مخطوطہ ۲۲ اوراق یعنی ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر ۲۳ سطریں خوبصورت خط نسخی میں لکھی گئی ہیں، پورے مخطوطہ میں خالص عربی حروف ط ، ح ، د کے نیچے ایک نقطہ دیا گیا ہے، کاتب کی تحریر کی خاص خصوصیات میں یہ

---

[1] میرا یہ مقالہ اس عربی مقدمہ سے ماخوذ ہے جسے پروفیسر محمد صابر خان صاحب نے کتاب التاجی کے ایڈیشن اور ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے، یہ کتاب بنیاد فرہنگ ایران، تہران کی طرف سے امسال شائع ہو چکی ہے۔

ایک یہ ہے کہ وہ بہت سے الفاظ اور اعلام کو موجودہ املا کے مطابق نہیں لکھتے، مثلاً وہ ہمیشہ یساکرا کو نیسلہ، حضرۃ کو حضرت، ابوالحسین کو ابلحسین، ہاشم کو ابوالقسم، ہارون کو نہرون، یعلی بن نعمان کو یعلی ابن النعمان، الرضا کو الرضی لکھتے ہیں، اس کے علاوہ اختتامیہ یائے معروف کی جگہ ہمیشہ الف لکھتے ہیں، مثلاً کتی کی جگہ کتا، سوی کے بدلے سوا، اور دعی کے بدلے دعا لکھتے ہیں، اس کا پہلا صفحہ موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے اس میں کتاب اور مصنف کے نام نہیں ملتے، اس کے آخر میں کاتب کا نام اور سنۂ کتابت بھی نہیں ہے، المنتزع کا متن ورق ۱۶ یا صفحہ نمبر ۳۱ کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد کسی دوسری کتاب کا متن منسلک ہے، ۲۱ جگہوں پر بیاض چھوڑ دی گئی ہے، اس کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مخطوطہ ایران یا یمن کے کسی مقام پر لکھا گیا ہے، چونکہ اس میں جابجا املا اور صرف و نحو کی غلطیاں موجود ہیں اس لئے اس کا کاتب کوئی عالم نہیں بلکہ پیشہ ور کاتب معلوم ہوتا ہے، مخطوطہ کی عام خصوصیات طرز تحریر اور اس کے صفحہ ۲۱ پر جو سال ۶۰۵/۱۲۰۹ درج ہے، ان سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ مخطوطہ ساتویں صدی ہجری یا تیرہویں صدی عیسوی میں لکھا گیا ہے، اس مخطوطہ کا کوئی جزو ضائع نہیں ہوا، اس لئے یہ اپنی جگہ پر مکمل ہے، کوشش کے باوجود یہ پتہ نہ چل سکا کہ کتاب التاجی کا خلاصہ جو اس مخطوطہ میں موجود ہے کس نے کیا تھا، یہ صاف ظاہر ہے کہ اس مخطوطے کا کاتب اور اس کا خلاصہ تیار کرنے والا ایک شخص نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ اس کتاب کا خلاصہ کرنے والا ضرور کوئی زیدی شیعہ تھا۔

صابی کے حالات زندگی | اس کاتب اور مورخ کا پورا نام ابواسحاق ابراہیم بن ہلال بن ابراہیم بن زہرون بن حبون الحرانی الصابی ہے، وہ ۳۱۳/۹۲۶ء میں پیدا ہوئے اور ان کی ابتدائی زندگی بغداد میں گذری، اگرچہ وہ مذہبًا صابی تھے لیکن اسلام کا بڑا احترام کرتے تھے، وہ رمضان میں روزے رکھتے تھے اور قرآن کے حافظ تھے۔

اگرچہ ان کے والد ایک کامیاب طبیب تھے، لیکن ابو اسحاق کو ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی وہ پہلے بویہی حکمراں امیر معز الدولہ (متوفی ۳۵۶ / ۹۶۹) کے وزیر المہلبی کے دربار سے وابستہ ہوئے پھر دیوان الانشاء میں امیر معز الدولہ کے کاتب کی حیثیت سے کام کیا، امیر موصوف کے انتقال کے بعد وہ ان کے بیٹے امیر بختیار کے کاتب کی حیثیت سے کام کرنے لگے، جب بختیار نے عضد الدولہ سے شکست کھائی اور انھیں قتل کر دیا گیا تو عضد الدولہ نے بعض اسباب سے ابو اسحاق کو قید کر دیا عضد الدولہ کے حکم پر جب انھوں نے کتاب التاجی لکھی تو وہ قید سے رہا کر دیے گئے، انھوں نے ۱۲ر شوال ۳۸۴ھ مطابق ۱۹ر نومبر ۹۹۴ء کو بعمر ۷۱ سال انتقال کیا۔

کتاب التاجی ان حالات کی تفصیل جن کے تحت ابو اسحاق نے تاجی لکھی، پروفیسر محمد صابر خان کے مذکورہ انگریزی ایڈیشن کے مقدمہ میں موجود ہے، بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ابو اسحاق نے اس کتاب کو ۳۷۰ / ۹۸۰ میں عضد الدولہ کے حکم سے قید خانہ میں لکھنا شروع کیا تھا، ثبوت ذیوا موجود ہیں کہ اس کی تکمیل ۳۷۱ / ۹۸۲ میں ہوئی، کہا جاتا ہے کہ عضد الدولہ بذات خود اس پر نظر ثانی کرتے تھے اور جب وہ مکمل ہوگئی تو اس کا ایک صاف نسخہ شاہی کتب خانے میں رکھ دیا، ابو حیان التوحیدی (۴۱۴ / ۱۰۲۳) النعیمی (۴۱۳ / ۱۰۲۲) ابن الندیم (۳۸۵ / ۹۹۵) البیہقی (۴۷۰ / ۱۰۰۷) البیرونی (۴۳۹ / ۱۰۴۸) ابن حصول (۴۵۵ / ۱۰۶۳) اور ابو شجاع الروذراوری (۴۸۸ / ۱۰۹۵) نے اس کتاب کا ذکر کتاب التاجی یا صرف التاجی یا کتاب تاجی یا کتاب التاج کے نام سے کیا ہے۔

اصول تحقیق اس کا عربی متن پروفیسر محمد صابر خان صاحب کی تصحیح کے ساتھ شائع ہوگیا ہے، اس میں دو طویل مقدمے ہیں، ایک عربی میں اور دوسرا انگریزی میں، بہت تفصیلی حواشی اور تعلیقات کے علاوہ اس میں اعلام و اماکن کی فہرستیں بھی دی گئی ہیں،

کسی نادر و نایاب مخطوطے کا متن پیش کرنا ایک مشکل کام ہے، پروفیسر صابر خان صاحب نے

اس کی پوری کوشش کی ہے کہ اصل متن کی عبارت اور الفاظ میں کوئی ترمیم و تنسیخ نہ کی جائے، جہاں تصحیح بالکل ضروری سمجھی گئی ہے وہاں یہ اصل متن میں کر دی گئی ہے جس کا مقصد نہ صرف نقص کی اصلاح ہے بلکہ صحیح نص کو معلوم کرنا بھی ہے جسے مصنف نے وضع کیا تھا اور مخطوطے کے غلط الفاظ اور ان کی شکلیں حواشی میں دے دی گئی ہیں، بیاض کے سیاق و سباق کے مطابق موزوں الفاظ سے خانہ پری کی گئی ہے اور ان کو قوسین ( ) سے ظاہر کیا گیا ہے، جہاں جہاں پر کوئی بیاض نہیں ہے لیکن کاتب سے ضروری الفاظ لکھنے سے چھوٹ گئے ہیں وہاں پر ایسے الفاظ اپنی طرف سے ضرورت کے تحت بڑھا دئے گئے ہیں تاکہ ان سے صحیح مفہوم واضح ہو جائے۔ ایسے الفاظ کو بھی حاجزین [ ] کے درمیان دکھایا گیا ہے۔ پانچ جگہوں پر جو الفاظ اس مخطوطے میں حاشیہ پر لکھے گئے ہیں، ان کو متن میں شامل کر لیا گیا ہے، اور ان کا ذکر حواشی میں موجود ہے۔ جو الم المنہ یا کوئی دوسرا لفظ پڑھا نہیں جا سکا ان کی جگہ پر اصل متن میں پانچ نقطے دے دیئے گئے ہیں، پورے متن کو چھوٹی چھوٹی مناسب عبارتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

أن، إن اور انَّ پر مستقل ہمزۂ قطع لگائے گئے ہیں، لیکن الیٰ پر نہیں لگایا گیا، جب تک کہ اس کے بعد کوئی ضمیر نہ آئی ہو، ہر جگہ تشدید لگائی گئی ہے سوائے ان حرفوں کے جو کسی اسم معرفہ کے قمری حروف سے تعلق رکھتے ہوں، تثنیہ پر صرف دو میں اعراب لگائے گئے ہیں جن کی شکلیں صیغہ جمع کی سی ہیں تاکہ دونوں میں امتیاز کیا جا سکے، تمام مجہول کو ظاہر کرنے کے لئے فعل مضارع کے پہلے حرف پر ضمہ لگایا گیا ہے، اور ماضی کے پہلے حرف پر ضمہ اور تیسرے حرف پر فتحہ لگایا گیا ہے، جہاں ضرورت محسوس کی گئی ہے وہاں کسی لفظ کے آخر میں اگر الف ہو تو اس پر تنوین لگا دی گئی ہے۔

کتاب کی اہمیت | اس کتاب کی تاریخی حیثیت و اہمیت کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ اس سے دیلم اور گیلان کی تاریخ کے ایک ایسے باب پر روشنی پڑتی ہے جس پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جس کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں، یعنی طبرستان میں زیدی اماموں کی حکومت کی تاریخ، اس کے علاوہ بنو بویہ کے آبا و اجداد

یعنی دیالمہ کے حالات عام طور پر کہیں نہیں ملتے لیکن اس کتاب میں دیالمہ کے حالات موجود ہیں جو بنو بویہ کی تاریخ کے لیے بیش بہا مواد فراہم کر سکتے ہیں، طبرستان کے زیدی حکمرانوں کی تاریخ، بخارا اور خراسان کے بنو سامان سے متعلق ہے اس لئے اس کتاب سے بنو سامان کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس میں زیدی خاندان کے مشہور و معروف حکمرانوں کی تاریخ کے علاوہ بہت سے ایسے بھی حکمرانوں کی تاریخ موجود ہے جو کم معروف تھے اور جن کے حالات تاریخ کی عام کتابوں میں نہیں ملتے، ہوسم جو ان زیدی حکمرانوں کا دارالسلطنت تھا، اس کی معلومات افزا تاریخ بھی اس کتاب میں موجود ہے جو اور کسی تاریخ میں نہیں ملتی، اس میں بعض مقامی حکمران خاندان مثلاً سجستان کے بنو صفار، طبرستان کے بنو بادوسفان، دیلم اور آذربائجان کے بنو مسافر یا بنو سلار یا بنو کنگر، آذربائجان کے بنو دہسودان کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس کتاب سے دیلم یا جبل کے بنو جستان اور طبرستان اور جرجان کے جیلی حکمران بنو زیار کے بھی کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، اس کی اہمیت کے متعلق تفصیلی بحث پروفیسر صابر خاں صاحب کے ایڈیشن کے انگریزی مقدمہ میں موجود ہے۔

اس انگریزی مقدمہ میں جو ۱۱۰ صفحے پر مشتمل ہے اور باتوں کے علاوہ اس کتاب کے ضروری ماخذ سے بھی بحث کی گئی ہے جو تاریخی کتابیں ہیں اور تاجی کی تصنیف سے پہلے لکھی گئی ہیں، یہ تقریباً یقینی ہے کہ تاجی کا ایک ماخذ الطبری کی تاریخ الرسل والملوک ہے لیکن ابو اسحاق نے اس کا اعتراف نہیں کیا ہے لیکن یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ تاریخ کی اور کون سی کتابوں سے ابو اسحاق نے تاجی لکھنے میں استفادہ کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل اور مکمل تاجی کا کوئی مخطوطہ اب تک ہمیں نہیں ملا ہے۔ اس میں ان لوگوں کا ذکر بھی ہے جنھوں نے عینی مشاہدہ کی بنا پر ابو اسحاق کے لئے ضروری تاریخی معلومات فراہم کئے، اس کے بعد مختلف علوم و فنون کی کتابیں جن کے مصنفین شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی زیر بحث لائی گئی ہیں جو ہمیں اس کتاب سے متعلق تین بنیادی سوالوں کے

جواب دینے میں مدد دیتی ہیں۔

اول یہ کہ جو تاریخی واقعات اس کتاب میں درج ہیں، وہ کہاں تک صحیح ہیں؟

دوم یہ کہ اس کتاب میں وہ کون سی نئی معلومات ہیں جن کی بنا پر اسے ایک اہم تاریخی کتاب قرار دیا جاسکتا ہے؟

سوم یہ کہ ہم یہ معلوم کرسکیں کہ آیا اس میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے یا نہیں؟ نیز اس میں کون کون سی غلطیاں ہیں؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کتاب التاجی ایک اہم اور معتبر تاریخی کتاب سمجھی جاتی رہی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے معتبر اور معزز مورخینِ اسلام نے اپنا ماخذ قرار دیکر اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے بہت سے عرب اور ایرانی مورخین مثلاً البیرونی، ابن حصول، ابن اسفندیار، ابن الاثیر، ابن خلکان، ابن خلدون، حمداللہ مستوفی قزوینی، ظہیرالدین مرعشی، میرخواند، خواندمیر اور دیگر مورخین جنھوں نے بنو بویہ کا شجرۂ نسب پیش کیا ہے، کتاب التاجی کو خاص طور پر اپنا ماخذ بتایا ہے، بعض عرب اور ایرانی مورخین نے تاجی سے استفادہ کیا ہے، لیکن اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ نہیں کیا، مثلاً ابوالفداء نے طبرستان کے علوی حکمرانوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور جو لندن کے ایک مخطوطہ میں محفوظ ہے، اس کا ماخذ تاجی ہے، لیکن ابوالفداء نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا، بنو بویہ کے بارے میں ابوالفداء نے اس مخطوطہ میں جو کچھ لکھا ہے اس میں دو جگہ ابواسحاق کا ذکر بطور اپنے ماخذ کے کیا ہے، لیکن عین ممکن ہے کہ علویانِ طبرستان کی تاریخ لکھنے میں بھی انھوں نے کتاب التاجی کو ہی براہ راست یا ابن ظفیر الازدی (متوفی ۶۱۳ھ / ۱۲۱۶ء) کی کتاب الدول المنقطعہ کے واسطے سے اپنا مستند ماخذ بنایا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ بنی بویہ کی تاریخ لکھنے میں النویری نے بھی

الازدی کے بالواسطہ تاجی سے استفادہ کیا ہو، لیکن النویری نے اس کا اعتراف نہیں کیا ہے،
ایسے بھی مورخین ہیں جو یا تو تاجی سے براہ راست واقف تھے یا اس سے کسی واسطہ سے استفادہ
کیا ہے، لیکن ان کا ذکر یقینی طور پر کرنا اس وقت ممکن نہیں کیونکہ تاجی کا پورا متن ابھی تک دستیاب
نہیں ہو سکا ہے، ان میں سے بعض مورخین ایسے ہیں جنھوں نے صرف تاجی ہی کو اپنا ماخذ بنایا ہوگا،
ابن اسفندیار نے اپنی کتاب 'تاریخ طبرستان' میں بنی بویہ کی تاریخ لکھتے ہوئے تاجی کا حوالہ
صرف ایک جگہ دیا ہے، حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ علوی حکمرانوں کی تاریخ لکھنے میں انھوں نے
تاجی سے کافی استفادہ کیا ہے۔

بعض مورخین جنھوں نے تاجی کو بنیاد بنا کر تاریخیں لکھی ہیں، وہ اس کی اصل عبارتوں کو
مکمل طور پر نقل نہیں کرتے، وہ عام طور پر اس کا خلاصہ یا نچوڑ اپنے الفاظ میں اس طرح پیش
کرتے ہیں کہ ہمیں اس مخطوطہ کی اہمیت پر بحث کرنے میں بہت زیادہ مدد نہیں ملتی۔

مندرجۂ ذیل مصنفین اور مورخین نے بھی یا تو تاجی سے استفادہ کیا ہے یا اس سے واقف تھے،
العظیمی نے حلب کی غیر مذہبی تاریخ لکھنے میں اس سے مدد لی ہے، ابن ماکولا (متوفی ۴۷۵ھ/۱۰۸۲ء)
اور الہمدانی نے بھی شاید تاجی کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے، یاقوت الحموی نے اپنی کتاب
'معجم البلدان' لکھنے میں اس سے مدد لی ہے اور السخاوی نے اپنی کتاب 'الاعلان بالتوبیخ' میں
خلفا کی تاریخ کے ذیل میں تاجی کا ذکر کیا ہے۔ العوفی نے اپنی کتاب 'جوامع الحکایات' میں ایک قصہ
کے سلسلہ میں تاجی کو ماخذ بنایا ہے، مشہور ایرانی مورخ رشید الدین فضل اللہ (متوفی ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء) نے
بھی عضد الدولہ اور اس کے چچا زاد بھائی بختیار کی باہمی جنگ کے سلسلہ میں کتاب التاجی کا ذکر کیا ہے،
اولیاء اللہ آملی نے اپنی کتاب 'تاریخ رویان' میں اس سے استفادہ کیا ہے، غرض یہ کہ کتاب التاجی ایک
نہایت اہم عربی تاریخ ہے،

مطبوعاتِ جدیدہ

شریف التواریخ ۔ مرتبہ مولانا سید شریف احمد شرافت نوشاہی تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۷۷۲، مجلد قیمت ۸۵ روپیے، پتہ (۱) معارف نوشاہیہ ساہن پال ضلع گجرات، پاکستان (۲) ادارہ معارف نوشاہیہ مکان ۱۰ مری اسٹریٹ ۱۲ شالا مار ٹاؤن، لاہور۔

تصوف کے مشہور سلسلہ قادریہ کی ایک شاخ نوشاہیہ ہے، یہ حضرت حاجی محمد نوشہ گنج بخش علوی قادری کی جانب منسوب ہے، مولانا سید شریف احمد شرافت اس وقت حضرت نوشہ کی درگاہ کے سجادہ نشین ہیں، انھوں نے نوشاہی سلسلۂ طریقت کی تاریخ تین ضخیم جلدوں میں لکھی ہے یہ اس کی پہلی جلد ہے اس میں سلسلۂ نوشاہی کے چھتیس بزرگوں کا تذکرہ ہے، یہ جلد دو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں ایک طویل مقدمہ ہے جو آٹھ فصلوں میں منقسم ہے، اس میں مصنف نے شریف التواریخ کے ماخذوں کی تعریف، ولایت کی حقیقت، اس کے درجات اور اولیاء کی قسموں کی ہیں، جیسے فرد الافراد، افراد، مفردون، فرد محبوب قطب الاقطاب، قطب، غوث، اوتاد، نقباء نجباء اور اوتاد وغیرہ، ایک فصل میں احوال کے اعتبار سے مرید، مراد، پیر، کامل، اکمل، مکمل، قلندر، خضر، مجذوب، اور سالک وغیرہ کی قسموں کا ذکر ہے، پانچویں فصل میں اولیاء کی کرامات کے امکان و وقوع کو ثابت کیا گیا ہے، چھٹی فصل میں بیعت کا مطلب، اس کی قسمیں اور اس کے دلائل بیان ہوئے ہیں، آخری فصل میں تصوف و طریقت کے مشہور سلاسل کا ذکر ہے، اس کے آخر میں سلسلۂ قادریہ کی فضیلت بھی واضح کی ہے، دوسرے باب میں چھتیس فصلیں ہیں، ہر فصل میں سلسلۂ قادریہ نوشاہیہ کے بزرگوں کا علحدہ علحدہ تذکرہ ہے، اس کی ابتدا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے ذکر جمیل سے کی گئی ہے، اور خاتمہ حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے حالات پر ہوا ہے، درمیان میں حضرت علیؓ حضرت حسن بصریؒ، شیخ حبیب عجمیؒ، شیخ داؤد طائیؒ، معروف کرخیؒ، سری سقطیؒ، جنید بغدادیؒ ابوبکر شبلیؒ، اور شیخ عبد القادر جیلانیؒ وغیرہ متعدد اکابر صوفیہ کا تذکرہ ہے، مصنف نے ہر بزرگ کے تذکرہ کے ضمن میں ان کے خلفاء، اولاد اور تلامذہ کے علاوہ ان سب اشخاص کے حالات بھی قلمبند کیے ہیں جن کا ذکر ضمناً آگیا ہے، اس طرح یہ کتاب متعدد صوفیہ کے حالات کا مجموعہ اور تصوف کے متعلق بہت سی مفید معلومات کا ذخیرہ ہے، اور اس سے مصنف کی محنت اور کد و کاوش کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر اس میں اطناب زیادہ ہے، اور رطب و یابس ہر قسم کی باتیں جمع کر دی گئی ہیں، یہ تصوف کے بجائے تاریخ تذکرہ کی کتاب لکھی گئی ہو تاریخ نویسی یا تذکرہ نگاری میں پایۂ اعتبار سے ساقط اور مرجوح اقوال سے احتراز ضروری ہے، مگر مصنف نے مورخانہ نقد و تحقیق سے کام نہیں لیا ہے، اولیاء کی کرامتوں کے وقوع و دوسرے انبیاءؑ پر رسول اللہ صلعم کی فضیلت اور حضرت علیؓ کی افضیلت وغیرہ کو ثابت کرنے کے لیے جن آیتوں اور حدیثوں سے استدلال کیا ہے، ان میں بحث و کلام کی بڑی گنجایش ہے، تفضیل علیؓ کو اہل سنت والجماعت کا مسلک بتانا سراسر غلط ہے، اس سلسلہ میں بعض اکابر کے جو اقوال نقل کئے ہیں، ان کی مطلقاً کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ خود ان ہی اکابر سے مشہور قول کے مطابق خلفائے ثلثہؓ کی تفضیل منقول ہے کتاب کی زبان اور اس کا انداز بیان قدیم طرز کا ہے، اس میں ناہمواری بھی ہے، کتاب کے تقریظ نگار محمد اقبال مجددی صاحب کو بھی اس کا احساس و اعتراف ہے، اور انھوں نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ یہ مصنف کی ناتجربہ کاری، عدم پختگی اور کم سنی کے زمانہ کی تصنیف ہے، مگر ان کی یہ توجیہ قابل قبول نہیں" اسے آب حیات یا شعر العجم کی طرح خواہ مخواہ دلچسپ بنانے کے شوق میں لسانی قلابازیاں اور خیالی گھوڑے نہیں دوڑائے" ان کتابوں کی زبان و بیان سے

نسخہ کتاب کا کیا مقابلہ اور نسبت ۔؟

اخلاق نبوی ؐ۔ مرتبہ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت

وطباعت بہتر صفحات۔ ۔ ۔ مجلد مع گرد پوش قیمت آٹھ روپیے ۔ پتہ ۔ الجمعیۃ بکڈپو جمعیۃ بلڈنگ

گلی قاسم جان، دہلی ؁۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل ہے، اسی لئے احادیث کا بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات وہدایات پر مشتمل ہے، محدثین نے اخلاقی احادیث و روایات کے علحدہ مجموعے مرتب کئے ہیں، اردو میں بھی اس کے کئی مجموعے پہلے چھپے ہیں، دارالمصنفین کی مشہور و مقبول کتاب سیرۃ النبی جلد ششم کا بھی یہی موضوع ہے، اس میں اخلاق پر مختلف حیثیتوں سے بحث کرنے کے علاوہ فضائل و رذائل اخلاق کے زیر عنوان صحیح حدیثیں بھی جمع کردی گئی ہیں، مولانا عبد السلام ندوی مرحوم کی تاریخ اخلاق اسلامی میں بھی اخلاقی احادیث کا بڑا حصہ آگیا ہے، زیر نظر کتاب میں پیغمبر اسلام کی اخلاقی تعلیمات و ہدایات مختلف عنوانات کے تحت اکٹھا کرکے ان کا سلیس اردو ترجمہ کیا گیا ہے، مصنف نے ہر عنوان کی مناسبت سے پہلے قرآنی آیات بھی نقل کردی ہیں، اور حدیثوں کی مختصر تشریح کرکے ان کا مفہوم و منشا پوری طرح ظاہر کردیا ہے، یہ کتاب سہل اور آسان زبان اور دلنشین پیرایہ میں لکھی گئی ہے، تاکہ معمولی اور کم استعداد کے لوگ بھی اس سے اچھی طرح فائدہ اٹھا سکیں، امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی۔

دیوان اثر ۔ مرتبہ ڈاکٹر نفس حق قریشی تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت

عمدہ صفحات ۳۰۰۔ قیمت ۔ اٹھارہ روپیے ۔ پتہ انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی ۔

خواجہ محمد میر اثر دہلوی ایک صوفی منش بزرگ اور استاد فن تھے، خواجہ میر درد کے

ہوٹے بھائی، علم و عمل تصوف و اسرار طریقت اور شعر و سخن میں ان کے جانشین تھے اور درد کی طرح ان کا کلام بھی سادگی، اصلیت اور سوز و گداز سے معمور، سہل ممتنع کا نمونہ اور رسہایا انتخاب ہے، مگر ابھی تک ان کے حالات، کمالات اور شاعری کی جانب بہت کم توجہ کی گئی تھی، ڈاکٹر کامل قریشی صدر شعبۂ اردو کروڑی مل کالج دلی یونیورسٹی دلی اور اس کے اہل کمال کے بڑے قدرداں ہیں، انھوں نے خواجہ محمد میر اثر کی زندگی اور شاعری پر یہ تحقیقی مقالہ لکھ کر دلی یونیورسٹی سے پی. ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے میں خواجہ صاحب کے خاندانی حالات، ان کی تعلیم و تربیت، بعض ابتدائی حالات و کمالات اور ولادت و وفات کے بارہ میں بڑی تحقیق و محنت سے مفید معلومات تحریر کی ہیں، اس سلسلہ میں ان کے اجداد اور وفات کے بارہ میں مختلف روایتوں کی چھان بین کر کے متعدد غلط بیانات کی تردید کی گئی ہے، اسی حصہ میں اثر کی شاعری پر مفصل گفتگو کی گئی ہے، اس میں ان کی دو مثنویوں میں خواب و خیال اور بیان واقع اور پھر ان کے دیوان کا دیدہ ریزی سے جائزہ لیا ہے، اس سے جہاں اثر کی شاعری کی اہم خصوصیات اور ان کے شاعرانہ درجہ و مرتبہ کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے، وہیں خود مرتب کے اچھے ادبی و تنقیدی ذوق کا بھی پتہ چلتا ہے، دوسرے حصہ میں خواجہ صاحب کے دیوان کا متن شائع کیا گیا ہے، اس کے آخر میں فارسی کلام اور مثنوی بیان واقع کا اس قدر حصہ شامل ہے جو میخانۂ درد میں شائع ہوا تھا، حواشی میں نسخوں کے فرق و اختلاف کی مفصل تصریح کی گئی ہے، یہ دیوان چار قلمی اور دو مطبوعہ نسخوں کو پیش نظر رکھ کر ایڈٹ کیا گیا ہے، اور متن کی ترتیب و تصحیح میں کئی بیاضوں اور متعدد تذکروں سے بھی مدد لی گئی ہے، مقدمہ میں مخطوطہ و مطبوعہ نسخوں کے بارہ میں ضروری معلومات درج ہیں، آخر میں اسماء و اعلام کا اشاریہ اور فرہنگ بھی ہے، ڈاکٹر کامل قریشی اس مفید ادبی خدمت کے لئے ارباب ذوق کی تحسین کے مستحق ہیں۔

مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما، از ڈاکٹر [illegible]

[illegible] قیمت [illegible]

دکن اردو کا پہلا اور بڑا مرکز تھا، گولکنڈہ اور بیجاپور کی [illegible] کے بعد [illegible] ارباب کمال نے ارکاٹ کا رخ کیا، اس طرح وہاں بھی اردو کا غلغلہ بلند ہوا، اس کتاب میں مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ مصنف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے، اس کے دو حصے ہیں، ابھی صرف پہلا حصہ شائع ہوا ہے، یہ تین ابواب کا مجموعہ ہے، پہلے باب کی حیثیت تمہید کی ہے، اس میں ہندوستان کی تمدنی تاریخ میں جنوبی ہند کی اہمیت دکھائی ہے، اس سلسلہ میں یہاں کی قدیم حکومتوں، اس کے شمالی ہند پر اثرات، اس کے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ملکوں اور عہد وسطیٰ میں عرب ملکوں اور ترکی اور ایران سے تعلقات کا ذکر بھی آگیا ہے، اور انگریزوں کی آمد، ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام اور کرناٹک میں اردو کے ابتدائی نمونے بھی دیئے ہیں، دوسرے باب میں ارکاٹ کے نوابوں کے عہد کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں اس کے سیاسی، تمدنی، معاشی اور مذہبی حالات کا ذکر بھی ہے، تیسرے باب میں فورٹ سینٹ جارج کالج کے قیام کی سرگذشت بیان کی گئی ہے اور اس کے کارکنوں اور مدرسین و مصنفین کے حالات اور تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا ہے، اس سلسلہ میں اعظم گڈھ کے قصبہ ماہل کے مولوی حسن علی ماہلی کا ذکر بھی ہے، ان پر کئی برس پہلے معارف میں ایک مفصل مضمون شائع ہوا تھا، غالباً وہ مصنف کی نظر سے نہیں گذرا، ایک جگہ لکھتے ہیں: "سیرت طیبہ کی ایک قدیم کتاب سیرت شامی اور حدیث کی ایک قدیم مستدرک سے معلوم ہوتا ہے": سیرت شامی کوئی کتاب نہیں ہے، غالباً مصنف کی مراد سیرت ابن ہشام سے ہے، اور "حدیث کی ایک قدیم مستدرک" کے بجائے "حدیث کی ایک قدیم کتاب مستدرک حاکم" لکھنا چاہئے تھا، [illegible] ابھی تک [illegible] پر کوئی اچھی کتاب موجود نہیں تھی، اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی [illegible]

(ض)